بیست وسہ سال کا اُردو ترجمہ

۲۳ سال

مؤلف: علی دشتی

مُترجم: خالد تھتھال

علی دشتی

فہرست

علی دشتی: ایک تعارف 6

پُل صراط 21

علی دشتی اور خالد تھتھال کے قیمتی تحفے.................. 25

مصلحت کوشی نے کیسی شخصیت تعمیر کی 28

چراغِ آخرِ شب 35

پیش گفتار.. 40

ولادتِ بطل 49

لڑکپن.. 67

رسالت 79

بعثت 92

بعثت کے بعد 100

ظہور اسلام کا ماحول 111

معجزہ 120

معجزہ قرآن 139

محمد بشر ہیں 163

ہجرت 191

محمد: ایک نیا روپ 200

مستحکم معیشت کا بندوبست 210

اقتدار کی جانب قدم 221

نبوت اور امارت 241

اسلام میں عورت 261

عورت اور پیغمبر 274

قرآن میں خدا 307

خلافت یا حرصِ اقتدار 353

مال غنیمت 377

خلاصہ 397

علی دشتی: ایک تعارف

علی دشتی ایک محقق، مصنف، دانشور، ناول نگار، مترجم، ادبی نقاد اور صحافی ہونے کے علاوہ ایرانی مجلس شوریٰ کے رکن، سینیٹ کے رکن اور مصر میں ایرانی سفیر کے طور پر بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

وہ مارچ 1897ء میں جنوبی ایران کے صوبہ بوشہر کے ضلع دشتستان کے قصبہ تلخو میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد شیخ عبد الحسین دشتی ایک مذہبی عالم کے طور پر بہت مقبول اور معزز سمجھے جاتے تھے۔ علی دشتی نے کربلا اور نجف کے شیعہ مدارس میں عربی، قرآن، تفسیر، علم حدیث، منطق، حکمت، فقیہت، اصول فقہ، اسلامی تاریخ اور تاریخ اقوام کا مطالعہ کیا۔ مشہور عالم دین حسین فشارکی اُن کے خاص استاد تھے۔

24 سال کی عمر میں دشتی ایران واپس لوٹ آئے۔ دشتی ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کے سب افراد مذہبی عالم تھے۔ اُن کے دوست بھی ایران و عراق میں مذہبی علماء کے طور پر جانے جاتے تھے۔ گو اپنی دینی تعلیم کی مناسبت سے دشتی بھی ایک بڑے مذہبی عالم کا درجہ حاصل کر سکتے تھے، لیکن اُنھوں نے اپنے خاندان اور جاننے والوں کی توقعات کے برعکس مذہبی عالم بننے یا کہلوانے کی بجائے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ اپنے پیشے کا فیصلہ شائد وہ دوران تعلیم ہی کر چکے تھے، کیوں کہ جب وہ عراق سے واپس آئے تو اُنھوں نے جُبے اور عمامے کی بجائے مغربی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

علی دشتی کا پہلا مضمون شیراز کے ایک اخبار میں چھپا۔ بعد میں اُنھوں نے "روزنامہ خلیج فارس" میں لکھنا شروع کیا۔ رکن زادہ نامی ایک با اثر آدمی کے خلاف مضمون لکھنے کی وجہ سے علی دشتی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ جس کی بھنک دشتی کو پڑ گئی اور وہ وہاں سے فرار ہو کر اصفہان چلے گئے۔

اصفہان منتقل ہونے کے بعد اُنھوں نے شیراز اور تہران کے مختلف اخبارات میں سیاسی نوعیت کے مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ بعد میں تہران منتقل ہوئے اور وہاں سے "ستارۂ ایران" نامی اخبار کا اجرا کیا۔ سادہ انداز اور کاٹ دار مضامین کی وجہ سے جہاں دشتی کے بہت زیادہ مداح اور حمایتی ملے وہیں اُن کے مخالفین بھی پیدا ہو گئے، جن کی وجہ سے اُنھیں جیل کا سامنا بھی ہوا۔

دشتی کو اس بات کا دُکھ تھا کہ ایرانی علماء نے جرمنی، روس اور برطانیہ سے رابطے قائم کیے ہوئے تھے، اور پیسوں اور طاقت کے حصول کی خاطر وہ کسی بھی قسم کے سمجھوتے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ چونکہ عوام کی اکثریت ان پڑھ تھی، لہٰذا ان علماء کا عوام پر بہت زیادہ اثر تھا۔ چنانچہ تیل کے ذخائر سے فائدہ اٹھانے کی خاطر بیرونی طاقتیں اُنھیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی تھیں۔

1919ء کے معاہدے نے دشتی کو سیاست کے میدان میں دھکیل دیا۔ یہ معاہدہ ایران اور برطانیہ کے درمیان ہوا تھا جس کا تعلق اینگلو پرشین آئل کمپنی سے تھا۔ ایرانی مجلس شوریٰ کی توثیق نہ ہونے کے باوجود اس معاہدے پر عمل ہو رہا تھا۔ جس سے ایران کو بہت زیادہ مالی نقصان کا سامنا تھا، جب کہ برطانوی کمپنی بہت زیادہ منافع کما رہی تھی۔ اس معاہدے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اگر کوئی برطانوی شہری ایران میں کسی مجرمانہ کاروائی کے سلسلے میں پکڑا جائے تو ایرانی حکومت اُس پر مقدمہ چلانے کی مجاز نہیں تھی۔

اُن وقتوں میں دشتی کا آیت اللہ محمد حسین بورزجانی کے ساتھ قریبی رابطہ تھا۔ بورزجانی بھی اس معاہدے کے بہت بڑے مخالف تھے۔ دشتی نے تہران جا کر آیت اللہ حسن مدرس کے ساتھ مل کر

ایک تحریک شروع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حسن مدرس ایک انتہائی با اثر عالم تھے کیونکہ اُن کے بے شمار پیروکار تھے۔ دشتی نے اُس وقت کے ایرانی وزیر اعظم وثوق الدولہ کو ایک احتجاجی مراسلہ بھیجا جو بہت زیادہ اخبارات میں بھی شائع ہوا۔

1919ء کے معاہدے پر تنقید کے نتیجے میں دشتی کو تین سال قید کی سزا ہوئی۔ لیکن دس دن کی قید کاٹنے کے بعد، بغیر پیشگی اطلاع دیے، اُنھیں عراق جلاوطن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اپنی جلاوطنی کی سزا کاٹنے کی خاطر دشتی ابھی سرحد کے پاس پہنچے ہی تھے کہ اُنھیں خبر ملی کہ فوج نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد فتح اللہ اکبر کو وزارت عظمیٰ کے منصب سے ہٹا دیا ہے، چنانچہ دشتی وہیں سے واپس لوٹ آئے۔

1921ء کی فوجی بغاوت رضا خان پہلوی نے برپا کی تھی، لہٰذا اُن کی سفارش پر ضیاالدین طباطبائی کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ ضیاالدین طباطبائی کے دور میں بھی علی دشتی قید ہوئے۔ یہ قید ضیاالدین طباطبائی کی 90 دن کی وزارت عظمیٰ کے خاتمے پر ہی ختم ہوئی۔ اس قید کے دوران دشتی نے اپنی کتاب "ایام محبس" مکمل کی جو اُن وقتوں کے ایران کی سیاسی صورت حال پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے نہ صرف کئی ایڈیشن شائع ہوئے بلکہ اس کی اشاعت نے دشتی کو ایک مقبول مصنف کے طور پر بھی متعارف کروایا۔

ضیاالدین طباطبائی کی وزارت عظمیٰ کے خاتمے کے بعد رضا شاہ نے خود وزارت عظمیٰ سنبھال لی۔ رضا خان شاہنشاہی کی بجائے ایران کو ایک جمہوریہ بنانا چاہتے تھے۔ دشتی سمیت دوسرے اہم دانشوروں کی بھی یہی خواہش تھی کہ ایران کو مصطفیٰ کمال اتاترک کے ترکیے کی مانند ایک جمہوریہ قرار دیا جائے اور رضا خان صدارت کا عہدہ سنبھالیں۔ لیکن مذہبی حلقوں کی سوچ مختلف تھی، وہ چاہتے تھے کہ ملک میں جمہوریت کی بجائے شاہنشاہی رائج کی جائے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ پارلیمنٹ کے اتنے زیادہ اراکین

کے مقابلے میں ایک انسان کو قابو کرنا زیادہ آسان ہو گا، یوں شاہنشاہی کی صورت میں وہ اپنی پوزیشن کو با آسانی مضبوط کر پائیں گے۔

رضا شاہ

جمہوریت پسند دانشور یہ جنگ ہار گئے، اور 1925ء میں رضا خان نے قاجاری سلسلہ کے ایک سو چھتیس سالہ اقتدار کا خاتمہ کرتے ہوئے آخری قاجاری حکمران احمد شاہ قاجار کو معزول کر دیا اور رضا شاہ پہلوی کے لقب کے ساتھ خود شاہنشاہ بن گئے۔

رضا شاہ ایک انتہائی روشن خیال حکمران ثابت ہوئے۔ اُن کے سولہ سالہ دور اقتدار میں ایران میں سڑکوں کا جال بچھانے کے علاوہ تہران ریلوے کا قیام عمل میں آیا۔ دانش گاہ تہران کے نام سے ایران میں پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ رضا شاہ نے اپنے بیٹوں کے علاوہ دیگر ایرانی طلبا کو بھی تعلیم کی خاطر بیرون ملک تعلیم بھیجا جن کے اخراجات حکومت نے برداشت کیے۔

مغرب میں ایران کے لیے پرشیا کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ رضا شاہ نے لیگ آف نیشنز میں ایک وفد بھیجا کہ آئندہ سے اس ملک کو پرشیا کی بجائے ایران یعنی آریاؤں کی سرزمین لکھا اور پکارا جائے۔

خواتین کو معاشرے کا حصہ بنانے کے لیے اُنھیں تعلیم اور ملازمتیں دینے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے۔ حجاب اور چادر کے استعمال کی حوصلہ شکنی ہوئی اور اس کی جگہ مغربی لباس پہننے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ باقاعدہ حکم جاری کیا گیا کہ اگر کسی تقریب میں میاں بیوی آئیں تو بیوی کے سر پر چادر نہیں ہو گی، اور اس حکم کی تعمیل کے سلسلے میں کسی کے امیر یا غریب، شہری یا دیہاتی ہونے کے فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جائے گا۔ درس گاہوں میں مخلوط تعلیم کا نظام رائج کیا گیا۔ اس کے علاوہ محرم کے ماتم کو

ایک دن تک محدود کر دیا گیا۔ مساجد میں عبادت کے لیے زمین پر بیٹھنے کی بجائے کرسی استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی۔

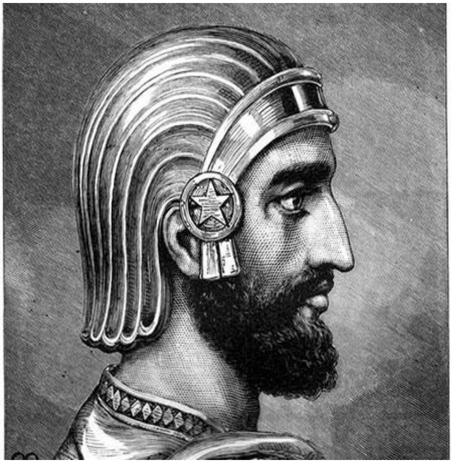

کوروش بزرگ

ملک میں مقیم یہودیوں کو برابر کا شہری قرار دیا گیا۔ہدایت کی گئی۔ملک میں مقیم یہودیوں کو برابر کا شہری قرار دیا گیا۔ یہودی آبادی کو نہ صرف مسلمانوں جیسے یکساں حقوق دیے گئے بلکہ رضاشاہ نے خود اُن کے کنیسہ میں جاکر عبادت کی۔ اِنھی اقدامات کی وجہ سے یہودی آج بھی رضا شاہ کو ایرانی شاہنشاہ کوروش بزرگ[1] کے بعد اپنا دوسرا بڑا محسن قرار دیتے ہیں۔

1: قدیم ایرانی بادشاہ کوروش دوم جسے کوروش بزرگ، کوروش کبیر اور سائرس اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ کوروش نے ہخامنشی شاہنشاہی کی بنیاد رکھی جو ایران، جنوبی اور وسطی ایشیا اور یورپ کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھی۔ بابلی بادشاہ نبوکد نضر نے یروشلم پر حملہ کر کے ہیکل سلیمانی کو جلایا اور یہودیوں کو غلام بنا کر ساتھ لے گیا تھا۔ کوروش نے بابل فتح کرنے کے بعد یہودیوں کو نہ صرف بابلیوں کی غلامی سے نجات دلائی بلکہ اُنھیں اپنا ہیکل تعمیر کرنے میں بھی مدد دی۔ تورات کے کئی ابواب میں خورس (کوروش) کا ذکر ملتا ہے، جیسے یسعیاہ کے باب 45 کی آیت 1 میں کوروش کا ذکر یوں ہوا ہے: ”خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اُس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ اُمّتوں کو اُس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دروازوں کو اُس کے سامنے کھول دوں اور پھاٹک بند نہ کیے جائیں گے“ اور پھر اسی باب کی آیت 13 میں یوں ذکر ہوا ہے: ”رب الافواج فرماتا ہے میں نے اُس کو صداقت میں برپا کیا ہے اور میں اُس کی تمام راہوں

قاجاری دور میں، زرتشتیوں، بہائیوں اور بابیوں کو ہراساں اور قتل کرنا قاجاری بادشاہوں اور مُلّاؤں کے روز کا معمول تھا۔ رضا شاہ کے دور میں بھی ایران کے چند شہروں میں بہائیوں کا قتل ہوا تھا۔ لیکن یہ اکا دکا واقعات رضا شاہ کی پالیسی کا حصہ نہیں تھے۔ رضا شاہ نے مُلّاؤں کی طاقت کو بھی محدود کرنے کی کوشش کی۔ ملک کے تمام باشندوں کو مذہب، نسل اور سیاسی وابستگیوں سے بالا ایک قوم قرار دیا۔ "اُمّت مسلمہ" کے بے بنیاد تصور کی بجائے سب کو ایرانی ہونے پر فخر کرنے کا احساس دلایا۔

کو ہموار کر دوں گا، وہ میرا شہر بنائے گا اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض لئے آزاد کر دے گا"۔ اور عزرا کے باب 1 میں یوں درج ہوا ہے: "اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے سال میں اس لیے کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کی زبانی آیا تھا پورا ہو خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا۔ سو اُس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اِس مضمون کا فرمان بھی لکھا کہ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ آسمان کے خدا نے زمین کی سب مملکتیں مجھے بخشی ہیں۔ اور مجھے تاکید کی ہے کہ میں یروشلم میں جو یہوداہ میں ہے اُس کے لیے ایک مسکن بناؤں۔ پس تمھارے درمیان جو کوئی اُس کی ساری قوم میں سے ہو اُس کا خدا اُس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو (مملکت) یہوداہ میں ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر جو یروشلم میں ہے بنائے۔ اور جو کوئی کسی جگہ جہاں اس نے قیام کیا باقی رہا ہو تو اسی جگہ کے لوگ چاندی اور سونے اور مال اور مواشی سے اُس کی مدد کریں اور علاوہ اُس کے وہ خدا کے گھر کے لئے جو یروشلم میں ہے رضا کے ہدیے دیں۔ تب یہوداہ اور بنیمین کے آبائی خاندانوں کے سردار اور کاہن اور لاوی اور وہ سب جن کے دل کو خدا نے ابھارا اُٹھے کہ جا کر خداوند کا گھر جو یروشلم میں ہے بنائیں۔ اور ان سبھوں نے جو اُن کے پڑوس میں تھے علاوہ ان سب چیزوں کے جو خوشی سے دی گئیں چاندی کے برتنوں اور سونے اور اسباب اور مواشی اور قیمتی اشیا سے اُن کی مدد کی۔ اور خورس بادشاہ نے بھی خداوند کے گھر کے اُن برتنوں کو بازیاب کروایا جن کو نبوکدنضر یروشلم سے لے آیا تھا اور اپنے دیوتاؤں کے مندر میں رکھا تھا۔ اُن ہی کو شاہ فارس خورس نے خزانچی متر دات کے ذریعے بازیاب کروایا اور اُن کو گن کر یہوداہ کے امیر شیس بضر کو دیا۔ اور اُن کی گنتی یہ ہے۔ سونے کی تیس تھالیاں اور چاندی کی ہزار تھالیاں اور انتیس چھریاں۔ اور سونے کے تیس پیالے اور چاندی کے دوسری قسم کے چار سو دس پیالے اور اور قسم کے برتن ایک ہزار۔ سونے اور چاندی کے کل ظروف پانچ ہزار چار سو تھے۔ شیس بضر ان سبھوں کو جب اسیری کے لوگ بابل سے یروشلم کو پہنچائے گئے لے آیا"۔ یروشلم میں ایک سڑک کوروش کے نام سے منسوب ہے۔ کچھ معاصر مسلمان علماء کے بقول قران کی سورت الکھف میں جس دو سینگوں والے یعنی ذوالقرنین کا ذکر ہوا ہے، وہ کوروش ہی تھا

مذہبی حلقوں کو رضا شاہ کے یہ اقدامات پسند نہ آئے اور نہ ہی وہ عورتوں کی "بے پردگی" برداشت کر پائے۔ چنانچہ رضا شاہ کے خلاف محاذ کھڑا ہو گیا جس کا اہم ترین نعرہ "شاہ ایک نیا یزید ہے" تھا۔

رضا شاہ ایران، ترکی اور مشرق وسطیٰ جیسے ہمسایہ ممالک کو ملا کر ایک کنفیڈریشن کے قیام کے بھی خواہاں تھے لیکن اتاترک کی موت کی وجہ سے اُن کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

رضا شاہ کے زمانے میں علی دشتی نے "شفق سرخ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ جو اپنے جرأت مندانہ مضامین کی وجہ سے اپنے وقتوں کے دانشوروں کے خیالات کا ترجمان سمجھا گیا۔ دشتی نے جہاں رضا شاہ کی ایرانی اتاترک کے طور پر مدح سرائی کی وہیں وہ رضا شاہ کے آمرانہ رویوں کو برداشت نہ کر سکے۔ 1935ء میں دشتی کو چودہ ماہ کی قید سنانے کے علاوہ شفق سرخ کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔

قید کے دوران علی دشتی بیمار ہو گئے اور اُنھیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا، جہاں سے دو ماہ بعد وہ گھر پہنچا دیئے گئے۔ کچھ عرصہ بعد اُنھیں "ادارہ راہنمای نامہ نگاری" کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد کتابوں اور اخبارات و رسائل پر سنسر کی پالیسی کا اطلاق کرنا تھا۔ 1941ء میں علی دشتی نے جمال امامی، ابراہیم خواجہ نوری اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر "حزب عدالت" نامی سیاسی جماعت بنائی جس میں وہ 1948ء تک متحرک رہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران رضا شاہ نے ایران کے غیر جانب دار ہونے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ کو رضا شاہ کا یہ فیصلہ پسند نہ آیا اور برطانیہ نے الزام لگایا کہ ایران میں مقیم جرمن مہندس اور تکنیکی ماہرین جاسوسی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایران پر سوویٹ یونین اور برطانیہ نے بمباری شروع کر دی۔ اگست 1941ء میں اتحادی قوتوں نے ایران پر قبضہ کر لیا، رضا شاہ گرفتار ہوئے اور اُنھیں اپنے بیٹے محمد رضا

پہلوی کے حق میں دستبردار کروانے کے بعد ملک بدر کر دیا گیا۔ رضا شاہ جنوبی افریقہ چلے گئے اور وہیں پر 16 ستمبر 1941 میں وفات پائی۔

رضا شاہ کے زوال کے ساتھ سب کچھ ہی بدل گیا۔ اُمّت مسلمہ کا تصور واپس لوٹ آیا جسے عام کرنے کے لیے بیرونی طاقتوں نے کام کیا۔ بائیں بازو کی سوچوں کے خلاف فدائین اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بہائیوں اور بائیں بازو کے نظریات سے تعلق رکھنے والوں پر سختیاں کی گئیں۔ شیعہ علمائے دین نے حجاب اور چادر کی واپسی کے علاوہ مخلوط تعلیم کو ختم کرنے کے مطالبے شروع کر دیے۔ پورے ملک میں اسلامی احکام کی تشہیر کے لیے تنظیمیں اور جماعتیں وجود میں آئیں۔ جنھوں نے اسلام اور اسلامی ناموں سے روزناموں اور ہفت روزوں کا اجرا کیا۔

رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے دوران اگرچہ علی دشتی بوشہر کے علاقے سے مجلس شوریٰ کے انتخابات میں لگاتار رکن منتخب ہوتے رہے تھے لیکن اس دوران وہ خود کو سیاستدان سے زیادہ ایک صحافی سمجھتے تھے۔ رضا شاہ کے بیٹے محمد رضا پہلوی کے دور میں علی دشتی کی سیاست میں دلچسپی بڑھ گئی اور مذہب اور صحافت میں ان کی دلچسپی کم ہو گئی۔ شائد یہی وہ وقت تھا جب اُن کے مذہبی اعتقادات میں کمی یا تبدیلی ہوئی۔ اس سے پہلے وہ اسلام کو ایران کے تمام مسائل کا حل سمجھتے تھے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ وہ اردگرد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

محمد رضا شاہ پہلوی کے زمانے میں علی دشتی نے فرانسیسی سیکھنے کی طرف توجہ دی، کیونکہ تب ایران میں فرانسیسی زبان کو زمانہ جدید کی ثقافت اور تہذیب کو سمجھنے کا دروازہ تصور کیا جاتا تھا۔ فرانسیسی سیکھنے کے علاوہ دشتی نے برطانیہ اور روس کی تاریخ و ثقافت کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے یہ ممالک تہذیب و ترقی کی بلندیوں پر پہنچ پائے۔

1947ء میں علی دشتی کو تودیہہ نامی سوویٹ یونین نواز کمیونسٹ پارٹی کو کابینہ میں شامل کیے جانے اور روس کو دی جانے والی رعایتوں پر تنقید کی وجہ سے گرفتار کرلیا گیا۔ چھ ماہ کی قید سے رہائی کے بعد وہ تہران سے فرانس چلے گئے اور دو سال بعد لوٹے۔ واپسی پر ایک سال کے لیے اُن کا مصر میں سفیر کے طور پر تقرر ہوا۔ 1954ء میں وہ سینٹ کے رکن بنا دیے گئے۔ پہلوی حکومت کے خاتمے تک انہوں نے ایک سینیٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

بیست وسہ سال

علی دشتی نے 1973ء میں "بیست وسہ سال" نامی کتاب لکھی جس میں اُنھوں نے قرآن کے حوالوں سے ثابت کیا کہ پیغمبر اسلام کو کوئی معجزہ ودیعت نہیں کیا گیا تھا، اور نہ ہی اُن سے کبھی کوئی معجزہ برپا ہوا تھا۔ دشتی کے بقول قرآن میں کچھ بھی ایسا نیا نہیں ہے جو اس سے پہلے نہ کہا گیا ہو۔ قرآن میں جو کہانیاں بیان کی گئی ہیں وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں پہلے سے ہی موجود تھیں جنھیں جوں کا توں یا تھوڑی تبدیلی کے ساتھ دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام نے اخلاقیات کے حوالے سے بھی جو کچھ بیان فرمایا ہے اُس میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے نیا کہا جائے۔ انسان کئی صدیوں پہلے ایسے اخلاقی نتائج پر پہنچ چکا تھا۔ کنفیوشس، بدھ، زرتشت، سقراط، موسیٰ اور عیسیٰ پہلے ہی ایسی تعلیمات دے چکے تھے۔ اسلام کے کئی مذہبی عقائد و رسوم مشرکین مکّہ کے ہاں یا تو پہلے سے ہی مستعمل تھیں، یا انہیں یہودیت سے مستعار لیا گیا ہے۔

محمد رضا پہلوی کے دور میں مذہب مخالف اور سیاست کے متعلق کتاب لکھنے اور شائع کرنے پر پابندی تھی۔ لہذا بیست وسہ سال کو شائع کروانے کے لیے دشتی نے لبنان کو چنا۔ لبنان کو منتخب کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ لبنان کے دارالحکومت بیروت میں دشتی کے بہت زیادہ عرب دوست موجود تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے خفیہ طور پر اپنی یہ کتاب وہاں ایک ناشر دوست کو بھجوادی۔ ناشر نے جب علی دشتی سے پوچھا

کہ اس پر مؤلف کے طور پر تمہارا نام دیا جائے؟۔ تو دشتی نے اسے منع کرتے ہوئے کہا: ”جو نام چاہو لکھ دو، میرے لیے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں تک سچائی پہنچے“۔ یوں 1974ء میں یہ کتاب ناشر اور مؤلف کے نام کے بغیر شائع ہوئی۔

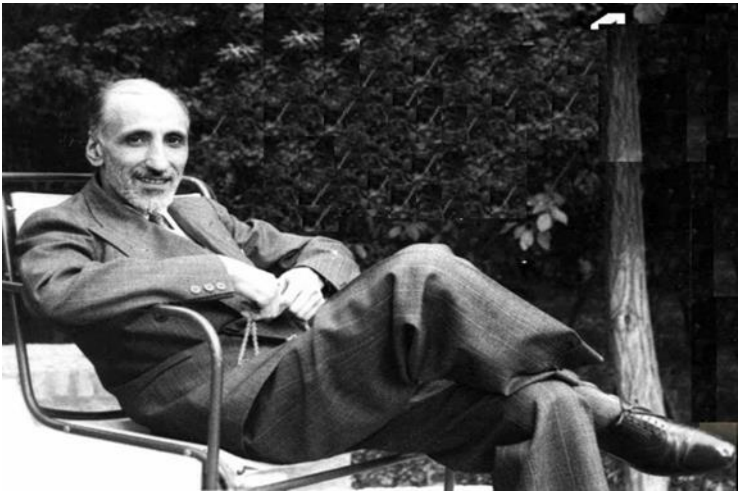

بیست و سہ سال کے بیروت میں چھپنے کے حوالے سے وہاں چند مذہبی لوگوں کو بھنک پڑی تو اُنھوں نے کوشش کی کہ کتاب بازار میں نہ آسکے۔ چنانچہ بیروت کی عدالت کے صدر موسیٰ صدر سے رابطہ کیا گیا، تا کہ کتاب کی اشاعت کو کسی طور سے روکا جائے۔ موسیٰ صدر اور علی دشتی کی لمبی بات چیت کے نتیجے میں کتاب کو جلایا تو نہ گیا البتہ اسے بازار تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ اور کتاب کی تمام کاپیاں لبنان میں علی دشتی کے ایک دوست علی نقی منزوی کو پہنچا دی گئیں۔ علی نقی کسی طور کچھ کتابوں کو ایران سمگل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

چونکہ چھاپہ خانے میں صرف عربی حروف تہجی تھے، اور عربی حروف تہجی میں "گ، پ، چ، ژ" وغیرہ جیسی فارسی آوازیں نہیں ہیں۔ لہٰذا بیست و سہ سال میں املا کی کافی غلطیاں تھیں، لیکن دشتی کو خوشی تھی کہ ان کی کتاب چھپ گئی تھی۔ اُنھوں نے یہ تمام سمگل شدہ کاپیاں اپنے نزدیکی دوستوں میں بانٹ دیں۔

خمینی کے دور حکومت میں یہ کتاب حکومت کے زیر زمین مخالف دانشوروں، طالبعلموں اور ایکٹوسٹوں میں بہت مقبول ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک سال کے اندر اس کی پانچ لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ کتاب کی اس مقبولیت سے حکومتی علما بہت فکر مند ہوئے۔ چنانچہ اُنھوں نے خمینی کو خط لکھنے شروع کر دیے کہ اس کتاب کے مؤلف کو ڈھونڈ کر اُسے سزائے موت دی جائے، نیز اس کتاب کو پاس رکھنے یا پڑھنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ علی دشتی کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ اُن کی کتاب کی فروخت سے کون کتنی کمائی کر رہا ہے، اور نہ ہی اُنھیں اپنی کتاب کے مؤلف ہونے کا کریڈٹ لینے کا کوئی شوق تھا۔ اسی وجہ سے کتاب پر اُن کا نام درج نہیں تھا۔ یوں بیست و سہ سال کے مؤلف کو ڈھونڈنا اتنا آسان نہیں تھا۔

بیست و سہ سال کے مؤلف یا ناشر کا پتہ لگانے کے لیے بہت زیادہ پکڑ دھکڑ ہوئی۔ بہت سے روشن خیال دانشور، مؤلفین اور تاریخ دان پابند سلاسل ہوئے۔ بیست و سہ سال کے مؤلف کا نام اُگلوانے کی خاطر ان لوگوں کو حد درجہ اذیتوں اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ خمینی کے پیروکاروں نے لبنان میں رابطے کر کے بھی پتہ لگانے کی کوشش کی کہ اسے کس ناشر نے چھاپا ہے۔ لیکن اُنھیں یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اُنھی دنوں علی نقی منزوی کے نام کا پتہ چلا، علی نقی مذہباً ایک یہودی تھا۔ اور گولڈ زیہر کی ایک کتاب کا "عقیدہ و شریعت در اسلام" کے عنوان کے تحت فارسی زبان میں ترجمہ کر چکا تھا۔ علی نقی پکڑا گیا اور اسے

قید خانے کے اندر بہت عرصہ تک تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے علی نقی نے آخر کار علی دشتی کا نام اُگل دیا۔ علی دشتی کا نام سامنے آجانے کے بعد خمینی کے پاسداران انقلاب نے اکیاسی سالہ علی دشتی کو گرفتار کرلیا اور قید کے دوران اُنھیں بہت زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ دشتی پر خمینی کی انقلابی عدالت میں مقدمہ بھی چلایا گیا جہاں اُنھیں اسلام کے خلاف کتاب لکھنے پر موت کی سزا سنائی گئی۔

علی دشتی جیل جانے سے پہلے جسمانی اور ذہنی طور تندرست تھے۔ لیکن جیل میں اُن پر اس قدر تشدد ہوا کہ اُن کی ایک ران بری طرح ٹوٹ گئی، اور اُنھیں ہسپتال داخل کرنا پڑا۔ دشتی کے ایک دوست کو بمشکل اجازت ملی کہ وہ ہسپتال میں اُن سے ملاقات کرسکے۔ زندگی سے پیار کرنے والے علی دشتی نے دوست سے درخواست کی، کہ وہ اُسے سائنائڈ لا دے، تاکہ وہ اپنی زندگی کو ختم کرسکیں کیونکہ یہ تشدد اُن سے مزید سہا نہیں جا رہا تھا۔ علی دشتی نے جیل میں کیے گئے تشدد کے متعلق اپنے دوست سے مزید کہا:

"اب میں سمجھ چکا ہوں کہ جنت اور جہنم میں کیا فرق ہے۔ جب میں شاہ کی قید میں تھا تو وہ جنت تھی، اور یہ موجودہ قید ایک جہنم ہے"۔

علی دشتی نے 16 جنوری 1982ء کو تہران کے جام ہسپتال میں وفات پائی، اور اُنھیں شہر رے کے امام زادہ عبداللہ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس قبرستان میں اہم مذہبی، علمی، ادبی مشاہیر کے علاوہ سیاسی شخصیات دفن ہیں۔ پاکستان کے پہلے صدر سکندر مرزا بھی اسی قبرستان میں دفن ہوئے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دشتی کی موت کی وجہ اُن کی ران کا زخم نہیں، بلکہ اُن کی روح کو لگے زخم اور قید خانے میں کیا گیا تشدد تھا جس کو وہ سہہ نہیں پائے تھے۔

بیست و سہ سال آج بھی ایران میں ایک ممنوعہ کتاب ہے۔ اگر یہ کتاب کسی کے گھر پائی جائے، کوئی اسے خریدتا یا بیچتا پایا جائے تو اُسے سزائے موت کا سامنا ہو سکتا ہے۔ علی دشتی کی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ اُن کی خواہش کے مطابق اُن کی وفات کے بعد 1994ء میں شائع ہوا۔

علی دشتی نے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھنے کے علاوہ ناول نگاری، اخلاقیات، سیاست، فارسی تراجم، مذہبیات، فلسفہ اور کلاسیکی ایرانی ادب کے خالقین جیسے سعدی، حافظ، خیام، مولانا جلال الدین بلخی وغیرہ پر چالیس کے لگ بھگ کتابیں لکھیں۔

کلاسیکی ایرانی ادب پر نقد کے حوالے سے اُنھوں نے سایہ، نقشے از حافظ، سیرے در دیوان شمس، خاقانی، شاعری دیر آشنا، دَمے با خیام، در مدح قمر تاج، کاخ ابداع، نگاہے بہ صائب، قلمرو سعدی اور تصویرے از ناصر خسرو لکھیں۔

سیاسی موضوع پر دشتی کی اہم کتابیں ایام محبس اور پنجاہ و پنج ہیں۔ ایام محبس اُن دنوں کی یادگار ہے جب دشتی قید تھے۔ پنجاہ و پنج پہلوی بادشاہی کے پچپن سالوں کا احاطہ کرتی ہے۔ پنجاہ و پنج پر جہاں دشتی کو تہران یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی وہیں دشتی پر کچھ حلقوں کی جانب سے تنقید بھی ہوئی کہ دشتی نے ذاتی فوائد کی خاطر ایک ظالم آمر کے دور حکومت کی مدح سرائی کی ہے۔ خمینی کے انقلاب کے بعد دشتی نے ”عوامل سقوط“ نامی کتاب لکھی، جس میں اُن عوامل کی نشاندہی کی جن کے نتیجے میں پہلوی بادشاہی کا خاتمہ ہوا۔

مذہبی نقد اور اخلاقیات کے حوالے سے دشتی نے بیست و سہ سال کے علاوہ تخت پولاد، جبر یا اختیار، ابلیس در کسوت عرفان، پردہ پندار، در دیار صوفیان اور عقلا بر خلاف عقل نامی کتابیں لکھی ہیں۔ پردہ پندار اور در دیارِ صوفیان صوفیت کو زیر بحث لاتی ہیں۔ جبر یا اختیار میں وہ آزاد ارادے اور تقدیر کے مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ عقلا بر خلاف عقل میں دشتی امام غزالی کے منطقی تضادات کو

سامنے لاتے ہیں۔ عقلا بر خلاف عقل اُن تین کتابوں میں سے ایک تھی جنھیں علی دشتی نے اپنا نام دیے بغیر شائع کروایا۔ تیسری کتاب جسے اُنھوں نے اپنا نام دیے بغیر شائع کروایا، وہ تخت پولاد ہے۔ 1971ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کو ایک مذہبی عالم اور اس کے شاگرد کے درمیان مکالمہ کے انداز میں لکھا گیا ہے، جس میں عالم ہر چیز کو قران وحدیث کی روشنی میں دیکھتے ہوئے مملکت کو قران وحدیث کے طے کردہ قوانین کے تحت چلانا چاہتا ہے۔ یہ کتاب امام خمینی کی کتاب "ولایت فقیہ" کا جواب تھی۔

افغانستان کے آخری بادشاہ ظاہر شاہ کے ہمراہ

علی دشتی نے اوپر دی گئی کتابوں کے علاوہ ایڈمنڈ ڈیمولن کی کتاب A quoi tient la supériorité des Anglo-Saxons? کا تفوّق انگلوساکسون مربوط بہ چیست؟، سیموئیل سائلز کی کتاب Self-Help کا اعتماد بنفس اور گستاولے بون کی کتاب Histoire des origines et du développement de l'homme et des sociétés کا ایجاد نوامیس روحیہ تطور ملل کے

عنوان سے ترجمہ کرنے کے علاوہ فتنہ، ہندو اور جادو نام کے ناول بھی لکھے ہیں۔ علی دشتی کو ایران کے دانشورانہ حلقوں میں ایک سورج کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اُن کا نام ان تمام دلوں میں زندہ ہے جنھوں نے ان کی کتابیں اور مضامین پڑھے ہیں۔

پُل صراط

مبارک حیدر

خالد تھتھال نے ایک نہایت مشکل مہم کو سر کیا ہے۔ ترجمہ بذات خود ایک صبر آزما کام ہے، جبکہ مذہب پر کسی تحقیقی کام کا ترجمہ تو ایسے ہے جیسے سان پر لگی چھریوں پر چلنا۔

کتاب کے مصنف علی دشتی کو ایران میں ایک بڑے مصنف، محقق اور دانشور کے ساتھ ساتھ ایک عالم کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کے باوجود یہ کتاب ہمیں اُن کے گہرے دینی مطالعہ کا پتہ دیتی ہے۔

اس کتاب میں علی دشتی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و قیادت کے تیئس سالوں پر ایک منفرد انداز سے لکھا ہے۔ ہم مسلم عوام پیغمبر اسلام کی نبوت کے سال تیئس گنتے ہیں۔ لیکن یہ سال قمری ہیں، اور قمری سال ہمارے موجودہ شمسی کیلنڈر کے مقابلہ میں گیارہ دن کم کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے رسول اللہ نے تریسٹھ سال نہیں بلکہ اکسٹھ سال اور ایک ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی اور آپ نے اسلام کی تکمیل کا بے مثال کام تیئس سال سے بھی کم مدت میں سرانجام دیا۔ دنیا بھر کے تاریخ دان اور دانشور اپنے اپنے عقائد کے باوجود اس عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

علی دشتی نے بھی اس عظمت کا بیان ایک غیر جانبدار عالم کی زبان میں کیا ہے۔ یہ ایک نعتیہ کلام نہیں بلکہ رسول اللہ کی زندگی اور اسلام کے ظہور و عروج کا ایک مطالعہ ہے جس میں نہ تو ایک عاشق کی فریفتگی ہے نہ ایک کافر کی نفرت۔ یہ ایک منفرد تجزیہ ہے۔ رسول اللہ کو ایک انسان مانتے ہوئے، اُن کے بے حساب کمالات کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ مصنف کی اس کوشش سے اتفاق بھی ممکن ہے اور اختلاف بھی۔

صدیوں سے یہ سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ اتنی مختصر مدت میں اتنا بڑا انقلاب جس نے دنیا کی تاریخ کو بدل ڈالا، کیسے رونما اور مکمل ہو گیا۔ ایک سادہ دل و دماغ والے صاحب ایمان کی نظر سے دیکھیں تو ہمیں دیکھنے سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی، اتنا جاننا کافی ہوتا ہے کہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہو گیا تھا اور اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسا کہہ دینے کے باوجود بہت سے سوال تشنہ رہ جاتے ہیں۔ سب اُس کے حکم اور علم سے ہوا تو رسول اللہ کی رحلت کے بعد انتشار اور تبدیلی کی وضاحت کیسے کریں؟۔ سب اُس کے حکم اور پیشگی علم سے ہوتا ہے تو جزا اور سزا کیوں؟ اور اگر ایک ایک حرکت اور سوچ اُس کے حکم سے واقع ہوتی ہے تو انسان کے اختیار میں کیا ہے؟۔ خود اُس نے فرمایا: وہ جسے ہدایت دے اُسے گمراہی نہیں اور جنہیں گمراہی میں ڈال دے، جن کے دلوں پر تالے لگا دے، گونگا بہرہ کر دے، اُن کے لئے ہدایت نہیں۔ تو پھر انسان کا اختیار کیا ہوا؟۔ اسی طرح کچھ علماء نے کہا قرآن اللہ کی تخلیق ہے، تو سوال اٹھا کہ کیا ہر تخلیق کی طرح اور پہلی کتابوں کی طرح اس کی بھی ایک عمر ہے؟۔ دوسروں نے کہا نہیں قرآن تخلیق نہیں، اللہ کی ذات کا حصہ ہے، اُس کا کلام ہے، اُسی کی طرح قدیم اور مستقل ہے۔ اس پر سوال اٹھا کہ اللہ نے اپنے رسولوں پر پہلے جو کتابیں نازل کیں، جو کہ اسلام کا جزو ایمان ہیں، وہ کیوں منسوخ ہو گئیں؟۔ کیا وہ قرآن کی طرح اللہ کا کلام تھیں یا پہلے انبیاء کی تخلیق تھیں؟ اگر اُن میں تحریف ہو گئی تو کیا یہ اللہ کی رضا سے ہوا، کیا رسول اللہ کے بعد صحابہ کی آپسی جنگیں، انتشار اور ملوکیت کا قیام اللہ کے فیصلے تھے؟ نہیں تھے تو کس کے فیصلے تھے؟۔ کیا مسلم اقوام کی موجودہ حالت یا بے راہ روی بھی اُس کی رضا اور حکم سے ہے؟۔ کیا قرآن کے الفاظ کے مطابق ہماری طرح اللہ کے بھی ہاتھ پاؤں اور آنکھیں ہیں اور وہ انسانوں کی طرح تخت پر بیٹھتا ہے؟۔ کچھ عالموں نے کہا قرآن کے یہ الفاظ استعارہ کے طور پر آئے ہیں۔ امام حنبل نے کہا جو یہ کہے کہ قرآن کے الفاظ استعارہ ہیں وہ کافر ہے۔ یہ سب سوال اور ایسے کئی سوال بڑے بڑے صاحب ایمان مسلم علماء کے لئے معمّہ بنے رہے اور آخر کار امام غزالی سمیت سب اماموں اور عالموں نے یہ کہہ کر ایمان کو بحال کیا کہ اللہ کی اللہ ہی

جانے، ہم اس کی دانش اور حکمت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس فیصلے سے ہمارا ایمان تو بچ گیا لیکن دماغ پر تالے لگ گئے۔ اور شاید یہ بھی رضائے الٰہی تھی۔

مانا کہ اتنی بڑی کائنات کے خالق و مالک کی منشا اور اس کی حقیقت کو سمجھنا ہمارے لئے ممکن نہیں لیکن قرآن نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اللہ نے انسان کو اپنے خلیفہ یعنی نائب کی حیثیت سے تخلیق کیا، یعنی اُسی نے ہمارے خمیر میں سوال کرنے اور جاننے کی صفات ڈالیں۔ شاید خلاؤں میں انسان کا سفر اور کائنات کو جاننے کی وہ تڑپ جو سائنس کو جنم دیتی ہے اور نوع انسانی کی بے بسی کو کم کرتی ہے، ہماری فطرت کا بنیادی جوہر ہیں۔ علی دشتی نے حیات طیّبہ اور تاریخ اسلام میں ایسے بیسیوں سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کوشش ناکام بھی ہو تو کم کوشی سے بہتر ہے کہ امکان کو جنم دیتی ہے۔

تحقیق ایک مشکل عمل ہے۔ اور جب تحقیق کا موضوع کوئی عقیدہ ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ تحقیق سوال اٹھاتی ہے جبکہ عقیدہ سوال اور اختلاف کو پسند نہیں کرتا۔ اسلامی معاشروں میں تو سوال اور اختلاف کی کوئی روایت سر ہی نہیں اٹھا سکی۔ حالانکہ اسلام سے پہلے کے مذاہب کو صدیوں سے اختلاف اور تنقید کا سامنا رہا ہے۔ عیسائیوں نے رومن سلطنت کی قوت سے یہودیوں کو نشانہ بنایا۔ ہمارے مسلم علماء نے صدیوں تک اپنے حکمرانوں کی سرپرستی میں ہنود و یہود و نصاریٰ پر دباؤ رکھا۔ تاہم اسلام کو یہ منفرد مقام حاصل رہا ہے کہ اسے کسی طاقتور اختلاف یا دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مسلم حکمرانوں کو جن جدید نو آبادیاتی طاقتوں نے اقتدار سے محروم کیا، اُن کا کوئی سرکاری مذہب نہ تھا۔ اُن کے سرمایہ داری نظریات اور اسلام کے اقتصادی نظریات میں کوئی بنیادی ٹکراؤ بھی نہیں تھا۔ اُن نئی قوتوں کا بڑا ٹارگٹ دولت کی تخلیق اور ذاتی ملکیت تھا جبکہ اسلام بھی لا محدود ذاتی ملکیت کو احترام دیتا ہے اور اسے اللہ کا فضل قرار دیتا ہے۔ لہٰذا مغربی اقوام نے مسلم اقوام کے عقائد پر کسی فکری تحریک کا آغاز نہیں کیا۔ جدید صنعتی دور میں تحقیق کے موضوع بھی بدل گئے تھے اور اصول بھی۔ چنانچہ اسلام پر تحقیق بہت کم مغربی دانشوروں نے کی اور اکثر نے احترام اور سلیقہ کی حدوں کو پار نہیں کیا۔ جن عیسائی

علماء نے اسلام کو تنقید یا حقارت کا نشانہ بنایا یا رسول اللہ کی ذات پر انگلی اٹھائی، اُنھیں خود مغربی حکمرانوں، سیاست دانوں اور دانشوروں کی مخالفت ملی۔ آج امریکہ اور یورپ کے سیاست دان، طاقتور حلقے اور میڈیا ہمارے عقائد کا دفاع اتنی لگن سے کرتے ہیں کہ خود مسلم دانشوروں کے لئے اپنی کوتاہیوں پر خود تنقیدی کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس عمل کو اسلاموفوبیا کا نام دے کر روک دیا جاتا ہے۔

اس دلچسپ عالمی خیر سگالی نے ہماری مجہول خود اعتمادی کو اور پختہ کیا ہے۔ صدیوں کے فکری جمود اور اقتدار کے فخر سے مسلم عوام میں بہت سی کوتاہیاں پیدا ہوئی ہیں، جن کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ سب سے بڑا نقصان اقبال کے لفظوں میں یہ ہوا ہے کہ: "کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا"۔ ہمیں بہت سے سچ سننے کی ضرورت ہے، چاہے یہ کتنے ہی کڑوے لگیں۔ علی دشتی نے شاید اسی ارادے سے بہت سی قیاس آرائیاں کی ہیں، اور بہت سے ایسے عقائد کی نشان دہی کی ہے جن کا بقول اُن کے قرآن و سنّت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ہمارے مسلم اکثریتی معاشروں میں مجہول خود پسندی اور اسلاف پرستی کا زہر اتنا حاوی ہے کہ ہمیں دوسروں کی تیز رفتاری نظر آتی ہے نہ اپنا جمود۔ چنانچہ جب کوئی ہمیں ہمارا سچ بتانے لگتا ہے تو ہم یا تو اُس کے عیب گنوانے لگتے ہیں یا کان بند کر لیتے ہیں۔ اس حالت کا علاج یہی ہے کہ مسلم اقوام میں اپنے کڑوے سچ بولنے اور سننے کی کوئی تحریک ابھرے۔

خالد صاحب نے کتاب کا ترجمہ کرتے وقت اصل نصاب کا پوری وفاداری کے ساتھ خیال رکھا ہے۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اس نصاب کی اچھائی برائی کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی مثال پُل صراط سے دی جا سکتی ہے، کہ جو استرے سے زیادہ تیز دھار اور گنجے کے بال سے زیادہ باریک بتایا جاتا ہے، جس پر مولوی صاحب کا بیان سن کر ایک نیک دل عام آدمی نے گھبرا کر کہا تھا: "مولوی صاحب سیدھے لفظوں میں کہہ دو کہ جنّت کی طرف جانے کا راستہ نہیں ہے"۔

علی دشتی اور خالد تھتھال کے قیمتی تحفے

ڈاکٹر خالد سہیل

پچھلے پندرہ سو برس سے حضرت محمد کی شخصیت انتہا پسندی کی دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف عقیدت اور محبت کرنے والے انتہا پسند ہیں اور دوسری طرف تعصب اور نفرت کرنے والے انتہا پسند۔ ایسی فضا میں ایرانی دانشور علی دشتی کی حضرت محمد کی ایک معروضی انداز سے سوانح عمری لکھنا ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔

علی دشتی ایک سنجیدہ سکالر ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف مسلم تاریخ دانوں کی بلکہ غیر مسلم دانشوروں کی لکھی ہوئی حضرت محمد کی سوانح عمریوں کا بھی مطالعہ کیا اور ایک عظیم انسان کی متوازن سوانح عمری لکھنے کی کوشش کی۔ علی دشتی نے حضرت محمد کی زندگی کے حالات، واقعات، مشکلات اور نظریات کی مذہبی تفسیر کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور سماجی تعبیر بھی پیش کی۔ اُنھوں نے ان محرکات کی بھی نشاندہی کی جن کی وجہ سے وہ عرب معاشرے میں ایک سماجی تبدیلی لانے میں کامیاب ہوئے۔ علی دشتی کا نقطۂِ نظر سیکولر بھی ہے اور سائنسی بھی۔ ایسے اندازِ فکر سے حضرت محمد کی سوانح عمری پڑھنے والوں کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔

علی دشتی نے حضرت محمد کے خیالات اور نظریات کو تاریخی اور عالمی پس منظر میں پیش کیا ہے تا کہ پڑھنے والے حضرت محمد کے نظریات کو کنفیوشس، بدھا، سقراط، زرتشت، موسیٰ اور عیسیٰ کے نظریات سے ملا کر دیکھ سکیں اور یہ جان سکیں کہ ان عظیم ہستیوں نے انسانی سوچ کے ارتقا میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

علی دشتی نے یہ عظیم کام تو کیا لیکن اُنھیں اس تخلیقی کام کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ایران کے اصحابِ بست وکشاد نے ان کی زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا۔ میری نگاہ میں ایسی کتاب کی اہمیت اور افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جس کے لیے اس کا مصنف اپنی زندگی کی قربانی دینے کو تیار ہو۔

خالد تھتھال نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے زندگی میں عالمی ادب کے بہت سے اردو کے ترجمے پڑھے ہیں۔ جو ترجمے خوبصورت ہیں وہ وفادار نہیں ہیں اور جو وفادار ہیں وہ خوبصورت نہیں ہیں۔ خالد تھتھال کے ترجمے میں دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ اس میں زبان کا حسن بھی ہے اور اصل متن سے وفاداری بھی۔ خالد تھتھال کی کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ علی دشتی نے جن فلسفیوں اور کتابوں کا اپنی کتاب میں ذکر کیا خالد تھتھال نے ان کتابوں اور فلسفیوں کے حوالے سے فٹ نوٹ لکھے ہیں۔ یہ ایک تحقیقی کام ہے جس سے خالد تھتھال کی کمٹمنٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔

میری نگاہ میں علی دشتی کی کتاب اور خالد تھتھال کا ترجمہ اردو قارئین کے لیے قیمتی تحفے ہیں جن کے لیے میں خالد تھتھال کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مجھے اس بات کی قوی امید ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر اس کے قارئین محبت اور عقیدت کی مبالغہ آرائی کی دھند سے نکل کر حضرت محمد کی شخصیت کی انسانی عظمت اور ان کی پوری انسانیت کی خدمت کے سچ کے زیادہ قریب آئیں گے۔

علی دشتی کے نظریات سے اتفاق اور اختلاف ہر قاری کا انسانی حق ہے۔ ایک سیکولر انسان دوست ہونے کے ناطے مجھے بھی ان کے چند نظریات سے اختلاف ہے لیکن ان اختلافات کے باوجود میں علی دشتی اور خالد تھتھال کی مخلصانہ کوششوں کو سراہنا چاہتا ہوں کیونکہ مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کی رائے کا احترام انسانیت کے ارتقا اور پرامن زندگی گزارنے کے لیے بہت اہم ہے اور ایسے رویے کی اکیسویں صدی

کے تمام انسانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو اشد ضرورت ہے تا کہ ہم کرہِ ارض پر پُر امن معاشرے قائم کر سکیں۔

مصلحت کوشی نے کیسی شخصیت تعمیر کی

اشعر نجمی

شخصیت پرستی (Personality cult) کا رجحان زمانہ قدیم سے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے قبیلے کا سردار خود کو خدا کا نائب یا اوتار گردانتا تھا۔ مصر کے فرعون اور بابل کے نمرود کو اُس کے عوام خدا مانتے تھے۔ یونان اور قدیم روم کے بادشاہوں کو ''دیوتاؤں کا آشیرواد'' (Divine right) حاصل تھا۔ شخصیت پرستی کی یہ شکل وصورت یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد بدل گئی۔ کمال اتاترک، ہٹلر، مسولینی، جنرل فرانکو، چرچل، چارلس ڈیگال، لینن اور اسٹالن نے بھلے ہی ''دیوتاؤں کا آشیرواد'' حاصل کرنے کا دعویٰ نہ کیا ہو لیکن یہ لوگ اپنے اپنے ملکوں کے ہیرو تھے۔ ایشیا میں سیاسی رہنماؤں کی ''پرستش'' عام بات ہے۔ چین کے ماؤزے تنگ، ہندوستان کے گاندھی جی، شہنشاہ ایران، صدام حسین، معمر قذافی، جوزف اسٹالن، کرنل جمال عبدالناصر اور عیدی امین وغیرہ جیسی کئی شخصیتیں تو خیر بین الاقوامی سطح کی حامل ہیں، ہمارے یہاں قومی، صوبائی، حتیٰ کہ علاقائی سطح پر بھی شخصیت پرستی کی وبا عام ہے۔ شخصیت پرستی خواہ سیاسی ہو یا روحانی، اس کی بڑی وجہ عوام کی سادہ لوحی (Gullibility) ہوتی ہے۔

اسلام میں اگرچہ حضرت محمد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور ان کی پرستش نہیں کی جاتی لیکن ان سے عام مسلمانوں کی وابستگی بالواسطہ اُنھیں اس مقام سے قریب تر کر ہی دیتی ہے جو ایماناً خدا کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ قدیم سیرت نگاروں کی مبالغہ آمیزی ہے، بعد کے سیرت نگاروں نے اُنھی کتبِ سیرت کو اپنا منبع وماخذ بنایا اور رفتہ رفتہ حضرت محمد کے تمام انسانی اوصاف پر اُن کی اُلوہی امیج غالب آتی گئی، رہی سہی کسر مدحِ رسول کی شکل میں شاعری نے پوری کر دی۔ نتیجتاً گزشتہ

کئی برسوں سے اب اس پر بحث جاری ہے کہ ”حضرت محمد نور تھے یا بشر ؟“ حالاں کہ قرآن کی کئی آیات اور کئی احادیث و روایات میں یہ وضاحت موجود ہے۔ خیر اس طویل مسلکی اور نظریاتی مبحث سے دامن بچاتے ہوئے ہم یہاں صرف ایک سوال کرنے کی جسارت کرتے ہیں ”اسوہ حسنہ “ سے کیا مراد ہے ؟۔ ظاہر ہے ایک عام مسلمان کا یہی جواب ہو گا کہ حضرت محمد کی عملی زندگی کا اتباع جسے رول ماڈل تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پھر ایک سوال اٹھتا ہے کہ ایک عام انسان کسی ”نور“ کی عملی زندگی کا اتباع کیسے کر سکتا ہے ؟ مثلاً جس طرح سیرت نگاروں نے حضرت محمد کی معجزاتی اور کرشمائی حیثیت کو کتب سیرت میں ہر ہر زاویے سے نمایاں کیا ہے، اسے پڑھ کر تو مجھ جیسا کمزور شخص اپنے کانوں پر ہاتھ لگا لے کہ اس کی پیروی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ظاہر ہے میں اشاروں سے چاند کو دو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر سکتا، اپنے تھوک سے زخم مندمل نہیں کر سکتا، میری شہادت کی انگلیوں سے دودھ کے سوتے نہیں پھوٹ سکتے، میرے دشمنوں سے میری حفاظت کے لیے فرشتوں کی فوج نہیں آسکتی، دھوپ میں بادل میرے سر پر سایہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی میرا سایہ غائب ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے میں اسوہ حسنہ کا تصور ہی بیکار محض لگنے لگتا ہے، میں بھلا کیوں کر ایک فوق البشر شے کے اخلاق، بصیرت، حکمت، تدبر اور پاکیزگی کی نقل کر سکتا ہوں؟ دراصل ہمارے سیرت نگاروں نے نبی کی معجزاتی اور کرشمائی شخصیت کو ایک فائر وال بنا کر پیش کیا ہے جس سے عام مسلمانوں اور ان کے نبی کے درمیان ایک غیریت سی حائل ہو گئی ہے، نتیجتاً وہاں ایک مرعوب کن عقیدت تو پیدا ہوتی ہے لیکن انسیت ناپید ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی جو خود پیغمبر اسلام نے ایک بار فرمایا: ”لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَم ، إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُولُوا : عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُه“ (میری حد سے زیادہ تعریف نہ کیا کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے ابن مریم کے بارے میں کہا۔ میں تو بس ایک بندہ ہوں، لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور رسول کہا کرو۔ صحیح بخاری، 3261)

اسی ضمن میں ایک اور واقعہ یاد آتا ہے کہ جب ایک صحابی نے حضرت محمد سے کہا: "أَنْتَ سَيِّدُنَا، فَقَالَ: السَّيِّدُ اللّٰهُ" (آپ ہمارے سردار ہیں تو آپ نے فرمایا کہ سید تو اللہ تعالیٰ ہے۔) اور جب صحابی نے کہا کہ "أَفْضَلُنَا فَضْلًا وَأَعْظَمُنَا طَوْلًا، فَقَالَ: قُولُوا بِقَوْلِكُمْ أَوْ بَعْضِ قَوْلِكُمْ، وَلَا يَسْتَجْرِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ" (ہم میں سے افضل اور سب سے بڑے ہیں تو آپ نے فرمایا، جو تم عام طور پر کہتے ہو ویسے ہی کہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس معاملہ میں شیطان تمھیں اپنا وکیل بنالے۔ سُنن ابو داؤد: 4806، احمد 4/25)

ایسے اور بھی کئی مقامات ہیں جب پیغمبر اسلام نے اپنے اور دین کے تعلق سے غلو کی ممانعت کی ہے لیکن ان کے انتباہ کو نظر انداز کر کے ان کی شخصیت میں غلو پیدا کر کے اتباع و اطاعت رسول کی ذمہ داری سے فرار حاصل کرنے کی حکمت عملی کو مسلمانوں نے "عشق رسول" کا نام دے دیا۔ اسی لیے جب کوئی صاحب نظر اور انصاف پسند سیرت نگار اس جرم بلکہ جرم عظیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر اسلام کو تمام انسانی اوصاف سے وابستہ کر کے اُن کی عملی زندگی کا تجزیہ کرتا ہے یا اُسے سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو مبالغہ آمیزوں کو اس میں گستاخی نظر آنے لگتی ہے چونکہ ان کے لاشعور میں صدیوں سے نبی کی امیج خدا سے مماثل ہے بلکہ بعض اذہان میں اس سے سوا بھی ہے۔ میرے دعوے کا ثبوت بیشتر مسلم ممالک کے وہ تعزیری قوانین ہیں جو توہین خدا کی بجائے توہین رسالت پر مبنی ہیں۔ اسی کا شکار علی دشتی بھی ہوئے جنھوں نے اپنی زیر نظر کتاب میں پیغمبر اسلام کی اُس روایتی اور مبالغہ آمیز امیج کو کھرچ کر ایک باکمال، باہمت، بااثر، بااختیار، بااخلاص، باشعور، باتدبیر، باطہارت، باعمل، باخدا، باقرینہ، بامروت، باوضع اور باوقار انسان سے متعارف کرایا ہے؛ ایک ایسا انسان جو حالات اور موقع و محل کے تناظر میں فیصلے بھی کرتا ہے اور اپنے ہی فیصلے رد کرنے سے بھی نہیں جھجکتا، جو مواقع کی نعمت کو قبول کرتے ہوئے کئی قدم آگے بھی بڑھاتا ہے لیکن کئی بار وہ مصلحت کے تقاضے اور حکمت عملی کے طور پر اپنے قدم واپس لینے پر بھی نہیں شرماتا۔ جس نے سماجی مسائل کے حوالے سے ہر قدیم روایت کو نہیں دھتکارا اور نہ ہر معاملے میں نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ جس نے ان قدیم روایت کو قبول کرنے میں عقل و فطرت کو

ہی کافی سمجھا اور آفاقی افکار و نظریات کی روشنی میں معاملات کو دیکھا اور اپنے دور کے حالات اور تقاضوں کے مطابق سماجی مسائل کے بارے میں ایک طرز عمل اختیار کیا اور اپنے ساتھیوں کی بھی تربیت اسی نہج پر کی کہ وہ کوئی کام کسی مذہبی سند کے بغیر بھی انجام دے سکیں۔

علی دشتی اپنی کتاب میں نبی کو خوبیوں اور کمزوریوں کا مرکب بتاتے ہیں جو ایک عام انسان کے اوصاف ہیں لیکن اس کے باوجود وہ پیغمبر اسلام کو لائق احترام گردانتے ہیں، بقول اُن کے حضرت محمد اپنے تمام ہم عمروں میں افضل تھے۔ علی دشتی کے مطابق اسلام کا قیام مکہ کے معاشرتی حالات کا ردعمل تھا۔ دشتی نے مکمل احترام کے ساتھ سیرت نبوی کا تجزیہ کیا ہے لیکن مبالغہ آمیزی اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے خود کو علیحدہ رکھا ہے۔

اس کتاب میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن سے عام مسلم قارئین بے چینی کا شکار ہو سکتے ہیں، مثلاً علی دشتی وحی الٰہی کے منکر ہیں، وہ اس انقلاب عظیم کا پورا کریڈٹ قرآن کی بجائے پیغمبر اسلام کو دیتے ہیں جس کی وضاحت جدید نفسیات اور عمرانیات سے کی جا سکتی ہے۔ دشتی قرآن کے معجزہ ہونے سے بھی انکاری ہیں، اُن کے مطابق قرآن کا معجزہ اس کے نتائج میں ہے، اس کی ادبی تشکیل میں نہیں۔ وہ پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کو بھی اسی سیاق میں اخذ کرتے ہیں کہ یہ پیشین گوئیاں حضرت محمد کی باخبری، سیاسی تدبر اور تجزیہ حالات پر مبنی قیاسات سے وابستہ تھے۔ بلاشبہ ہم قارئین علی دشتی کی باتوں سے اتفاق یا اختلاف کر سکتے ہیں اور یہ ضروری بھی نہیں کہ علی دشتی کی زیر نظر کتاب اپنے دلائل و مندرجات میں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہو۔ مصنف کے نقطہ نظر سے ہمیں بھلے ہی اختلاف ہو، لیکن یہ امر واقعہ ہے اور اسے اگر ہم زیر نظر کتاب کے مطالعہ کے دوران ذہن میں رکھیں تو اکثر جگہوں پر ہمیں ان سوالات کے جوابات خود بخود ملتے چلے جائیں گے جو مصنف کے نکالے ہوئے نتائج سے ذہنوں میں پیدا ہوں گے۔

اس موقع پر ایک عام قاری یہ سوال کر سکتا ہے کہ کسی ایسی کتاب کے ترجمہ کی ضرورت ہی کیا تھی جس کا مصنف عقیدتاً ہمارے عقیدے کا نہیں ہے۔ یہ سوال اپنی اہمیت کے باوجود علمی دنیا میں نظر انداز کر دیئے جانے کے قابل ہے، کیوں کہ کسی بھی سماج یا شخصیت کا مطالعہ صرف اس کے عقیدہ کی روشنی ہی میں نہیں کیا جا سکتا اور بطور خاص پیغمبر اسلام کی سیرت کے مطالعہ میں یہ قید تو بالکل نہیں لگائی جا سکتی چونکہ خود مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ کسی ایک خطے یا کسی ایک علاقے یا کسی ایک ملک کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، چنانچہ اُن کی شخصیت پر کسی ایک مذہب، کسی ایک مسلک، کسی ایک عقیدے، کسی ایک نظریے یا کسی ایک خطے کی اجارہ داری کیوں کر ہو سکتی ہے؟

علی دشتی نے اس کتاب میں کہیں بھی پیغمبر اسلام کی توہین نہیں کی، اُن کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ اُن کے مطابق عقائد کے معاملات میں عقلیت کا فقدان ہی شخصیت پرستی اور فریب دہی کا باعث بنتا ہے۔ دشتی کے مطابق اگر لوگ پیغمبر اسلام کو ایک کامل انسان تسلیم کر لیں تو وہ سمجھ جائیں گے کہ پیغمبر نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کیا، اسے عام نفسیاتی رد عمل اور انسانی جذبات سے مطابقت حاصل ہے۔ دشتی کے خیال میں معاصر معاشرتی ماحول کے تناظر میں پیغمبر اسلام کے اقدامات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں، صاحب کتاب نے خاص طور پر قرون وسطیٰ میں سیرت کے متعلق مغربی غلط فہمیوں اور افترا پردازی کی مذمت بھی کی ہے۔ شاید اسی دیانت داری کے سبب پہلوی حکومت اور اسلامی جمہوریہ دونوں کی جانب سے اس کتاب کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے کی کوششوں کے باوجود اسے عالمی شہرت ملی اور اسی شہرت کے سبب دشتی نے اپنی زندگی کے آخری عشرے میں قید و بند کی صعوبت اور تشدد کی اذیت برداشت کی۔

خالد تھتھال صاحب اس لیے لائق ستائش ہیں کہ اس کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے کے باوجود اردو قارئین کے لیے یہ میسر نہیں تھی۔ خالد صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ اس کے اصل فارسی متن سے کیا ہے۔ اب کچھ باتیں اس کتاب کے ترجمے پر بھی کر لینی چاہئیں ورنہ احسان ناشناسی ہو گی

محمد حسن عسکری کی مانیں تو اردو والے ترجمے میں بس یہی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست ہو اور پڑھتے ہوئے ایسا لگے جیسے کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہو۔ بلاشبہ اس سے ترجمے کا کام ہلکا ہو جاتا ہے لیکن ہماری زبان وہیں کی وہیں رہتی ہے جہاں تھی، حالاں کہ ترجمے پر ہماری ذرا سی محنت کے ذریعے اردو نثر کے اسالیب میں کچھ تجربے کیے جا سکتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے اکثر اردو مترجم جملوں کے آہنگ یا پیراگراف کی تعمیر کے سخت مرحلوں کو بھاری پتھر سمجھتے ہیں اور چوم کر اسے چھوڑ دیتے ہیں اور اس کی جگہ اپنے تخیلات سے اسے مزید اربنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خالد تھتھال نے ایسا نہیں کیا ہے جو ان کے ترجمے سے ظاہر ہے۔ اُنھوں نے اصل متن سے چپک کر ترجمہ کیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اُنھوں نے مکھی پر مکھی ماری ہے بلکہ وہ جذبات کا تجزیہ بھی فکر محض کی زبان میں کرتے ہیں۔ علی دشتی کے اصل فارسی متن کو پڑھیں تو آپ کو اُن کے جملے بڑے خشک اور بے رنگ معلوم ہوں گے لیکن ذرا غور سے پڑھیں تو اُن میں ایک کراراپن اور ایک ایسی چستی ملے گی جو طنز کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی زبان اور ایسے اسلوب کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے خالد تھتھال ایسی روایت کہاں سے لاتے؟ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مترجم نے اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اردو کا نیا اسلوب خلق کیا لیکن یہ ترجمے دیکھتے ہوئے مجھے اس میں دبی ہوئی چنگاری کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ فاضل مترجم میں اسلوب کا نیا تجربہ کرنے کی ہمت ضرور ہے۔ ترجمے کا مقصد بھی یہی ہے کہ خواہ ترجمہ ناکام ہی کیوں نہ ہو مگر پڑھنے والوں کے سامنے ذرائع اظہار کے نئے مسائل آئیں۔

اس اردو ترجمے کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مترجم نے مصنف کے متن سے باہر ہو کر ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ حاشیوں سے مزین یہ کتاب بتا رہی ہے کہ خود مترجم اس متن کے پس منظر سے خوب اچھی طرح واقف ہے اور جہاں کہیں اصل متن میں وضاحت کی ضرورت پیش آئی، اسے حاشیے میں مترجم نے بحوالہ پیش کر دیا۔ یہ اپنے آپ میں بڑی بات ہے کہ مترجم جس کتاب کا ترجمہ کر رہا ہے، اس موضوع پر اس کا علم مصنف سے کم نہیں ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس اردو ترجمے کی اہمیت اس لیے

بھی دو چند ہو جاتی ہے چونکہ اس میں مترجم کا برابر کا اشتراک ہے، اس رعایت سے زیر نظر کتاب علی دشتی اور خالد تھتھال دونوں کی ہو جاتی ہے۔

چراغِ آخرِ شب

حاشر ابن ارشاد

ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس میں ہم نے بڑے بڑوں کا سانس پھولتے دیکھا ہے۔ اس پر ترجمہ اگر ایسی کتاب کا ہو کہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑے تو سانس ہی نہیں پھولتا، اوسان بھی خطا ہو جاتے ہیں۔ بامحاورہ ترجمے کی کوشش کی جائے تو مفاہیم فوت ہو جاتے ہیں۔ لفظی ترجمہ کریں تو چاشنی رخصت ہو جاتی ہے۔ منظر کچھ ایسا بن جاتا ہے گویا مترجم ایک تنی ہوئی رسی پر چل رہا ہے، توازن بار بار بگڑتا ہے۔ ہر صفحے پر گرتا ہے، سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے، قلم پھر سے اٹھاتا ہے، پھر گرتا ہے، پھر اٹھتا ہے۔ اسی بیچ کبھی کبھی بات یوں ہاتھ سے نکل جاتی ہے کہ بنائے نہ بنے۔ بس اسی کشاکشی میں کتاب تمام ہوتی ہے۔ ہاتھ کچھ نہیں آتا، سوائے ایک بدمزگی کے احساس کے۔ صاحبانِ ذوق کے لیے یہ تراجم ایک سزا سے کم نہیں۔

ایسے تراجم کا فی زمانہ ایک تار بندھا ہے۔ یاروں نے سمجھا ہے کہ یہ کار آساں ہے۔ نہ عمیق مطالعہ ضروری ہے، نہ زبان کی بھول بھلیوں سے آگہی، رہی ندرتِ خیال اور نکتہ آفرینی تو وہ مصنف کی ذمہ داری ہو تو ہو، مترجم کے کندھوں پر کوئی ایسا بار نہیں۔ اسی سے گھبرا کر اردو تراجم سے عموماً کنارہ کشی میں عافیت جانی ہے پر کبھی کبھی کوئی ایسا درِ نایاب ہاتھ آتا ہے کہ آنکھوں پر، اپنی خوش بختی پر اور مترجم کی کاوش پر پہروں کیا، دنوں یقین نہیں آتا۔ خالد تھتھال کی کتاب تئیس سال بھی ایسا ہی ایک گوہر کم یاب ہے۔ یوں سمجھیے کہ اگر تراجم کے موسم ہوں تو یہ کتاب صرف بہار کے موسم میں ہی اتر سکتی تھی یا یوں کہیے کہ یہ ترجمہ اپنی جگہ ایک نویدِ بہار ہے۔

علی دشتی کی کتاب بیست و سہ سال کا یہ ترجمہ محض ترجمہ نہیں ہے، یہ بغاوت کا، جرأت کا اور روایت شکنی کا اعلان ہے۔ کون اس دور آشوب میں ایسی کوشش کرتا ہے۔ شکر کیجیے کہ بونوں کے اس ہجوم میں خالد تھتھال جیسے لوگ موجود ہیں نہیں تو زمانے اسی بے کیفی میں، اسی بے توفیقی میں بیت جاتے۔ علی دشتی کو گئے ایک زمانہ بیتا۔ کتاب ایران میں ہی نہیں، دنیائے اسلام میں بھی پابندی کا شکار ٹھہری۔ مصنف معتوب ہوا۔ ہمیشہ کی طرح صاحبان اختیار کو یہ زعم تھا کہ ہوا پر پہرے بٹھائے جاسکتے ہیں، خوشبو کو دفن کرنا ممکن ہے اور آئینے کرچی کرچی ہو جائیں تو ان میں عکس نظر نہیں آتا۔ لیکن اونچی انا اور نیچی عقل رکھنے والے ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بنانے والے دھجیوں کا بھی علم بنالیتے ہیں۔ پانی اپنا راستہ خود تلاش کرلیتاہے اور ایک دیا بھی منجمد رات کی تاریکی چیرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

علی دشتی کی کتاب ایران کے لیے نہیں تھی۔ نہ ہی یہ کتاب اہل اسلام کے لیے تھی۔ کتاب کا مذہب اور جغرافیہ نہیں ہوتا۔ کتاب تو علم کا دروازہ ہوتی ہے۔ خالد تھتھال نے اردو جاننے والوں کے لیے علم کا ایک دروازہ وا کیا ہے اور خدا جانتا ہے کہ ایسے دروازوں کی اس زندان میں کتنی ضرورت ہے جہاں صرف اندھیرا ہے اور روشنی کے کسی سراغ کی کوئی تمنا بھی نہیں ہے۔

یہ کتاب ان تئیس سالوں کی داستان ہے جس سے ہمارے عقیدے کے تمام چشمے پھوٹتے ہیں۔ صدیوں میں ان چشموں کے پانی اتنے گدلے ہوگئے ہیں کہ کسی کو پانی کی تہہ نظر نہیں آتی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ تہہ میں لعل وجواہر ہیں لیکن وہ بھی ہیں جو انہی کو سنگ ریزوں سے زیادہ وقعت دینے کو تیار نہیں۔ یا تو کوئی غوطہ لگائے پر اس میں بہت سوں کا سانس اکھڑ جائے گا یا پھر کوئی پانی کو صاف کرنے کا بیڑا اٹھائے پر عقیدت کی مٹی صاف کرنے والوں کے ہاتھ قلم کر دینے کا رواج ہے اس لیے علی دشتی جیسے کئی زمانوں بعد آتے ہیں۔ خالد نے اردو جاننے والوں کو علی دشتی سے متعارف کرواکے جو احسان کیا ہے اس کا اندازہ یہ ترجمہ پڑھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔

علی دشتی کی کتاب کا بنیادی مقدمہ بہت سادہ ہے۔ اس کے پاس بھی ابن ہشام یا طبری جیسے تاریخ کے وہی ماخذ ہیں جس سے ہماری تاریخ کی ساری روایتوں نے جنم لیا ہے۔ اس کے ہاتھ پر بھی وہی قرآن دھرا ہے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ اس کا ایک لفظ بھی نہیں بدلا۔ علی دشتی اپنی روایتیں ایجاد نہیں کرتا۔ متجددین کی طرح نئی تشریح نہیں کرتا۔ انگریزی محاورے کے مطابق گم گشتہ ترجمے کے بہانے کی دیوار نہیں بناتا۔ وہ بس مافوق الفطرت اساطیر کو ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ خوشہ چینی کرتے ہوئے میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو سے پرہیز کرتا ہے۔ جو، جب، جہاں جیسے موجود ہے وہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے۔ مقدس صحیفوں کو تقدس کی عینک سے دیکھنے کے بجائے منطق اور اصول کی خوردبین کے نیچے رکھ دیتا ہے کہ ایک ایک زاویہ جدا نظر آتا ہے۔ اس کا لہجہ نقد کا لہجہ نہیں ہے۔ اس کی آواز میں کوئی استہزاء نہیں ہے۔ وہ کسی منبر پر بیٹھ کر خطاب نہیں کرتا۔ بڑی ہم دلی اور ہم دردی کے ساتھ وہ پیغمبر اسلام کی کہانی ایک دوست کی طرح آپ کو سناتا چلا جاتا ہے۔ زیب داستان کے لیے وہ خرق عادات کے ٹانکے نہیں لگاتا اور نہ ہی یہ توقع آپ سے رکھتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کوئی نتیجہ نہیں نکالتا بلکہ یہ فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتا ہے۔

اس پورے متن میں کچھ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کے ٹھیکیدار کسی بھی بہانے سے گرفت کر سکیں لیکن اس کے باوجود اس کتاب پر پابندی، علی دشتی پر تشدد اور اس کے افکار پر گمنامی کا پردہ ڈالنے کی کوشش اس بات کا ثبوت ہے کہ طاقت کے مراکز سچ سے کتنے خوفزدہ رہتے ہیں۔

کتاب تو آپ پڑھ ہی لیں گے۔ میں بہت کچھ یہاں نقل کر سکتا ہوں لیکن اس مضمون کا مقصد یہ نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر بات اپنے تسلسل اور سیاق و سباق میں ہی خوب صورت لگتی ہے۔ اس لیے میں صرف تین چار ایسے مختصر اقتباسات پر اکتفا کر رہا ہوں جو علی دشتی کی طرز فکر کو واضح کرتے ہیں۔

"عقائد خواہ سیاسی ہوں خواہ دینی و مذہبی ہوں، وہ انسانی عقل کے استعمال اور صورت حال کو واضح انداز میں دیکھنے کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ موضوع بحث کے چہرے پر اچھائی یا برائی کا پردہ مستقل

طور پر کھینچ دیا جاتا ہے۔ محبت و نفرت، تعصب و ضد اور تلقینی عقائد زیر بحث انسان کو دھوئیں، دھند اور تصورات کے پیچھے غائب کر دیتے ہیں"۔

"ہم جانتے ہیں کہ بچپن میں کسی شخص کو جب عقائد کی تلقین کی جائے تو وہ اُس کے ذہن کے پس منظر میں جم جاتے ہیں، یوں وہ اپنے تلقینی اعتقادات کو حقائق پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے خواہ اُس کے پاس اس کی کوئی بھی عقلی دلیل موجود نہ ہو۔ حتیٰ کہ دانشور، سوائے چند ایک کے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، بھی اس صورت حال سے دوچار ہیں اور اپنی قوت ادراک و فہم کو استعمال نہیں کرپاتے۔ اور اگر وہ اپنی اس قوت کا استعمال کرتے بھی ہیں تو اسے اپنے تلقینی عقائد کے دفاع کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انسان، جس کی وجہ امتیاز اس کی قوت ادراک ہے جس سے وہ طبعی اور ریاضی کے مسائل تک حل کرتا ہے، اپنے عقائد، خواہ سیاسی ہوں، خواہ دینی ہوں، کی صورت میں وہ عقل حتیٰ کہ مشاہدات کو بھی رد کر دیتا ہے"۔

"نبوت کو برحق ثابت کرنے کے لیے مذہبی متکلمین نے خواہ اُن کا تعلق اسلام یا دوسرے ادیان سے ہے، سخت کوشش کی ہے کہ وہ ایک ایسی بات کو سچ ثابت کر پائیں جو مشکوک اور عقلی پیمانوں سے ناقابل اثبات ہے۔ کیونکہ انبیا اپنے آپ کو جس پروردگار کا بھیجا ہوا گردانتے ہیں، اُس کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے یہ مؤقف اختیار کرنا لازمی ہے کہ جہان کو حادث اور عدم سے وجود میں آیا ہوا سمجھا جائے۔ اگر کائنات پہلے سے موجود نہیں تھی اور بعد میں وجود میں آئی تو فطری بات ہے کہ کسی خالق نے اُسے تخلیق کیا ہوگا۔ لیکن یہ دعویٰ خود اپنے طور پر ناقابل اثبات ہے۔ ہم اتنی قطعیت سے کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا کہ کائنات نہیں تھی اور نہ ہی کسی قسم کے وجود کا کوئی نشان تھا؟"۔

"اگر خدا نے اپنے بندوں میں سے کسی کو یہ صلاحیت واقعی عطا فرمائی تھی کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دے۔ دریا کے پانی کو بہنے سے روک دے، آگ سے جلانے کی صلاحیت کو سلب کر لے تاکہ لوگ اُن پیغمبروں پر ایمان لے آئیں اور اُن کے مفید احکامات پر عمل کریں، تو کیا یہ زیادہ آسان اور عقل کے قریب تر حل

نہیں تھا کہ لوگوں کے دماغوں کو پیغمبروں کے تصرف میں دے دیتا یا لوگوں کو نیک پیدا کرتا۔ چنانچہ نبوّت کے مسئلے کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھنا زیادہ مفید ہو گا اور وہ یہ ہے کہ اسے ایک قسم کا غیر معمولی روحانی و دماغی عطیہ اور خصوصیت تصور کیا جائے"۔

"قرآن ایک معجزہ ہے۔ لیکن یہ اُن دوسرے معجزات کی مانند نہیں جو گذشتہ صدیوں کی دھند اور غبار میں لپٹی ہوئی کہانیوں میں گھرے ہوئے ہیں، اور صرف سادہ لوح اور کم عقل لوگوں کے عقیدے کا حصہ ہیں۔ نہیں، قرآن معجزہ ہے، ایک جیتا جاگتا اور بولتا ہوا معجزہ۔ قرآن معجزہ ہے، اپنی فصاحت و بلاغت کے حوالے سے نہیں اور نہ ہی اس میں درج اخلاقی مضامین یا شرعی قوانین کی وجہ سے۔ قرآن اس حوالے سے معجزہ ہے کہ تنہا اور خالی ہاتھ، لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت سے محروم محمد اس کے وسیلے سے اپنے لوگوں پر غالب آئے، اور ایک ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔ قرآن معجزہ ہے کیونکہ اس نے سرکش لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا اور اس کی آیات کے وسیلے سے محمد نے اپنے ارادوں کو اُن پر جاری کیا۔ محمد نے قرآن کو اپنی رسالت کے سچے ہونے کی سند کے طور پر پیش کیا۔ کیونکہ خدا کی جانب سے اُن پر وحی نازل ہوتی ہے جو وہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں"۔

علی دشتی کی کتاب محض پیغمبر اسلام کی زندگی کے تیئیس سالوں کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ یہ اسلام کے فلسفے، اسلامی فکر کی ترویج اور ایمان و اعتقاد کے ڈھانچے کا پوسٹ مارٹم کرتی ہے۔ سچ اور عقیدے کے بیچ ایک باریک سی لکیر ہے۔ یہ کتاب اس لکیر کو واضح کرتی ہے۔ اس کے بعد یہ پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کس جانب قدم رکھنا چاہتا ہے۔

خالد تھتھال نے جس طرح ترجمے سے انصاف کیا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ امید یہی ہے کہ وہ اپنے وسیع مطالعے، زبان فہمی اور جملہ سازی سے تشنگان علم کی پیاس بجھانے میں بخل سے کام نہیں لیں گے اور اسی طرح چراغ روشن کرتے چلیں گے۔ کیا عجب ہے کہ کل صبح کا نشان ایسی ہی کسی تحریر سے طلوع ہو۔

پیش گفتار

"بیست و سہ سال" کے عنوان سے بظاہر یہ تاثر ابھرتا ہے، کہ یہ کتاب پیغمبر اسلام کے مبعوث ہونے سے اُن کے وصال تک کے درمیانی عرصہ کے صرف تیئس سالوں کے حالات و واقعات سے بحث کرتی ہو گی۔ لیکن کتاب کا مضمون اُس کے عنوان کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع العلم ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ظہورِ اسلام سے پہلے کے سماجی، سیاسی و مذہبی ماحول سے لے کر پیغمبر اسلام کے وصال اور اس کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں قریش اور انصار کے درمیان حصول اقتدار کی خاطر پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات اور اسی مقصد کے تحت بعد میں ہونے والی سازشوں کو بیان کرنے کے علاوہ مذہب اسلام کی تعلیمات اور ہر دعوے سے مدلل اور مستند حوالوں کے ساتھ بحث کرتی ہے۔

نسلِ انسانی کی بہت سی تاریخ ساز ہستیوں کے حالات زندگی اور کارناموں کے متعلق ہم تاریخی کتب کی مدد سے کسی نہ کسی حد تک آگہی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسا انسان ہمارے سامنے نہیں آتا جس کی زندگی کے حالات و واقعات کی تفصیلات و جزئیات سے ہم ویسے باخبر ہوں جیسی تفصیل اور وضاحت سے ہم حضور کی حیات مبارکہ سے آگاہ ہیں۔ پیغمبر اسلام کے واقعات زندگی، تعلیمات اور کردار وغیرہ کو تاریخی اور مذہبی کتب میں اس گہرائی اور وسعت سے بیان کیا گیا ہے۔ کہ ہمیں حضور کے گدھوں، گھوڑوں، اونٹنیوں اور تلواروں کے ناموں اور اُن کے رنگ و نسل تک کی خبر ہے۔ دینی کتب ہمیں یہ تک بتاتی ہیں کہ آپ کو یعفور نامی گدھا غزوہ خیبر میں ملا تھا جس نے انسانی آواز میں آپ سے باتیں کیں اور خود کو آپ کے سپرد کیا تھا۔ جب آپ کسی صحابی کو بلانا چاہتے تھے تو یعفور کے اس فریضے کو انجام دینے کی تفصیلات بھی دینی کتب میں ملتی ہیں۔ سیرت اور سوانح کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے آپ کے پاس دُلدُل نام کی ایک سفید رنگ کی نایاب خچر تھی جو آپ

کو والی مصر مقوقس نے تحفے کے طور پر بھیجی تھی، اور ان تحائف میں آپ کی کنیز ماریہ قبطیہ اور اُن کی حقیقی بہن سیرین بنت شمعون بھی شامل تھی۔ آپ نے ماریہ کو اپنے لیے منتخب کیا اور سیرین کو شاعر اسلام حسان بن ثابت کے حوالے کیا تھا۔

تاریخ و احادیث سے ہمیں یہ خبر بھی ملتی ہے کہ جب حضور جنگوں پر جاتے تھے تو وہ میدان جنگ میں سب سے پیچھے ساتھیوں کے جھرمٹ کے اندر موجود ہوتے تھے اور آپ نے اوپر تلے دو زرہیں پہنی ہوتی تھیں، جن کے بوجھ کی وجہ سے آپ کو چلنے میں دقت ہوا کرتی تھی چنانچہ آپ کے ساتھی آپ کی مدد کیا کرتے تھے۔ آپ فتحِ مکّہ سے پہلے سفید رنگ کی پگڑی پہنتے تھے اور فتحِ مکّہ کے روز آپ نے سیاہ رنگ کی پگڑی پہنی ہوئی تھی وغیرہ۔

تاریخ اسلام اور سیرت کی کتابیں کھانوں کے سلسلے میں بھی حضور کی پسند و ناپسند، آپ کی خانگی زندگی، بچپن، جوانی، شادی، تجارت کے متعلق بھی ہمیں کماحقہٗ معلومات فراہم کرتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ آپ کیا پہنتے تھے، کیا کھاتے تھے، آپ کو کون سی سبزی یا جانور کے جسم کے کس حصے کا گوشت پسند تھا۔ آپ کی ازدواجی زندگی کیسی تھی، مختلف بیویوں سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، ازواج مطہرات میں دھڑے بندی کی وجہ اور نوعیت کیا تھی، اور اُن کے درمیان جھگڑے کیوں ہوا کرتے تھے۔

غرضیکہ رسول اللہ کے متعلق جس تفصیل اور فراوانی سے لکھا گیا ہے اُس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو نے اپنی ایک رپورٹ میں یوں لکھا ہے: ”جس قدر کتابیں پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھی گئی ہیں اس کا عشر عشیر بھی کسی ایک شخصیت کے بارے میں نہیں لکھا گیا“۔

یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جس موضوع یا جس ہستی پر جتنا زیادہ لکھا جائے اُس کے جوابات بھی اتنی ہی شدت سے آتے ہیں اور یوں نہ صرف وہ موضوع یا ہستی اعتراضات کی زد میں آکر متنازعہ ہو جاتی

ہے بلکہ وہ کتابیں بھی، قطع نظر اس کے کہ وہ حمایت میں ہیں یا مخالفت میں، مشکوک ٹھہرتی ہیں جو اُس پر لکھی گئی ہوں۔ شائد یہی وہ وجہ تھی جس کے باعث علی دشتی یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہوئے کہ پیغمبر اسلام کے متعلق اس قدر زیادہ لکھے جانے کے باوجود ایک بھی ایسی کتاب نہیں ملتی جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس کتاب کو غیر جانبداری اور معروضی انداز سے لکھا گیا ہے۔ حضور کے متعلق اب تک جو بھی لکھا گیا ہے وہ دو انتہاؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک طرف ہمیں عقیدت کی شیرینی میں لتھڑی ایسی کتابیں ملتی ہیں جن کے مطالعے سے ایک ایسی ہستی کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، جو تاریخ میں پہلے کبھی آئی ہے اور نہ ہی مستقبل میں کبھی آئے گی۔ ان کتابوں میں پیغمبر اسلام ہمیں ایک ایسے مکمل انسان کے روپ میں ملتے ہیں، جن کے کردار میں ایک بھی بشری خامی یا کمزوری نہیں تھی۔

اسی عقیدت کے نتیجے میں حضور کو سرور کونین، آقائے دوجہاں، محسن انسانیت، رحمت العالمین، سراجاً منیرا، محبوب الٰہی اور شافع محشر جیسے بے شمار القابات سے پکارا جاتا ہے۔ کچھ لوگ حضور کو بشر کی بجائے نور قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگوں کے بقول وہ وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ یعنی خالق نے کائنات کو تخلیق ہی اس لیے کیا تھا کہ حضور نے اس میں ظہور کرنا تھا۔ اگر اُنھوں نے کائنات میں ظہور نہ کرنا ہوتا تو کائنات سرے سے تخلیق ہی نہ ہوتی۔ آپ وہ ہستی ہیں جن کو بنا کر خود خدائے واحد بھی فخر کرتا ہے، کعبہ آپ کو سجدے کرتا ہے۔

جہاں پیغمبرِ اسلام سے شدید محبت کے تحت لکھی گئی بے شمار کتابیں موجود ہیں جو اپنے زور قلم اور فرطِ عقیدت سے اُنھیں مافوق البشر بلکہ مافوق الفطرت ہستی ثابت کرتی ہیں، وہیں اُن کے مقابلے پر نفرت یا تعصب پر مبنی ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو اُنھیں ایک منفی انسان کے طور پر پیش کرتی ہیں اور تاریخِ اسلام کے سنہرے دنوں کو ظلم اور جبر کا سیاہ باب ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں حضور کی ذات کی اُس سے بالکل الٹ تصویر پیش کرتی ہیں جو ہمیں اول الذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کتابوں میں

پیغمبر اسلام کی ذات پر ایسے الزام لگائے گئے ہیں، جنھیں دہرانا یا لکھنا تو در کنار، ان کے تصور سے ہی دانتوں تلے پسینہ آجاتا ہے۔

علی دشتی کوئی معمولی انسان نہیں تھے وہ ایک عالم دین تھے۔ ان کا بچپن نجف و کربلا کے مدرسوں سے دینی تعلیم حاصل کرنے میں گزرا۔ اسی وجہ سے جہاں اُنھیں قرآن، حدیث، فقہ پر عبور تھا وہیں تاریخ عالم، تاریخ اسلام اور عربی و فارسی ادب وغیرہ پر بھی دسترس حاصل تھی۔ مستشرقین کی لکھی ہوئی شائد ہی کوئی کتاب ایسی ہو جو اُن کے زیر مطالعہ نہ رہی ہو۔ اُن کی رسائی نہ صرف دونوں انتہائی سوچوں تک تھی بلکہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے کثیر شب و روز عمیق مطالعہ اور مشاہدے میں صرف کیے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ صاحبِ فکر اور صاحبِ علم انسان ہونے کے ناطے وہ ان دونوں انتہائی مکتبہ ہائے فکر کی شدتوں کے درمیان سے ایک نئی راہ پیدا کرتے۔ اور یہ راہ ہمیں ”بیست و سہ سال“ کی صُورت میں دکھائی دیتی ہے، جہاں یہ کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام کے متعلق کسی بھی مثبت یا منفی تعصب سے بالاتر ہو کر ایک متوازن کتاب لکھی جائے۔

”بیست و سہ سال“ پڑھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دشتی پیغمبر اسلام کو پیغمبر کی بجائے ایک نابغہ روزگار انسان سمجھتے تھے۔ ایک ایسا نابغہ کہ تاریخ جس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ پیغمبر اسلام کو بیسویں صدی کے معیارات پر تول کر ایک غیر فطری اور غیر عقلی موازنہ نہیں کرتے، بلکہ اُنھیں ساتویں صدی کے ایک بدو معاشرے کے مصلح کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جنھوں نے قبیلوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے گروہوں کو ایک معاشرت عطا کی۔ دشتی نے جہاں اُس دورِ معاشرت کے رسوم و رواج کو آفاقی قدریں قرار دینے، عورتوں اور لونڈیوں کے معاملے میں اسلامی احکامات، عورت کا کمتر مرتبہ، جائیداد میں کم حصہ، آدھی گواہی، مردوں کی عورتوں کو پیٹنے کی اجازت، مکّہ سے مدینہ آمد کے بعد حضور کی شخصیت میں ڈرامائی تبدیلی، بتدریج مطلق اقتدار کے حصول اور دیگر وجوہات کی بنا پر بنو قریظہ کا سانحہ اور سیاسی قتل جیسے واقعات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، وہیں اکثر واقعات کی

توجیہ پیش کرتے ہوئے کوشش کی ہے کہ پیغمبر اسلام کی شبیہ منفی انداز میں نہ ابھرنے پائے۔ یوں اس کتاب کو پیغمبر اسلام کا ایک ایسا پورٹریٹ کہا جا سکتا ہے، جسے پینٹ کرتے وقت مصور نے معروضیت کے علاوہ انتہائی ہمدردی کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔

علی دشتی نے "بیست و سہ سال" لکھتے وقت جس معروضیت کا مظاہرہ کیا ہے، اُسی معروضی رویے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ میں اس کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کتاب کا بلند تحقیقی معیار اور مصنف کا مدلل اور غیر جانبدارانہ انداز بیان ایسے نمایاں اوصاف ہیں جو کسی بھی جویائے علم کو اپنی گرفت میں لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہی وہ واحد وجہ تھی جس نے مجھ جیسے طالبِ علم کو اس قدر متاثر کیا کہ میں قلم سنبھالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس ترجمے کا محرک میری یہ خواہش تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے اس کتاب کو اردو زبان کے قارئین تک پہنچایا جائے۔

اگرچہ Twenty Three Years: A Study of the Prophetic Career of Mohammad کے عنوان کے تحت اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن انگریزی ترجمہ مغربی قارئین کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا۔ چنانچہ ترجمے میں ایسی معلومات اور تفصیلات بھی درج کی گئی ہیں جو فارسی کتاب کے متن میں ناپید ہیں۔ عین ممکن ہے کہ انگریز مترجم نے ایسا اس لئے کیا ہو کہ اس کتاب سے وہ قارئین بھی مستفید ہو سکیں جن کو تاریخ اسلام اور پیغمبر اسلام کی زندگی اور تعلیمات کے متعلق زیادہ علم نہیں۔ اسی لیے جو معلومات فارسی کتاب کے حاشیوں میں درج تھیں وہ بھی متن کا حصہ بنا دی گئیں۔ اس کے علاوہ کچھ معلومات یا جملے جو انگریز مترجم کو اہم محسوس نہیں ہوئے، وہ اُنھوں نے حذف کر دیے ہیں۔

میں اپنے آپ کو انگریز مترجم سے زیادہ خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں اُس مجبوری سے بچ نکلا جس کا سامنا انگریز مترجم کو ہوا۔ مجھے اُن کے مقابلے میں زیادہ باخبر اور باعلم قارئین ملے ہیں۔ یہ کتاب جس

موضوع کا احاطہ کرتی ہے، اردو پڑھنے والے قارئین اُس موضوع اور اُس کی بہت سی تفصیلات سے کافی حد تک پہلے سے ہی آگاہ ہیں۔ اردو پڑھنے والوں کی اس موضوع سے واقفیت کے حوالے سے ایک مثال دینا شائد بہتر رہے گا۔ اس کتاب کے ایک باب کا فارسی عنوان "محمد بشر است" ہے۔ انگریز مترجم نے "محمد بشر است" کا ترجمہ The Humanity of Muhammad یعنی "محمد کی انسانیت" کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ عنوان کا ترجمہ نہیں ہو پایا کیونکہ اس ترجمے میں حضور کے حوالے سے بشر اور نور کی بحث یا تصور کہیں کھو گیا ہے۔ جب کہ میں اس عنوان سے صرف "است" کا ترجمہ کر کے سرخرو ہو گیا ہوں۔ اردو قاری کی باخبری کی ہی یہ دین ہے کہ مجھے متن میں اضافہ یا کمی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ چنانچہ متن کی عبارت متن میں اور حاشیوں کی عبارت حاشیوں میں درج کی گئی ہے

فارسی سے اردو ترجمہ انگریزی کے مقابلے میں ویسے بھی کافی آسان ہے، کیونکہ اردو اور فارسی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانیں ہیں۔ ادبی روایات، تصورات، استعارات و تشبیہات، خیالات و کیفیات کا بیان، گرامر اور سب سے اہم فقروں کی ساخت ایک جیسی ہے۔ مثلاً فارسی فقرے کی تشکیل میں پہلے فاعل پھر مفعول اور آخر میں فعل استعمال ہوتا ہے اور یہی کچھ اردو میں بھی ہوتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں مغربی زبانوں میں فقرے میں پہلے فاعل، پھر فعل اور آخر میں مفعول ہوتا ہے۔ یہ فارسی اور اردو کے قریبی رشتوں اور مماثلتوں کی ہی دین ہے کہ میں اس کتاب کا لفظی ترجمہ کرنے کی عیاشی کا متحمل ہو پایا ہوں۔ چنانچہ میں نے کافی جگہ لفظی تراکیب اور جملوں کی ساخت بھی وہی رکھنے کی کوشش کی ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ ایک آدھ بار فارسی کہاوت کا ترجمہ بھی لفظی طور پر کیا ہے اور کہاوت یا جملے سے مراد کیا ہے، کو حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ اگر کسی لفظ کا اردو متبادل نہیں سوجھا تو اُس کے لیے فارسی لفظ استعمال کیا گیا ہے اور فارسی لفظ کا انگریزی متبادل قوسین میں درج کر دیا گیا ہے۔ شائد عبارت کی روانی یا خوبصورتی کہیں کہیں مجروح ہوئی ہے، لیکن ظاہر ہے تحقیق کی کتابوں میں موضوع کا ابلاغ حُسنِ بیان پر فائق ہے۔

جہاں کتاب کی عبارت کا لفظی ترجمہ کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہیں ایک اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے ترجمے کے وقت چند ایک تبدیلیاں ضرور کی ہیں۔ دشتی نے ہر کسی کا ذکر صیغہ واحد غائب سے کیا ہے لیکن مجھے جہاں ضروری محسوس ہوا، وہاں میں نے جمع غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اوپر ''محمد بشر است'' کے عنوان کا ذکر ہو چکا ہے جس کا ترجمہ ''محمد بشر ہے'' ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے اس کا ترجمہ ''محمد بشر ہیں'' کیا ہے۔ اس کے علاوہ پوری فارسی کتاب میں جہاں بھی حضور کے لیے ''اُو'' یعنی ''اُس'' استعمال ہوا ہے، وہاں میں نے اُس کی بجائے ''اُن'' ترجمہ کیا ہے۔ اور ایسی ہی تبدیلیاں دوسری ہستیوں کے حوالے سے بھی کی گئی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں اصل عبارت یعنی صیغہ واحد غائب بھی استعمال کیا گیا ہے۔ خصوصی طور ''لڑکپن'' نامی باب میں کئی بار حضور کا ذکر صیغہ واحد غائب سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی اور باب میں حضور کا ذکر کرتے ہوئے صیغہ واحد غائب استعمال ہوا ہے تو اُس کے پیچھے گستاخانہ نیت کھوجنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ میرے نزدیک وہ ماحول صیغہ واحد غائب کا ہی تقاضا کر رہا تھا۔ پیغمبر اسلام کے لیے صلی اللہ علیہ وسلم یا اُن کے کسی بھی صحابی یا صحابیہ کے لیے رضی اللہ کا لاحقہ استعمال نہیں کیا گیا۔ تحقیق کی غیر جانبداری بر قرار رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا جن اصحاب کو ان لاحقوں کی کمی کھٹکے، وہ کتاب پڑھتے وقت دل میں ان لاحقوں کو ادا کر سکتے ہیں۔

فارسی کتاب اور اس ترجمے میں دوسرا فرق حاشیوں کی تعداد ہے۔ میں نے جہاں فارسی کتاب کے اصل حاشیے استعمال کیے ہیں، وہیں اپنے طور پر بھی فراخ دلی سے حاشیے لکھے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں سمجھا کہ اپنے لکھے ہوئے حاشیوں کے نیچے وضاحت لکھوں کہ یہ میرا لکھا ہوا حاشیہ ہے۔ اگر دشتی نے کسی وقوعہ کی تفصیل درج کرنے کی بجائے صرف یہ لکھا ہے کہ فلاں کتاب دیکھیں، تو میں نے اُس مضمون کو حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ کتاب میں درج مختلف واقعات یا دعووں کے حوالے سے جہاں ضروری محسوس ہوا، وہاں تصدیق و تائید کی خاطر تاریخ و احادیث کے حوالے اور دیگر اہم معلومات حاشیوں کے طور پر درج کر دی ہیں۔ اور یہ اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ کتاب میں درج واقعات کو

اپنے علم یا سوچ سے متصادم پاتے ہوئے کوئی اُنھیں دشتی کی ذاتی رائے یا افسانہ طرازی نہ سمجھے۔ دشتی نے اس کتاب میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ قرآن، حدیث، سیرت اور تاریخ اسلام میں درج ہے۔ اگر دشتی نے کسی ایسے مؤلف کا ذکر کیا ہے، جو اردو قارئین کے لیے اجنبی ہو سکتا ہے، تو میں نے اُس مؤلف کا دو تین سطروں میں تعارف لکھ دیا ہے۔ چند ایک باتیں جو میرے خیال کے مطابق تاریخ میں درج واقعات سے متصادم ہیں، اُن کا ذکر بھی حاشیوں میں کر دیا ہے۔ یوں اس ترجمے میں حاشیوں کی تعداد اصل کتاب کے مقابلے میں اگر تین گنا نہیں تو دو گنا یقیناً ہو گئی ہے۔

ترجمہ مکمل ہونے کے بعد چند دوستوں سے درخواست کی تھی کہ وہ "بیست و سہ سال" پر اپنے تاثرات سے نوازیں۔ اُن دوستوں کے تاثرات کتاب کے آغاز میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تاثرات نہ صرف کتاب میں درج مضامین سے بحث کرتے ہیں، بلکہ اپنے طور کئی ایسے سوال اٹھاتے ہیں جو بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک فرسودہ اور صدیوں سے جمود کے شکار معاشرے میں اصلاح اور حرکت کے لیے ایسے سوال پوچھنا شائد اب وقت کی ضرورت بن گئی ہے۔ کتاب کی زینت میں اضافے کا باعث بننے والے ان مضامین کو لکھنے کے لیے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔

سکول و کالج میں جو فارسی پڑھی تھی وہ زیادہ تر کلاسیکی فارسی ادب تھا جیسے فردوسی، سعدی، حافظ، خیام، نظامی گنجوی، مولانا جامی وغیرہ۔ ایک تو نصف صدی پہلے پڑھی اُس فارسی کو میں بھول چکا ہوں اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ "بیست و سہ سال" کلاسیکی فارسی میں نہیں بلکہ جدید فارسی میں لکھی گئی ہے۔ چنانچہ کئی بار عبارت سمجھنے میں مشکلات پیش آئی لیکن جب بھی کسی ایسی کٹھن گھڑی کا سامنا ہوا تو گوگل ٹرانسلیٹ مشکل کشا کے روپ میں میرے سامنے آیا۔ یہ میری بھولی بسری فارسی اور گوگل کا اشتراک تھا کہ میں اس بھاری پتھر کو اٹھا پایا۔ اور جہاں کہیں میری فارسی دانی میرا ساتھ چھوڑ گئی وہاں ناروے میں موجود میری ایک ایرانی مصنفہ دوست لِلی باندی کا وجود میرے لیے نعمت ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ میرے پاس بیست و سہ سال کی سافٹ کاپی ہے جس میں املا کی چند ایک غلطیاں ہیں۔ معجزہ نامی باب میں یہ فقرہ

ایک مشہور فارسی کہاوت کے طور پر درج ہے "سرود یاد زمستان دادہ است" جس کا اردو ترجمہ " گانا سردیوں کی یاد دلاتا ہے" ہے۔ لیکن اُس سیاق وسباق میں اس فقرے کی کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔ میں نے للی کو فون کر کے مدد مانگی کیوں کہ اُس کے پاس بیست وسہ سال کی ہارڈ کاپی تھی۔ لِلی نے کتاب میں دیکھا اور بتایا کہ میرے پاس موجود پی ڈی ایف فائل میں غلط فقرہ درج ہے، ایسی کوئی کہاوت نہیں ہے۔ اصل فقرہ "بادِ سرد نشان زمستان است" ہے یعنی ٹھنڈی ہوا سردیوں کی علامت ہوتی ہے۔ علی دشتی کے سوانح لکھنے کے سلسلے میں بھی لِلّی نے بہت زیادہ مدد کی، بلکہ یہ کہنا شائد زیادہ بہتر ہو گا کہ للی نے نارویجن زبان میں علی دشتی کی سوانح لکھی اور میں نے اُسی کے لکھے مضمون کو بنیاد بنا کر اردو سوانح لکھی، چنانچہ لِلی اور گوگل کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ آخر میں اپنی شاعرہ دوست نوشابہ شوکت صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے کتاب کی املا اور عبارت کو سنوارنے میں مدد دی۔

خالد تھتھال

ولادتِ بطل

رہی جز کعبہ و بتخانہ می پویم کہ می بینم
گروہی بت پرست اینجا و مشتی خود پرست آنجا
(میں کعبہ اور بُت خانہ کی بجائے کوئی اور راہ اختیار کروں گا، کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں پر بت پرستوں کا گروہ اور وہاں کچھ خود پرست موجود ہیں)۔

مولوی[2]

570ء میں مکّہ میں آمنہ بنت وہب کے ہاں ایک بچہ آنکھیں کھولتا ہے جس کا نام محمد رکھا جاتا ہے۔ یہ بچہ اپنے باپ عبداللہ بن عبدالمطلب کی موت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ پانچ سال کی عمر میں یہ اپنی ماں کو بھی کھو دیتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اُس کا صاحب حیثیت اور شفیق دادا، جو اس کا نگہبان اور سرپرست تھا، بھی دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ یہ بچہ جس کے کئی امیر اور صاحب حیثیت چچا موجود تھے، اپنے مفلس

2: ہمارے ہاں مولوی کا لفظ منفی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، جب کہ ایران میں مولوی کا لفظ انتہائی محترم ہے اور یہ لفظ صرف ایک ہی شخص کے لیے مختص ہے اور وہ "مولانا جلال الدین بلخی" ہیں جنھیں دنیا "رومی" کے نام سے جانتی ہے۔ ایران میں مذہبی عالموں کو "مُلّا" اور نماز کی امامت کرنے والوں کو "پیش نماز" کہتے ہیں۔ ترکی میں امامت کا فریضہ نبھانے والوں اور دین کے شعبہ سے تعلق رکھنے والوں کو Hoca (خوجہ) کہتے ہیں۔ جیسے مولوی کا لفظ ایران میں رومی کے لیے مختص ہے، اسی طرح ترکی میں Mevlana (میولانا یعنی مولانا) کا لفظ صرف رومی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ترکی میں اگر کوئی صرف میولانا کا لفظ استعمال کرے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ اس وقت رومی کی بات کر رہا ہے۔

ترین لیکن بلند حوصلہ چچا کے ہاں پرورش پاتا ہے[3]۔ اور پھر یہ بچہ ایک ایسی حیران کن اور لاثانی داستان تخلیق کرتا ہے۔ کہ خود ساختہ اور تاریخ ساز انسانوں کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

اس غیر معمولی انسان کی زندگی اور تیئیس سالوں میں پیش آنے والے واقعات، کامیابیوں، ناکامیوں اور کردار و گفتار کے متعلق ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ دانشوروں اور محققین کو اُس کے متعلق جس قدر معلومات دستیاب ہیں، اتنی کسی بھی اور تاریخی شخصیت کے متعلق نہیں ملتیں۔ لیکن ابھی تک اُس کے متعلق کوئی بھی مدلل اور عقلیت پر مبنی ایسی کتاب سامنے نہیں آئی، جو ذاتی اغراض و تعصبات کی دبیز تہہ سے اٹی ہوئی نہ ہو۔ اور اگر کوئی ایسی کتاب لکھی گئی ہے تو میری اُس تک رسائی نہیں ہو سکی۔

مسلمانوں نے اپنی لکھی ہوئی تاریخ میں مسلسل کوشش کی ہے کہ اُسے ایک تخیلاتی اور مافوق البشر انسان بلکہ انسان کے روپ میں خدا کے طور پر پیش کریں۔ ایسی کوششوں میں جہاں اُس کے بشری خصائص کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہیں علت و معلول کا قانون جو زندگی کا بنیادی اصول ہے، بھی پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اپنے تخیل کی پرواز کو معجزات کے طور پر پیش کرنا اِن لکھنے والوں کی عادت بن چکی ہے۔

3: حضور کی پرورش کے سلسلے میں ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ عبد المطلب کے مرنے کے بعد اُن کی پرورش کی ذمہ داری اُن کے تایا زبیر بن عبد المطلب نے لی جو خاصے صاحب حیثیت تھے۔ جب کہ اُن کے مقابلے میں ابو طالب خاصے مفلوک الحال تھے، اُن کی ٹانگ میں نقص تھا، چنانچہ وہ کسی دور دراز علاقے میں تجارتی سفر پر جانے کی بجائے مقامی طور پر اشیا کی خرید و فروخت سے گزر بسر کرتے تھے۔ حضور نے شام کے جو دو سفر کیے وہ ابو طالب نہیں زبیر کے تجارتی سفر تھے۔ چھٹی صدی کے اواخر میں قبیلہ قریش اور بنو ہوازن کے درمیان پانچ جنگیں ہوئیں جنھیں حرب الفجار کہا جاتا ہے۔ حضور آخری حرب الفجار میں موجود تھے لیکن اس میں عملی طور پر حصہ لینے کی بجائے خود کو اپنے تایا کو تیر تھمانے تک محدود رکھا۔ حرب الفجار کے وقت آپ کی عمر کے متعلق مختلف دعوے کیے جاتے ہیں جو اٹھارہ سے پچیس سال کے درمیان ہیں۔ زبیر حرب الفجار سے کچھ عرصہ بعد فوت ہوئے، اس کے بعد ابو طالب نے آپ کی سرپرستی کی، شعب ابو طالب کے موقع پر حضور کے متعلق ابو طالب کا کردار سامنے آتا ہے۔

610ء یعنی اُس بچے کے چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے کی کوئی بھی قابل ذکر بات ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی۔ اُن وقتوں کے متعلق لکھی گئی سیرت اور روایات میں بھی ہمیں کوئی حیرت انگیز خبر یا غیر فطری بات نہیں ملتی۔ اس کے باوجود، محمد بن جریر طبری[4] جنھوں نے تیسری صدی ہجری میں قران کی تفسیر لکھی، وہ سورت البقرۃ کی تئیسویں آیت کے متعلق بے بنیاد دعوے کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اسلاف سے عقیدت کی وجہ سے حقیقت پسندی سے انحراف کرتے ہوئے عامیانہ قسم کی افسانہ طرازی کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگ تو در کنار، مؤرخین بھی تاریخ نویسی کی بجائے اساطیری کہانیاں تخلیق کرنے سے دامن نہیں بچا پائے۔ سورت البقرۃ کی تئیسویں آیت یوں ہے۔

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ

اس آیت کے معنی بہت واضح ہیں: "اگر تمہیں قران کے متعلق شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کی طرح کی ایک سورت بنا کر لے آؤ، اگر تم سچے ہو"۔

محمد بن جریر اس آیت کے متعلق ذیل میں یوں لکھتے ہیں:

"بعثت سے قبل مکّہ میں یہ عام خبر تھی کہ محمد نام کے پیغمبر کا ظہور ہونے والا ہے جو مشرق و مغرب میں غلبہ حاصل کرے گا۔ اُس وقت مکہ میں چالیس عورتیں پیٹ سے تھیں جن میں سے ہر ایک نے اپنے بچے کا نام محمد رکھا کہ وہ پیغمبر مبعوث ہو جائے"۔

4: طبری ایرانی مورخ و مفسر تھے، عباسی خلیفہ معتصم باللہ کی خلافت کے دوران 838ء میں پیدا ہوئے۔ طبرستان (موجودہ نام ماژندران) کے علاقے سے تعلق کی وجہ سے طبری کہلائے۔ "جامع البيان عن تأويل آي القرآن" نامی تفسیر اور "تاریخ الرسل والملوک" نامی تاریخ لکھنے کے حوالے سے مشہور ہیں۔ "تاریخ الرسل والملوک" کو "تاریخ الامم والملوک" بھی کہا جاتا ہے، لیکن ہمارے ہاں لوگ اسے تاریخ طبری پکارتے ہیں۔ طبری کا تعلق شافعی فرقہ سے تھا، لیکن اُن کی اپنی آراء اور فتاویٰ کے نتیجے میں جریری فرقہ وجود میں آیا۔

اس دعوے کی لایعنیت اس قدر واضح ہے کہ اس کو رد کرنے کے لیے صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے۔ کہ مکہ میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی جس کے مطابق کسی محمد نامی رسول کا ظہور ہونے والا تھا۔ حتیٰ کہ ابو طالب جو اُن کے حامی اور نگہبان تھے، وہ بھی اس خبر اور نشانیوں سے لاعلم تھے۔ اسی وجہ سے وہ اسلام قبول کیے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہوئے[5]۔ خود حضرت محمد بھی وحی بھیجے جانے سے قبل اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ مستقبل میں مبعوث ہونے جا رہے تھے[6]۔ مکہ میں وہ اعداد و شمار کہاں سے حاصل کیے گئے ہیں، جس کے مطابق 570ء میں صرف چالیس عورتیں حاملہ ہوئیں اور سب نے بلا استثنیٰ لڑکے جنے اور سب کا نام محمد رکھا گیا؟۔ کیا محمد بچپن میں اپنے ان ہم عمر چالیس بچوں کے ساتھ کھیلے تھے؟۔

5: مسیب بن حزن رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے پاس تشریف لائے۔ ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ دونوں اُس کے پاس (پہلے سے موجود) تھے، آپ نے فرمایا: "اے چچا! 'لا إله إلا الله' کا کلمہ پڑھ لے، میں اسے اللہ تعالیٰ کے پاس تیرے لیے بطور حجت پیش کروں گا"، ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ دونوں کہنے لگے: "اے ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے منہ موڑ لو گے؟ وہ دونوں اُس سے اس قسم کی باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ آخری بات جو ابو طالب نے اُن سے کی وہ یہ تھی کہ (میں) عبدالمطلب کے دین پر ہوں، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے فرمایا: "میں تیرے لیے مغفرت طلب کرتا رہوں گا بشرطیکہ مجھے روک نہ دیا گیا"، تو یہ آیت اتری: "مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ" (نبی اور اہل ایمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے مغفرت طلب کریں" التّوبَة: 113) اور یہ آیت بھی اتری: "إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ" (تم جسے چاہو ہدایت کے راستہ پر نہیں لا سکتے۔ القَصَص: 56)۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز۔

6: سورت یونس کی آیت 17 اس میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: "قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا"۔ مفہوم یہ ہے کہ میں نے اتنا عرصہ تمہارے ساتھ رہا، اور کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اب مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے جو اللہ کی مرضی سے تمھیں سناتا ہوں

واقدی آنحضرت کے متعلق مختلف بات لکھتے ہیں: ”جو نہی وہ ماں کے شکم سے باہر آئے تو اُنھوں نے ” اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا “ کہا[7]، ایک ماہ کی عمر میں اُنھوں نے گھسٹ کر چلنا شروع کیا، دوسرے مہینے کھڑے ہو گئے، تیسرے مہینے چلنا شروع ہو گئے، چوتھے مہینے دوڑنے لگے اور نو ماہ کی عمر میں آپ نے تیر چلایا“۔

کیا ایسا ممکن ہے، کہ مکہ جیسے چھوٹے قصبے میں رہنے والے لوگ ان مافوق الفطرت واقعات سے بے خبر رہے ہوں، وہ بت پرستی چھوڑ کر محمد کے سامنے سجدہ ریز کیوں نہ ہو گئے؟۔

یہ مسلمانوں کی تاریخ نویسی اور افسانہ طرازی کا ایک نمونہ ہے۔ اس کے برعکس کچھ مغربی عیسائیوں نے اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے محمد کو جھوٹا، جاہل، مہم جُو، جاہ طلب اور شہوت زدہ قرار دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں گروہوں نے معروضی انداز میں واقعات کو ویسے بیان نہیں کیا جیسے کہ وہ رونما ہوئے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عقائد خواہ سیاسی ہوں خواہ دینی و مذہبی ہوں، وہ انسانی عقل کے استعمال اور صورت حال کو واضح انداز میں دیکھنے کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ موضوع بحث کے چہرے پر اچھائی یا برائی کا پردہ مستقل طور پر کھینچ دیا جاتا ہے۔ محبت و نفرت، تعصب و ضد اور تلقینی عقائد زیر بحث انسان کو دھوئیں، دھند اور تصورات کے پیچھے غائب کر دیتے ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس امتیاز کی وجہ اُن کی حد درجہ ذہانت، خیالات کی گہرائی اور اپنے زمانے کے اوہام اور خرافات سے بیزاری تھی۔

7: بابی مذہب کے بانی سید علی محمد باب کے متعلق بھی ایک ایسا ہی دعویٰ کیا جاتا ہے۔ معروف کتاب ”نقطة الكاف“ میں میرزا جانی کاشانی نے سید علی محمد باب کی نسبت سے لکھا ہے کہ سید علی محمد جو نہی شکم مادر سے باہر آئے تو اُنھوں نے ”الملک اللہ “یعنی اللہ ہر چیز کا مالک ہے، کے الفاظ ادا کیے۔

اور اِن سب سے اہم اُن کا عزم اور قوت ارادہ تھی جس کی وجہ سے وہ تن تنہا برائی کے خلاف صف آرا ہوئے۔ وہ سخت لہجے میں لوگوں کو فساد اور تباہی کے متعلق تنبیہ کرتے تھے۔ فسق وفجور اور جھوٹ وخود غرضی کورد کرتے تھے۔ محروم اور کچلے ہوئے لوگوں کے حقوق کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک خدا کی بجائے پتھر کے بتوں کی پرستش کے احمقانہ رویے پر سرزنش کرتے تھے۔ اور اُن کے خداؤں کی بے بسی اور کم مائیگی کی تحقیر کرتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ معاشرے میں وقار اور ساکھ کے مالک تھے اور معتبر گردانے جاتے ہیں اُن لوگوں کا آپ کی باتوں کو اہمیت نہ دینا ایک فطری عمل تھا۔ کیونکہ ان باتوں پر دھیان دینے کا نتیجہ اُن تمام آداب، رسوم اور عقائد کے خاتمے کی صورت میں نکلنا تھا جن کے وہ صدیوں سے عادی ہو چکے تھے، اور جن کی حیثیت تمام موروثی عقائد کی طرح اُن کے نزدیک مسلمہ تھی۔

قریش کے لیے یہ صورت اس لیے بھی قابل قبول نہیں تھی کہ اُن کے اجتماعی نظام جس کی بنیاد اُن کے اجداد نے رکھی تھی، کو ختم کرنے کی خواہش ایک ایسا انسان کر رہا تھا جو مرتبے اور شان و شوکت میں اُن کا ہم پلہ نہیں تھا۔ اُنھی کے قبیلے کا ایک یتیم بچہ جس پر رحم کھاتے ہوئے اُس کا چچا اُسے پال رہا تھا۔ جس کا بچپن اپنے چچا اور ہمسایوں کے اونٹ چراتے گزرا تھا۔ جسے جوانی میں ایک مالدار عورت کی خدمت کے عوض کچھ عزت اور وقار نصیب ہوا تھا۔

وہ شخص جو کل تک قبیلہ قریش میں ایک عام سا انسان سمجھا جاتا تھا، جس کی کوئی امتیازی حیثیت یا تشخص نہیں تھا، اب اُن کی راہنمائی کا دعویٰ کر رہا تھا اور خدا کی طرف سے رسالت تفویض کیے جانے کا مدعی تھا۔ بنو مخزوم کے سردار ولید بن مغیرہ[8] جو قریش کے رؤسا میں سے تھا، کا طرز فکر قریشی سرداروں کے

8: ولید بن مغیرہ بنو مخزوم کا سردار ہونے کے علاوہ اس قدر امیر تھا کہ قریش کے تجارتی کاروان میں اس کے سو اونٹ شامل ہوا کرتے تھے۔ مکّہ کے اشراف میں شمار ہوتا تھا۔ اسلام کے بدترین دشمنوں میں سے ایک ہونے کے علاوہ خالد بن ولید کا باپ تھا۔ حج کے دنوں میں

رویوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ولید بن مغیرہ نے غصے اور تکبر سے کہا: ”بنو قریش کے مجھ جیسے سردار اور بنو ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود[9] جیسے شخص کے ہوتے ہوئے محمد کیسے پیغمبری کا دعویٰ کر سکتا ہے؟“۔ ابو جہل[10] نے ایک روز اخنس بن شریق[11] سے کہا: ”ہم میں اور بنو عبد المناف میں برتری کے

ہر روز 10 اونٹ ذبح کرتا اور یہ سلسلہ 40 دن تک جاری رہتا تھا۔ خانہ کعبہ کی از سر نو تعمیر کے لیے جب پرانی عمارت کو گرانے سے ہر کوئی گھبرا رہا تھا کہ کوئی عذاب نازل نہ ہو جائے تو ولید نے پہلی ضرب لگائی۔ کعبہ کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ رقم ادا کی۔ کعبہ کے غلاف کے لیے جب رقم اکٹھی کی جاتی تو ولید کئی بار اکیلے ہی غلاف کی پوری لاگت ادا کر دیتا تھا۔ سورت الزّخرُف کی آیت 31 اور 32 اسی ولید بن مغیرہ اور عروہ بن مسعود کی بات کی مناسبت سے نازل ہوئیں۔ ”وَقالوا لَولا نُزِّلَ هٰذَا القُرآنُ عَلىٰ رَجُلٍ مِنَ القَريَتَينِ عَظيمٍ ۔ أَهُم يَقسِمونَ رَحمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحنُ قَسَمنا بَينَهُم مَعيشَتَهُم فِي الحَياةِ الدُّنيا“ (اور کہا کیوں یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی سردار پر نازل نہیں کیا گیا۔ کیا وہ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں ان کی روزی تو ہم نے ان کے درمیان دنیا کی زندگی میں تقسیم کی ہے)۔

9: عروہ بن مسعود، بنو ثقیف کا سردار، بعثت کے آغاز میں پیغمبر کا مخالف تھا۔ یہ وہی عروہ ہے جس کی ابو بکر سے تلخ کلامی ہوئی تو ابو بکر نے عروہ کو کہا ”تو جا کر لات کی شرمگاہ چوس“۔ 8 ہجری میں اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے قبیلے میں جا کر اسلام کی تبلیغ کرنے کی اجازت چاہی۔ قبیلے والوں کو دعوت دی لیکن ناکامی کا سامنا ہوا۔ فجر کے وقت چھت پر چڑھ کر اذان دی اور کلمہ شہادت بلند آواز سے پڑھا۔ ایک ثقفی نے تیر مارا جس کے نتیجے میں وہیں ہلاک ہو گیا۔

10: اصل نام عمرو بن ہشام تھا۔ بنو مخزوم سے تعلق تھا اور مکّہ کے شرفا میں شمار ہوتا تھا۔ اپنی ذہانت اور دانشمندی کی وجہ سے ابو الحکم (حکمت و دانش کا باپ) کہلاتا تھا۔ اسلام کا بدترین مخالف ہونے کی وجہ سے مسلمان اُسے ابو جہل (جہالت کا باپ) کہتے تھے۔ جنگ بدر میں ہلاک ہوا۔

11: اخنس بن شریق اوائل اسلام کا شاعر، اسلام کا مخالف اور امیر آدمی تھا۔ اخنس کا تعلق طائف کے بنو ثقیف قبیلہ سے تھا، طائف چھوڑ کر مکہ میں آباد ہوا اور مکہ کے اشراف میں شمار ہوا۔ اخنس کے قریش کی بنو زہرہ شاخ کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ جب حضور نے اسلام کی دعوت دی تو اخنس نے بہت زیادہ مخالفت کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضور تبلیغ اور قریش کے خلاف مدد مانگنے کی خاطر طائف گئے اور وہاں سے لہولہان ہو کر آئے تو آپ نے اخنس سے پناہ مانگی تھی لیکن اُس نے آپ کی درخواست رد کر دی۔ اخنس بن شریق اور بنو زہرہ کے لوگ غزوہ بدر میں حصہ لینے کے لیے نکلے تھے لیکن جب خبر ملی کہ ابو سفیان کا کاروان سمیت صحیح سلامت مکہ پہنچ گیا ہے تو اخنس بنو زہرہ سمیت واپس لوٹ گیا۔ فتح مکہ کے بعد اخنس اور بنو زہرہ نے اسلام قبول کر لیا۔ اخنس کی موت عمر بن خطاب کے دور خلافت میں ہوئی۔

حوالے سے رقابت چل رہی تھی، اس مقابلے میں اب ہم برابری کی سطح پر پہنچ چکے ہیں، تو اُن میں سے ایک نے پیغمبری کا دعویٰ کر دیا ہے، یوں بنو عبد المناف ہم پر برتری حاصل کرنا چاہ رہے ہیں"۔

اس قسم کی باتوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جب محمد نے اُنھیں دین کی دعوت دی تو قریشی سرداروں کا طرز فکر اور رویہ کیا تھا، اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ آپ کی نبوت کو مثبت نہیں گردان رہے تھے۔ یعنی وہ ان خطوط پر بالکل نہیں سوچ رہے تھے کہ خدا ایک ہے اور اُس نے اُنھی میں سے ایک کو ہدایت کے لیے چنا ہے، جس کے متعلق قرآن میں کئی بار کہا گیا ہے۔ اُنھیں اعتراض اس بات پر تھا کہ اگر خدا ہمیں ہدایت دینا چاہتا ہے تو اُس نے اس کام کے لیے ایک عام انسان کو کیوں مامور کیا ہے۔ اس بات کا جواب قرآن میں یوں دیا گیا ہے۔ کہ اگر فرشتے بھی زمین پر رہ رہے ہوتے تو اُنھی فرشتوں میں سے ایک کو ہم رسول بنا کر بھیجتے۔ یہ نکتہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اُنھیں بنیادی بات سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ محمد کی تعلیمات اور باتوں پر اُن کے کان نہ دھرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور ان کی باتیں عقلی طور پر اور معاشرے کی اصلاح پر کس قدر منطبق ہوتی ہیں۔

ہر معاشرے میں، خواہ وہ کس قدر شر پسند اور گلا سڑا کیوں ہو، کچھ روشن خیال اور نیک لوگ ضرور موجود ہوتے ہیں جو سچی باتوں کو پسند کرتے ہیں خواہ وہ باتیں کسی کے منہ سے بھی نکل رہی ہیں۔ ایسے لوگوں میں سے پہلے ابو بکر تھے، اُن کی تقلید میں عبد الرحمٰن بن عوف [12]، عثمان بن عفان، زبیر بن

12: اسلام سے قبل عبد الرحمٰن بن عوف کا نام عبد الکعبہ تھا۔ آپ ان پانچ لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ابو بکر کے کہنے پر اسلام قبول کیا۔ ان کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ انتہائی رئیس انسان تھے۔ عمر فاروق نے نیا خلیفہ چننے کے لیے جن چھ لوگوں کی شوریٰ مقرر کی تھی، آپ اُن میں شامل تھے۔ تیسرے خلیفہ کے تقرر کا فیصلہ آپ نے ہی سنایا تھا۔

العوام[13]، طلحہ بن عبید اللہ[14] اور سعد بن ابی وقاص[15] جیسے قریش کے چند معتبر افراد بھی ایمان لے آئے۔

اس کے علاوہ ہر معاشرے میں ایک ایسا طبقہ موجود ہوتا ہے جو دنیاوی نعمتوں سے محروم ہوتا ہے جو فطری طور پر معاشرے میں ایک ناراض اور غیر مطمئن طبقے کی تشکیل کا باعث ہوتا ہے۔ یہ طبقہ محمد کے گرد جمع ہوا اور اُن کے افکار و گفتار کا مدح سرا ہوا۔ اقلیتی و اکثریتی طبقہ کی نبرد آزمائی فطری بات تھی۔ اکثریت کو اپنے مال و زر پر ناز تھا، لیکن اقلیت نے محمد کے رویے اور پیغام کی ستائش کی۔ اور اُن کو اپنا رہبر اور ہادی تسلیم کرتے ہوئے اُن کے پیغام کو پھیلانے کے لیے اُن کی ذات سے ان ہونی خصوصیات منسلک کر دیں۔ اُن کا یہ رویہ اپنے رہبر کی زندگی کے دوران کسی حد تک معقولیت کی حدود کے اندر تھا، لیکن اُن کی موت کے بعد اس میں روز بروز اضافہ ہوا۔ جو اس حد تک جا پہنچا کہ کچھ عرصہ بعد اُنھوں نے تخیلات کے زور پر اپنے رہبر سے بشر کی بجائے اللہ کے بیٹے جیسی خصوصیات وابستہ کر دیں اور اُنھیں تخلیق کائنات کی واحد وجہ بلکہ دنیا کا مالک قرار دے ڈالا۔

ایک واضح اور ناقابل انکار نمونہ ہمیں بتاتا ہے کہ تصورات و تخیلات کیسے پیدا ہوتے اور اصلیت کو چھپاتے ہیں۔ قرآن مسلمانوں کی سب سے محکم اور سب سے زیادہ مستند دستاویز ہے۔ سورت الإسرَاء

13: زبیر بن عوام، محمد کے پھوپھی زاد اور ابو بکر کے داماد تھے۔ ان کا شمار بھی عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ جنگ جمل میں ایک تیر لگنے سے موت ہوئی۔

14: طلحہ بن عبید اللہ اسلام قبول کرنے والے پہلے آٹھ لوگوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کا تعلق بنو تیم سے تھا، آپ کا شمار بھی عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ جنگ جمل میں عائشہ کی طرف سے حصہ لیا، اور عائشہ کے لشکر میں ہی شامل مروان بن حکم کے تیر سے زخمی ہوئے اور اسی کے نتیجے میں موت ہوئی۔

15: سعد بن ابی وقاص کا تعلق بنو زہرہ سے تھا۔ ایران پر اسلامی یلغار کے لشکر کی قیادت کی، فتح پانے کے نتیجے میں فاتح ایران کہلائے۔ ایران پر حملے کی خاطر کوفہ کا شہر بسایا اور وہاں کے والی بھی رہے۔

جو ایک مّکی سورت ہے، کے آغاز میں درج آیت سے معراج کا قصہ تخلیق کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک سادہ اور عقلی طور پر قابل توجیہ آیت ہے۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ

اس آیت میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: ''پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی جس کے گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے''۔

اس آیت سے ایک روحانی سفر کے معانی لیے جاسکتے ہیں۔ اپنی ذات میں گم رہنے والے اور روحانیت کے میدان میں سرگرم اشخاص ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سادہ سی آیت نے مسلمانوں میں بہت سی ایسی حیرت انگیز داستانوں کو جنم دیا ہے جو کسی طور سے بھی عقلیت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ تفسیر جلالین قرآن کی سب سے معتبر اور سب سے زیادہ قابل توجیہ تفسیر ہے[16]۔ کیونکہ اس کے مفسرین فرقہ بازی سے دور اور تعصب و جانبداری سے بالا ہیں۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو قرآن کے معانی اور توجیہ بیان کرنے تک ہی محدود رکھا ہے اور کبھی کبھار بعض آیات کی شان نزول بیان کی ہے۔ اس کے باوجود سورت الإسرَاء کی پہلی آیت کے مطالب کی مناسبت سے اُنھوں نے پیغمبر

16: تفسیر جلالین سے مراد قرآن کی دو تفاسیر ہیں، جن میں ایک جلال الدین السیوطی اور دوسری جلال الدین المحلی کی تالیف ہے۔ دونوں کے نام جلال الدین ہے، اس لیے ان دونوں کی تفاسیر کو ملا کر تفسیر جلالین کہا جاتا ہے۔

سے متعلق بے بنیاد قول نقل کیا ہے۔ کیا اُنھوں نے اس آیت کی وجہ نزول اور اس کے مبہم معانی کی تفسیر و توجیہ کی ہے یا مسلمانوں کے اندر رائج کہانیوں کا خاکہ بیان کیا ہے؟۔

جو بھی صورت ہے، پیغمبر سے جو قول منسوب کیا گیا ہے اُس کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس کا بھی ذکر نہیں کیا گیا کہ اس قول کا راوی کون ہے۔ (اگر راوی مل بھی جاتا تو) وہ راوی معتبر اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ سند کے بغیر واقعے کو بیان کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں مفسرین کو اپنی نقل کردہ روایت کی صحت کا خود بھی یقین نہیں تھا۔ وہ پیغمبر کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

اُس رات جبرائیل میرے پاس آئے اور اُن کے ہمراہ سفید رنگ کا ایک گدھے سے بڑا اور گھوڑے سے چھوٹا چوپایہ تھا۔ اُس کے پاؤں کے سُم باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں اُس پر سوار ہو کر بیت المقدس گیا۔ اس جانور کی باگوں کو اُس حلقے سے باندھ دیا جہاں انبیاء عموماً اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ میں نے مسجد اقصیٰ میں دو رکعت نماز پڑھی۔ جب باہر آیا تو جبرائیل میرے پاس دو پیالے لے کر آیا، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب۔ میں نے دودھ والا پیالہ چنا۔ جبرائیل نے میرے انتخاب کی تعریف کی اور پھر ہم پہلے آسمان کی طرف روانہ ہوئے۔ دروازے پر دربان نے پوچھا: ”کون ہے؟“۔ جبرائیل نے کہا: ”جبرائیل ہوں“۔ دربان نے پوچھا: ”تمہارے ہمراہ کون ہے؟“۔ کہا: ”محمد“۔ دربان نے پوچھا: ”کیا اُسے بلایا گیا ہے؟“۔ جبرائیل نے کہا: ”ہاں“۔ چنانچہ آسمان کا دروازہ کھول دیا گیا۔ حضرت آدم سامنے آئے اور خیر مقدم کیا۔۔۔ (اسی طرح ساتویں آسمان پر لایا گیا اور ہر آسمان پر انبیاء میں سے کسی ایک نے استقبال کیا)۔ ساتویں آسمان پر ابراہیم کو بیت المعمور میں، جہاں ہر روز ستر ہزار فرشتے اندر جاتے ہیں اور پھر کبھی باہر نہیں آتے تھے، تکیہ لگائے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے سدرۃ المنتہیٰ لے جایا گیا۔ اس کے پتے اتنے بڑے تھے جیسے ہاتھی کے کان اور اُس کا پھل۔۔۔۔ بعد میں مجھے وحی ہوئی کہ میں دن رات میں پچاس نمازیں پڑھوں۔ واپسی پر حضرت موسیٰ نے مجھے کہا کہ پچاس نمازیں بہت زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اِنھیں کم کرنے کے لیے کہو۔ چنانچہ میں اللہ کے پاس گیا اور تخفیف چاہی۔ اللہ نے

اِنھیں کم کر کے پینتالیس کر دیا۔ اس بار موسیٰ نے کہا: ”میں اِنھیں اپنی اُمّت پر آزما چکا ہوں، لوگ دن رات میں پینتالیس نمازیں نہیں پڑھ سکتے، میں دوبارہ اللہ کی طرف روانہ ہوا“۔ (خلاصہ یہ ہے کہ اللہ پانچ بار نمازیں پڑھے جانے پر رضامند ہو گئے)۔

معراج کے بارے میں تفسیر جلالین میں جو لکھا گیا ہے، یہ اُس کا خلاصہ تھا۔ اگر اسے ابو بکر عتیق نیشاپوری کی تحاریر یا تفسیر طبری کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو مبالغوں میں یہ اُن سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔

اسلامی روایات معراج کے واقعہ کو افسانہ طرازی کے جس انداز میں بیان کرتی ہیں وہ انداز امیر ارسلان[17] کی کہانیوں سے ملتا جلتا ہے۔ محمد حسین ہیکل[18] جیسا عقلیت پسند اور روشن خیالی کا دعوے دار، جو جسمانی معراج کا منکر ہے، وہ بھی ایمل دیر مینگیم[19] کی کتاب سے اسے افسانے کی مانند بیان کرتا ہے۔

لیکن قرآن جس میں حضرت محمد کی رسالت کے تیئیس سالوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے مطالب کو سمجھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ پیغمبر نے ایسا نہیں فرمایا تھا۔ اور یہ بچگانہ تخیلاتی افسانہ آمیزی اُن سادہ لوح عام لوگوں نے کی ہے جنھوں نے نظام خداوندی کو اپنے بادشاہوں اور امیروں کی نقل سمجھا تھا۔

17: امیر ارسلان ایک افسانوی کردار ہے، جو شہزادی فرخ پر عاشق ہو جاتا ہے اور اُس کے حصول کی خاطر بہت زیادہ مہمیں سر کرتا ہے۔ اس کہانی کو چودھویں صدی کے اواخر میں ناصر الدین شاہ کی ایک بیٹی نے تحریر کیا تھا۔

18: محمد حسین ہیکل ایک مصری مصنف، صحافی اور سیاستدان تھے۔ اس قانون ساز اسمبلی کے صدر تھے جس نے صدارتی نظام کے لیے آئین تشکیل دیا۔ مختلف شعبوں میں وزیر بھی رہے۔ یہاں اُن کی کتاب ”حیاۃ محمد“ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

19: فرانسیسی مستشرق، 1982 پیدائش، وفات 1971۔ بیس کے قریب کتابوں کا مؤلف جن میں سے La Vie de Mahomet, Mahomet et la tradition islamique, MahometVies des Saints Musulmans, La Vie de اور Le Culte des saints dans l'Islam maghrébin جیسی کتابیں اسلام اور اسلامی روایات کا احاطہ کرتی ہیں۔

جس سورت کی پہلی آیت اس قدر تخیل آفرینی کا باعث بنی ہے، اُسی کی آیت نمبر نوے سے ترانوے تک میں جب معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا گیا تو فرمایا گیا ہے:

"قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا"۔ (میں تو صرف ایک پیغام پہنچانے والا انسان ہوں)۔

سورت الشّوریٰ کی آیت نمبر اکاون میں فرمایا گیا ہے: "وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا"۔ (اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اُس سے بات کرے مگر بذریعہ وحی)۔

وحی کے موجود ہوتے ہوئے آسمانوں پر جانے کی ضرورت نہیں تھی، اور اگر ضرورت کا ہونا فرض کر بھی لیا جائے تو پروں والا چوپایہ کیوں؟۔ کیا آسمان کا راستہ مسجد اقصیٰ سے ہو کر گزرتا ہے؟۔ خداوند غنی کو اپنے بندوں کی نماز کی کیا ضرورت ہے؟۔ آسمانوں کے دربانوں کو پیغمبر کے سفر کی اطلاع کیوں نہیں تھی؟۔ سادہ لوح اذہان کے نزدیک علت اور معلول کے رشتہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

جب پیغمبر دُور کے سفر پر چلے تو اُنھیں ایک سواری کی ضرورت تھی۔ وہ سواری ایک خچر تھا۔ لیکن ضروری تھا کہ اُس کے پر ہوں تاکہ وہ ایک کبوتر کی مانند اُڑ سکے۔ اللہ چاہتا تھا کہ محمد کی آنکھوں کو اپنے جاہ و جلال سے خیرہ کرے۔ چنانچہ اُس نے جبرائیل کو حکم دیا کہ محمد کو آسمانوں کے عجائبات دکھائے جائیں۔

ایک جابر بادشاہ کی مانند، جو اپنی سلطنت کے خرچے پورے کرنے کے لیے اپنے افسران کو زیادہ مالیہ اکٹھا کرنے کا حکم دیتا ہے اور وزیر مالیات سفارش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ زیادہ ہے اس سے رعایا بدحال ہو جائے گی، خدا اپنے بندوں سے نماز ادا کروانا چاہتا ہے لیکن پیغمبر نمازوں کو کم کرنے کی سفارش کرتا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ محمد سیاسی تاریخ اور انسانی معاشرے میں تبدیلی لانے والے اہم ترین نابغوں کی فہرست میں سے ایک ہیں۔ اور اگر اُن وقتوں کے سیاسی اور سماجی حالات کو مدنظر رکھا

جائے۔ تو کوئی بھی تاریخ ساز یا واقعاتی تبدیلی برپا کرنے والی شخصیت محمد کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ نہ سکندر نہ سیزر، نہ نپولین اور ہٹلر، نہ کوروش بزرگ اور چنگیز، نہ آتیلا[20] اور امیر تیمور گورکان، ان میں سے کوئی بھی اُن کا ہم پلہ نہیں ہے۔ اُن سب کو اپنی فوج، جنگجوؤں اور اپنی قوم کی حمایت حاصل تھی۔ جب کہ محمد نے مخاصمت و عناد بھرے معاشرے میں رہتے، خالی ہاتھ ہوتے ہوئے تاریخ کے میدان میں قدم رکھا۔

شائد بیسیوں صدی کے طاقتور ترین آدمی لینن کو اُن کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ جس نے بیس سال (1904۔1924) تک مستقل مزاجی، حکمت، انتھک محنت و توانائی اور اپنے اصولوں اور مقصد سے استوار رہ کر سوچا، لکھا اور دُور سے انقلابی سرگرمیوں کو کنٹرول کیا اور تب تک جدوجہد جاری رکھی جب تک کمیونسٹ انقلاب برپا نہیں کر دیا، حالانکہ اُسے ملک کے اندر داخلی اور خارجی رکاوٹوں کے علاوہ روس میں طبعی اور سماجی طور پر نامساعد حالات کا سامنا تھا۔ لیکن اس بات کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ لینن کے پیچھے انقلابی لوگوں کی آدھی صدی کی جدوجہد تھی۔ لاکھوں انقلابی اور غیر مطمئن لوگ اُس کی حمایت کر رہے تھے۔ پھر یہاں بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ رسول اللہ کی زندگی محرومیوں اور زہد میں گزری تھی۔

یہ قدرتی اور معمول کی بات ہے کہ کسی بڑے انسان کے مرنے کے بعد اُس کے ذات سے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ عرصہ بعد اُس کی خامیاں بھلا دی جاتی ہیں اور صرف خوبیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ بہت سے فنکاروں اور دانشوروں کی زندگی اخلاقی طور پر ناپسندیدہ قرار پائی لیکن اُن کی موت

20: پانچویں صدی سے تعلق رکھنے والا ہُن سردار جس کا کہنا تھا کہ جس زمین پر سے اُس کے گھوڑے گزر جائیں وہاں کبھی گھاس نہیں اگتی۔ سلطنت روما کے دور انحطاط میں یورپ پر عفریت کی طرح مسلط رہا۔ مشرقی اور مغربی روم کی حکومتوں کو تاخت و تاراج اور جرمنی اطالیہ وغیرہ کے علاقوں کو تباہ و برباد کیا۔ اتیلا کی موت 453ء میں ہوئی

کے بعد اُن کی کاوشیں زندہ رہیں اور تعریف کی حقدار ٹھہریں۔ ہم نہیں جانتے کہ خواجہ نصیر الدین طوسی[21] نے ہلاکو خان سے وزارت پانے کے لیے کون سی تدابیر اختیار کیں، شائد وہ تدابیر اخلاقی معیار پر پوری نہ اترتی ہوں لیکن اُن کے علمی کارنامے ایران کے لیے باعث فخر ہیں۔

چنانچہ اگر کسی روحانی قائد کے مرنے کے بعد تخیلات کے زور پر اُس سے بہت زیادہ خوبیاں اور فضائل منسوب کر دیئے گئے ہوں تو یہ بات باعث تعجب نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ رویہ معقولیت کی حدوں کے اندر نہیں رہتا، اور عامیانہ اور بازاری پن کی وجہ سے تمسخر کا باعث بنتا ہے۔

حضرت محمد کی پیدائش دوسرے لاکھوں بچوں کی پیدائش کی طرح ایک عام سا واقعہ تھا اور اس کے نتیجے میں فوری طور پر کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن معجزہ سازی کے بخار میں مبتلا لوگوں نے یہاں بھی اپنے تخیل کے زور پر بہت زیادہ افسانہ طرازی کی۔ کہ حضور کی پیدائش کی وجہ سے مدائن کے ایوانوں میں شگاف پڑ گئے تھے اور فارس کا آتش کدہ بجھ گیا تھا۔

کیا یہ رسول اللہ کی پیدائش کا قدرتی اور لازمی نتیجہ تھا کہ ایسے ہوا؟، یا اللہ نے تنبیہ کرنے کے لیے ایسا غیر معمولی واقعہ برپا کیا تھا؟۔ علم، مشاہدہ اور ریاضی کو یہاں اس معلول کی علت نہیں مل رہی۔

21: نصیر الدین طوسی تیرہویں صدی میں طوس، خراسان میں پیدا ہوئے، عقیدے کے لحاظ سے شیعہ تھے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے فلسفی، طبیب، ماہر ریاضی، ماہر فلکیات اور مذہبی عالم تھے۔ حسن بن صباح کی قائم کردہ اسماعیلی ریاست میں ملازم ہوئے۔ ہلاکو خان کے حملے کے وقت قلعہ الموت میں موجود تھے، حملے کے وقت اسماعیلیوں سے غداری کر کے ہلاکو خان سے مل گئے۔ اسی وجہ سے ہلاکو خان کے ہاتھوں اسماعیلیوں کا بہت خوفناک قتل عام ہوا۔ مسلمان مؤرخین طوسی کو بغداد کے سقوط اور خلیفہ وقت کے قتل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ہلاکو خان کے وزیر بنے اور منگولوں کو مبارک و نحس ساعت بتانے کے لیے ایک رصد گاہ تعمیر کروائی۔ اسلامی امور اور فلکیات پر بہت زیادہ تصنیفات کیں جن میں سیر الملوک کا اردو ترجمہ "سیاست نامہ" کے نام سے دستیاب ہے۔ 1383ء میں انتقال ہوا۔

دنیا کے تمام واقعات خواہ وہ طبعی ہوں، سیاسی ہوں یا معاشرتی، معلول کی علت ضرور ہوتی ہے۔ کبھی یہ علت واضح ہوتی ہے، جیسے سورج چمکتا ہے، اُس سے روشنی اور گرمی حاصل ہوتی ہے جو اس کا ذاتی وصف ہے۔ آگ جلاتی ہے تا آنکہ کوئی اسے مؤثر طریقے سے نہ روکے۔ پانی ڈھلان کی طرف بہتا ہے تا آنکہ اُسے کسی پمپ وغیرہ کی مدد سے اوپر نہ بھیجا جائے۔ کبھی علت واضح نہیں ہوتی اور اُسے دریافت کرنے کے لیے محنت درکار ہوتی ہے۔ ماضی میں بادلوں کی گرج، بجلی، بیماریوں اور ان کے علاج جیسے کئی واقعات کا انسان کو علم نہ تھا لہٰذا اِنھیں بعد میں دریافت کیا گیا۔

مکّہ میں پیدا ہونے والے بچے اور ایران میں آتش کدہ بجھ جانے کے درمیان علت و معلول کا کسی بھی قسم کا کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ اگر کسریٰ کے محل کے کنگرے گر گئے تھے، تو اس کی وجہ دیوار کا بیٹھ جانا ہو سکتا ہے۔ لیکن معجزہ تراش مومنین اسے اللہ کی طرف سے تنبیہ قرار دیتے ہیں۔ یعنی خدا تیسفون (مدائن) کے باشندوں اور خصوصی طور پر ایران کے بادشاہ کو خبردار کرنا چاہ رہا تھا کہ ایک اہم واقعہ رونما ہو گیا ہے۔ یا ایران کے آتش کدہ کے موبدوں اور نگہبانوں کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ آج ایک ایسا انسان پیدا ہوا ہے جو اُن کی آتش پرستی کی رسم اور طور طریقوں کو ختم کر دے گا۔

لیکن ایرانی بادشاہ اور زرتشتی پیشواؤں کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ محل کے کنگرے گرنے اور آتش کدہ کی آگ کے بجھ جانے کو وہ ایک ایسے بچے کے پیدا ہونے کی علامت جانیں جس نے چالیس سال بعد اسلام کی دعوت دینا تھی؟۔

حکیم و دانا خدا کیوں اس بات کی خواہش کر رہا تھا کہ اہالیانِ ایران رسول اللہ کی بعثت سے چالیس سال قبل ہی باخبر ہو جائیں؟۔

قبل از اسلام کے عرب کے متعلق جو معلومات ملتی ہیں اُن کے مطابق جب تک رسول اللہ مبعوث نہیں ہوئے، وہ خود بھی اس سے متعلق باخبر نہیں تھے۔

خداوند قادر اگر پیغمبر کی پیدائش کو ایک بڑے واقعے یا غیر متوقع جلوے کی مانند پیش کرنا چاہ رہا تھا، تو خانہ کعبہ جہاں سے اسلام کا ظہور ہوا، اُسے کیوں نہیں گرایا جس سے بے جان بت اس کے نیچے دب جاتے۔ فارس کے آتش کدہ کے بجھ جانے کی بجائے یہ قریش کے لیے زیادہ مؤثر تنبیہ ہوتی؟ بعثت کے وقت معجزہ رونما کیوں نہ ہوا جس سے تمام قریش ایمان لے آتے اور اللہ کے حبیب کو اُن کے عناد و آزار کا سامنا نہ کرنا پڑتا؟۔ خسرو پرویز کا دل ایمانی روشنی سے روشن کیوں نہ ہوا تاکہ وہ حضور کا خط نہ پھاڑتا، خود بھی ایمان لے آتا اور اُس کے ماتحت بھی ایمان لے آتے۔ یوں ایران نور اسلام سے منور ہو جاتا اور قادسیہ اور نہاوند کی جنگوں کے بغیر ہی ایران اسلامی پرچم تلے آجاتا؟۔

کئی سال پہلے میں نے عظیم فرانسیسی مصنف ایرنست ریناں[22] کی "Vie de Jesus" (حیات عیسیٰ) نامی کتاب پڑھی ہے۔ جس میں ایک نقاش جیسی مہارت سے حضرت عیسیٰ کی بہت ہی حقیقت پسندانہ اور خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ بعد زیرک جرمن مصنف ایمل لوُدویگ[23] کی "انسان کا بیٹا" نامی کتاب میرے ہاتھ لگی۔ جس کے مصنف کا کہنا ہے کہ قابل اعتماد دستاویزات کے فقدان کے باوجود عیسیٰ کی شخصیت کو اُنہوں نے حتیٰ الوسع انصاف سے پیش کیا ہے۔

میں حضرت محمد کی تریسٹھ سالہ زندگی میں اُن کے تئیس سالوں کی مکمل تصویر کشی کرنے کا دعوے دار نہیں ہوں۔ اور کسی بھی قسم کی مصنوعی انکساری کے بغیر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنے اندر ریناں

22: ایرنست ریناں (Ernest Renan)۔ 1823 تا 1892۔ فرانسیسی فلسفی، مذہبی نقاد، سامی تہذیب سے شناسا اور سامی زبانوں کا ماہر، مذاہب کی تاریخ سے واقف مورخ تھا۔ ایرنست کا اہم کام ابتدائی مسیحیت کی تاریخ اور اُس کے ماخذوں کو پیش کرنا ہے۔ ایرنست کے بقول اسلام عدم برداشت کا مذہب ہے۔ سائنس کو نظر انداز کرتا ہے۔ انسانی دماغ کے سکڑنے کا باعث بنتا ہے۔ بغیر کسی تحقیق کے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے نتیجے پر جا پہنچتا ہے۔

23: ایمل لوُدویگ (Emil Ludwig) 1881ء تا 1948ء۔ جرمن نژاد صحافی۔ سوانح حیات لکھنا ان کا خاص میدان تھا۔ 26 کتابوں کا خالق۔

جیسی استعداد اور فکری لطافت نہیں پاتا۔ اور نہ ہی مجھ میں ایمل لُودویگ جیسا صبر اور تحقیق کرنے کی سکت ہے کہ میں ایک ایسی طاقتور شخصیت اور روحانی قوت کے مالک انسان کی تصویر کشی کر سکوں۔ جس نے عصری تاریخ کے لینن کی مانند تاریخ پر اپنے گہرے نقوش ثبت کیے۔ لیکن لینن اور محمد میں ایک واضح فرق ہے کہ لینن کے پیچھے ایک مضبوط اور مؤثر سیاسی جماعت تھی جب کہ محمد خالی ہاتھ تھے۔ اور چند دوستوں کے ساتھ اُنھوں نے جب تاریخ میں قدم رکھا تو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے اُن کا واحد وسیلہ قرآن تھا۔

نہ مجھ میں اس قدر صبر ہے کہ تحقیق کر سکوں اور نہ ہی مجھ میں اس قدر ہمت ہے کہ خرافات و اوہام کی کوہ پیکر لہروں اور لایعنی ضد کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ ان چند مختصر لکیروں کو کھینچنے سے میرا ارادہ صرف یہ ہے کہ میں اُس بھوت کو بھگا پاؤں جو قرآن کو پڑھنے اور اسلام کے ظہور کے مختصر جائزے کی وجہ سے میرے ذہن میں پیدا ہوا ہے۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ میرے مشاہدے یا ایک نفسیاتی نظریے نے مجھے ان یادداشتوں کو لکھنے کی طرف مائل کیا ہے۔ کہ عقیدے کے اثر کے تحت انسان عقل و خرد کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بچپن میں کسی شخص کو جب عقائد کی تلقین کی جائے تو وہ اُس کے ذہن کے پس منظر میں جم جاتے ہیں، یوں وہ اپنے تلقینی اعتقادات کو حقائق پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے خواہ اُس کے پاس اس کی کوئی بھی عقلی دلیل موجود نہ ہو۔ حتیٰ کہ دانشور، سوائے چند ایک کے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، بھی اس صورت حال سے دوچار ہیں اور اپنی قوت ادراک و فہم کو استعمال نہیں کر پاتے۔ اور اگر وہ اپنی اس قوت کا استعمال کرتے بھی ہیں تو اسے اپنے تلقینی عقائد کے دفاع کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انسان، جس کی وجہ امتیاز اس کی قوت ادراک ہے جس سے وہ طبعی اور ریاضی کے مسائل تک حل کرتا ہے، اپنے عقائد، خواہ سیاسی ہوں، خواہ دینی ہوں، کی صورت میں وہ عقل حتیٰ کہ مشاہدات کو بھی رد کر دیتا ہے۔

لڑکپن

محمد کے لڑکپن کے متعلق معلومات کا شدید فقدان ہے۔ ماں باپ سے محروم یہ لڑکا اپنے اُس چچا کے ہاں زندگی گزارتا ہے۔ جو شفیق ہونے کے باوجود انتہائی مفلس تھا۔ اس لیے گھر پڑے رہنے کی بجائے وہ چچا کی مدد کرتا تھا۔ وہ ہر روز ابو طالب اور دوسرے لوگوں کے اونٹوں کو چرانے صحرا لے جاتا تھا اور شام تک مکہ سے باہر خشک وویران صحرا میں رہتا تھا۔

ایک ذہین اور حساس لڑکا جس نے کئی سالوں تک، ہر روز صبح سے شام تک کا وقت یوں ہی گزارا ہو گا۔ سالوں پر محیط دُکھوں اور زندگی کی تلخیوں سے تنگ وہ لڑکا یقیناً یہ سوچتا ہو گا کہ باپ کے بغیر ایک یتیم کے طور پر وہ اس دنیا میں کیوں آیا؟۔ اُس کی جوان سال ماں جو اُس کے پاس محبت اور توجہ کا واحد وسیلہ تھی، کیوں اسے اتنی جلدی چھوڑ کر چلی گئی؟۔ ماں کی موت کے بعد بد نصیبی کیوں اُس کے معزز اور توانا دادا کو ساتھ لے گئی؟ اور بے کسی کی حالت میں وہ اپنے چچا کے گھر پناہ لینے پر کیوں مجبور ہوا؟۔ اُس کا چچا ایک اچھا اور نیک کردار انسان تھا، لیکن کثیر العیالی کی وجہ سے ویسی نگہداشت اور آسانیاں فراہم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا جو محمد کے دوسرے چچاؤں کے بیٹوں کو حاصل تھی۔ دوسرے چچا عباس اور ابو لہب خوشحال تھے، لیکن اُنھوں نے کبھی اُس پر توجہ نہ دی۔ سالوں پر محیط اُن تمام مصائب اور ناہمواریوں نے اُس حساس لڑکے کی روح کو ضرور زخمی کیا ہو گا۔

ایک بنجر صحرا کا سکوت اور تنہائی، جہاں گھاس کی امید میں اونٹ پتھروں میں اپنی تھوتھنی گھسیٹرتے تھے ، لیکن اُن کے ہاتھ کانٹے اور پیاس آتی تھی۔ ان محرومیت بھری اور تکلیف دہ گھڑیوں میں دُکھ کے علاوہ انسانی ذہن میں کون سی سوچ پیدا ہو سکتی تھی؟۔

بد نصیبی انسانی مزاج میں کڑوا پن پیدا کرتی ہے اور رنج و حرمان اُس کے اعصاب کو اور حساس تر بنا دیتے ہیں، خاص طور پر جب وہ انسان اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور وہاں سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں دیکھ پاتا۔ حالات کی ناسازگاری کا احساس لازمی طور پر اپنا رخ متعین کرتا ہے۔ بآسانی یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اُس لڑکے کا دھیان سماجی نظام کی طرف جائے گا جہاں وہ اپنی محرومیوں کے اسباب کو تلاش کرے گا۔

اُس کے ہم رتبہ اور ہم عمر لڑکے آسائش و مسرت کی زندگی گزار رہے تھے کیونکہ اُن کے باپ خانہ کعبہ کے منتظم تھے۔ وہ حج کے دنوں میں حاجیوں کو کھانا اور پانی فروخت کرتے تھے اور اُن کی دوسری ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ شام [24] سے لایا ہوا مال اُنھیں اچھی قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ اور اُن کی چیزوں کو سستے داموں خریدا کرتے تھے جس سے اُنھیں منافع حاصل ہوتا تھا۔ کعبہ کے متولی ہونے کے ناطے بدوؤں سے تجارت میں اُنھیں جو فائدہ ہوتا تھا، قدرتی طور پر اُن کے بیٹے بھی اس خوش حالی سے مستفید ہوتے تھے۔

بے شمار قبائل کعبہ کا طواف کرنے کیوں آتے تھے اور قریش کی ثروت و سیادت کا باعث بنتے تھے؟۔ کعبہ مشہور بتوں کا مسکن تھا جس میں ایک سیاہ رنگ کا پتھر نصب تھا جو تمام عربوں کے نزدیک بہت مقدس تھا اور اس کے گرد طواف کو وہ اپنے لیے خوش بختی اور نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے، جس کی خاطر وہ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان دوڑتے تھے۔ دونوں پہاڑیوں کی چوٹیوں پر دو بت (اساف اور نائلہ) نصب تھے جن کی عبادت سے حاجتیں پوری ہوتی تھیں، جن کا طواف کرتے اور صفا اور مروہ کی

24: قدیم ملک شام دمشق کے علاوہ سرزمین لبنان پر مشتمل تھا۔ اسے رومیوں نے 64 قبل مسیح میں فتح کیا، اس کا پایہ تخت انطاکیہ ہوا کرتا تھا۔ مسلمانوں نے اسے 632ء میں فتح کیا۔ اب شام کو سوریہ کہا جاتا ہے۔

پہاڑیوں کے درمیان دوڑتے وقت وہ اپنے بتوں کو بلند آواز سے پکارتے تھے اور اپنی حاجات کا ذکر کرتے تھے۔

ایک ذہین، حساس اعصاب اور واضح خیالات کے مالک محمدؐ نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں خود سے پوچھا ہو گا: "کیا اس سیاہ پتھر کے اندر کوئی طاقت پوشیدہ ہے، کیا یہ بے جان اور بے حس بُت کسی مفید واقعے کے برپا ہونے کا باعث ہو سکتے ہیں؟"۔ سیاہ پتھر اور دیگر مختلف بُتوں کے متعلق اُن کا یہ شک اور بد گمانی اُن کے ذاتی تجربے اور آزمائش کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟۔

یہ بعید نہیں ہے کہ اُنھوں نے اپنی دکھی روح اور ٹوٹے دل کے مداوے کے لیے شوق اور امید سے بتوں سے کچھ مانگا ہو اور اُس کا مثبت نتیجہ نہ نکلا ہو۔ کیا اس آیت "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ "(اور ناپاکی سے دور رہو: المدّثّر۔ 5) جو اُن کے دہن مبارک سے تیس سال بعد ادا ہوئی، سے اس مفروضے کو تقویت نہیں ملتی ؟۔ اور کیا یہ آیت شریف "وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى " (اور راستے سے گمراہ پایا تو راستہ دکھایا: الضّحی۔ 7) بھی اسی مفروضے کو سچ ثابت نہیں کرتی ہے۔ کیا قریش کے سردار اس واضح اور روشن حقیقت سے لاعلم تھے؟۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اتنے عرصے سے کعبہ کے نزدیک رہتے ہوئے ان بتوں میں کسی قسم کی حیات، حرکت، فیض اور رحمت نہ پانے کی حقیقت سے لاعلم ہوں؟۔ کیا اُن کی لات و منات وعزیٰ کے متعلق خاموشی اور احترام مصلحت پر مبنی نہیں تھا؟۔ جیسے امام زادے کا احترام متولی ہونے میں پوشیدہ ہے، اگر تولیت اُس کے ہاتھ سے جاتی رہے تو اُس کی آمدن ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح قریش کی شام سے پھلتی پھولتی تجارت بھی ختم ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ایسی صورت میں کوئی بھی مکّہ نہ آتا، جو اُن سے مہنگے داموں اشیا خریدتا اور اپنی چیزیں اُنھیں سستے داموں بیچتا۔

اُن دنوں صحرا کی بے پایاں خاموشی، وحشت ناک تنہائی اور تپتی دھوپ میں جب اونٹ زندگی بحال رکھنے کی کوشش میں مصروف ہوتے تھے، محمدؐ کی حساس روح اور خوابوں میں ایک ہلچل سی مچی ہوتی ہو

گی۔ وہ ہلچل جو شام کو ختم ہو کر اُنھیں حقیقی دنیا میں واپس لے آتی ہو گی۔ کیونکہ اُنھیں غروب آفتاب کے وقت اونٹوں کو اکٹھا کرنا ہوتا تھا، اُنھیں بلانا ہوتا تھا، تاکہ اُنھیں بستی کی طرف واپس لایا جائے۔ شام کے وقت منتشر اونٹوں کو اکٹھا کرکے صحیح وسالم حالت میں اُنھیں مالکان کے حوالے کرنا ہوتا تھا۔ پھر ہلچل خاموش ہو جاتی ہو گی تاکہ رات کے وقت وہ خواب کی صورت دھار لے۔ ہلچل خاموش ہو جاتی ہو گی تاکہ یکسانیت کے مارے اُسی صحرا میں کل پھر سے ظاہر ہو سکے۔ اور وہ چیز ضمیر کی گہرائیوں میں، آہستہ آہستہ ظہور پارہی تھی۔

یہ داخلیت پسند طبیعت، سرگرم سوچیں اور زندگی کے موجب وہ خواب، جنھوں نے اُنھیں بیرونی دنیا کے ہنگاموں سے دور رکھا اور ظالم تقدیر جس نے اُنھیں زندگی کی آسانیوں سے محروم رکھا تھا، ویران صحرا کے تنہائی میں وہ اُن میں اور بھی ڈوب جاتے ہوں گے۔ تاآنکہ ایک ہیولا ظاہر ہوتا ہے اور اُنھیں اپنے وجود کی گہرائی میں ایک ان دیکھے اور مفقود سمندر کی موجوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

چند سال ایسے ہی گزر جاتے ہیں اور پھر ایک واقعہ رونما ہوتا ہے جو اُن کی زندگی میں ایک نیاولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

گیارہ سال کی عمر میں وہ ابو طالب کے ساتھ شام جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اُن کے اندر کے شور میں ہلچل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایک نئی اور روشن دنیا تھی جس میں ساکنان مکّہ جیسی جہالت، خرافات، سختی اور غصیلے پن کا نشان تک نہ تھا۔

وہاں کے لوگ مہذب تھے، ماحول درخشاں تھا اور اُن کی عادات و آداب برتر اور معقول تھے جنھوں نے یقیناً آپ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہو گا۔ وہاں اُنھوں نے بدوی زندگی اور اپنے لوگوں کے اوہام و خرافات کو زیادہ محسوس کیا ہو گا۔ اور شائد خواہش کی ہو گی کہ اُن کی اپنے لوگ توہم پرستی اور پلیدی کو چھوڑ دیں اور انسانی اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے ایک منظم اور پاکیزہ معاشرے کا حصہ بنیں۔

اس بات کی کوئی خبر نہیں ملتی کہ وہ اپنے پہلے سفر کے دوران توحیدی مذاہب کے لوگوں سے ملے تھے یا نہیں ملے تھے۔ شائد اس امر کے لیے اُن کی عمر چھوٹی تھی، لیکن اُن کی حساس اور دکھی شخصیت اس سفر سے ضرور متاثر ہوئی ہو گی۔ اور اسی اثر نے اُن میں دوسرے سفر کی خواہش پیدا کی ہو گی۔ اس بات کا اکثر کتابوں میں ذکر ملتا ہے کہ آپ کی پیاسی اور متجسس روح آپ کو اہل ادیان تک لے گئی تھی۔

جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ محمد کے بچپن کے متعلق اطلاعات کا فقدان ہے۔ اور ایسا ہونے کی ایک فطری اور معقول وجہ موجود ہے۔ چچا کے ہاں پلنے والے ایک یتیم بچے سے بھلا کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟۔ کسی نے بھی اُن کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ ہی اُن کی زندگی کے متعلق یاد رکھنا مناسب سمجھا۔ اور ہم نے جو بھی اُن کے متعلق لکھا ہے وہ اندازوں اور قیاس کی بنیاد پر لکھا ہے۔ روز روز کی یکسانیت کا شکار وہ تنہا لڑکا جو اونٹ لے کر صحرا کو جاتا تھا اور تخیلات و تصورات میں کھویا رہتا تھا۔

شائد یہ آیت جو تیس سال بعد اُس متلاطم روح کے منہ سے نکلی، تخلیق اور عجائبات کے متعلق اُنھی پرانی یادوں اور تاثرات کا ایک نمونہ ہے۔

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ۔ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ۔ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ۔ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ۔

(یہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے تخلیق کیے گئے ہیں۔ اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیا گیا ہے ۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے کھڑے کیے گئے ہیں۔ اور زمین کی طرف کہ کیسے بچھائی گئی ہے: الغَاشِیَۃ۔ 17تا20)

مکّی سورتوں کا مطالعہ ایک ایسے انسان کے خوابوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو زندگی کی نعمتوں سے محروم تھا۔ جو اپنے ساتھ یا فطرت کے ساتھ سرگوشیاں کرتا تھا اور کبھی ابو لہب اور ابو الاشد جیسے قریش کے مغرور اور متکبر لوگوں پر غصے کا اظہار کرتا تھا۔

محمد بعد میں دعوت اسلام کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تبلیغ کی قبولیت کے وجہ سے اُن کے وقار میں اضافہ ہوا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاں تخیلات اور واقعات کا وہ خزانہ وجود میں آ گیا جس کا ذکر اس سے پہلے باب میں طبری اور واقدی کے حوالے سے ہو چکا ہے۔

اسی سلسلے میں یہاں پر چند ایک مختصر نمونے دینا ضروری ہیں۔

حجاز اور خصوصی طور پر مکہ کی بعثت سے قبل حالت کو مسلمان جس قدر تاریک اور جاہلیت میں ڈوبا ہوا پیش کرتے ہیں حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ مسلمانوں کے مطابق اُن وقتوں کے عربستان میں فکر سلیم کے مالک کسی انسان یا خدا کے حوالے سے کسی روشنی کا وجود نہ تھا۔ اُن کے ہاں احمقانہ اور جاہلانہ قسم کی بُت پرستی کے علاوہ کچھ نہیں پایا جاتا تھا۔ شائد اس قدر مبالغہ آمیزی کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ثابت کیا جا سکے کہ اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں اُن میں کس قدر بہتری آئی۔ لیکن علی جواد، عبد اللہ سمان، ڈاکٹر طٰہ حسین[25]، حسین ہیکل، محمد عزت دروزہ[26]، پروفیسر حداد[27] جیسے عرب مصنفین اور محققین کے نزدیک چھٹی صدی کا حجاز تمدن سے بہرہ مند تھا اور خدا کے متعلق اُن کے تصورات اس قدر مجہول نہیں تھے جیسے تصور کیے جاتے ہیں۔

ان محققین کی تحاریر اور دوسری روایات و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ حجاز میں چھٹی صدی کے دوسرے نصف میں بُت پرستی کے خلاف آوازیں اُٹھنا شروع ہو چکی تھیں۔

25: ڈاکٹر طٰہ حسین ایک مشہور عربی مصنف تھے، تیس سال کی عمر میں بینائی کھو بیٹھے۔ اُنھوں نے کئی زبانوں میں لکھا ہے۔ مصر، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں عربی ادب کے پروفیسر رہے ہیں۔

26: محمد عزت دروزہ ایک فلسطینی سیاستدان، تاریخ دان اور ماہر تعلیم تھے۔ 1888ء سے 1984ء کے دوران زندہ رہے، شروع میں خلافت عثمانیہ کی طرف سے لبنان اور فلسطین میں بیوروکریٹ رہے۔ عرب قوم پرستی کی لہر کی وجہ سے 1916 میں عثانی قبضے کے خلاف تحریک کا حصہ بنے۔ ایک سیاسی جماعت بھی بنائی، فلسطینیوں کے لیے علیحدہ ملک کے حامی تھے۔ تیس سے زیادہ کتابوں کے مؤلف ہیں

27: پروفیسر حداد مسیحی دانشور تھے۔ اُنھوں نے "القرآن والکتاب" نام سے کتاب لکھی۔

کسی حد تک یہ رد عمل یہودی قبائل کی وجہ سے تھا جن کی اکثریت یثرب میں مقیم تھی اور مسیحی جو شام سے آئے تھے۔ اس سوچ کی وجہ کسی حد تک وہ اشخاص بھی تھے جو حنفاء[28] کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ابن ہشام کی لکھی سیرت النبی میں درج ہے کہ اسلام کی دعوت سے پہلے "ایک روز طائف کے ایک نخلستان میں قریش جمع تھے کہ بنو ثقیف کے بڑے خدا عزیٰ[29] کا تیوہار منائیں۔ اُن میں سے چار لوگ علیحدہ ہو گئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں اور اپنے باپ ابراہیم کے دین کو بھول چکے ہیں۔ تب اُنھوں نے لوگوں سے کہا: "کوئی اور دین اختیار کرو، پتھر کا طواف کیوں کرتے ہو جو نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے، نہ تمھیں کوئی فائدہ دے سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا

28: حنفاء حنیف کی جمع ہے۔ بعثت رسول سے پہلے کے وہ عرب جو بت پرستی سے بیزار تھے، اُنھیں حنیفیہ، حنفاء اور احناف کہا جاتا تھا۔ حنیفوں کے عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ اور اپنے آپ کو ابراہیم کا پیروکار سمجھتے تھے۔

29: سیرت ابن ہشام کی جو جلد میرے پاس ہے، اُس میں طائف اور عزیٰ کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس واقعے کے متعلق یوں لکھا ہوا ہے کہ قریش اپنی ایک عید کے روز بتوں میں سے ایک کے پاس کھڑے تھے۔۔۔۔۔۔" باقی واقعہ سیرت ابن ہشام میں ویسے ہی درج ہے جیسے یہاں بیان ہوا ہے۔ ایک بات جس کا تذکرہ شائد ضروری ہے کہ عزیٰ بنو ثقیف کا نہیں بلکہ قریش مکہ کا مقبول خدا تھا، جب کہ منات مدینہ کا اور لات بنو ثقیف یعنی طائف والوں کا سب سے بڑا اور مقبول خدا تھا۔ فتح مکہ کے بعد حضور نے ابو سفیان اور خالد بن ولید کو طائف بھیج کر لات کے بُت کو تباہ کرا دیا۔

ہے"۔ یہ چاروں ورقہ بن نوفل[30]، عبید اللہ بن جحش[31]، عثمان بن حویرث[32] اور زید بن عمرو تھے۔ اُس روز سے اُنھوں نے اپنے آپ کو حنیف کہلوانا شروع کیا اور دین ابراہیمی اختیار کیا۔ ان میں سے آخری کے نماز ادا کرنے یا دعا کرنے کے متعلق روایت ہے کہ ایک نے یہ الفاظ ادا کیے:

لبّیک حقاً حقاً، تعبّداً و رقاعذت بما عاذبه ابراھیم انی لک راغم مهما جشمنی فانی جاشم

(میں حق پر حاضر ہوں، عبادت اور عاجزی میں، میں وہی پناہ لیتا ہوں جہاں ابراہیم نے پناہ لی، میں تُم سے علیحدہ تھا اور جو بھی مجھ پر آفت آئے میں اس کے لیے تیار ہوں) یہ کہہ کر اُس نے سجدہ کیا۔

اگرچہ جزیرہ عرب کی اکثریت جہالت و خرافات کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہاں کی اکثریت بتوں کو پوجتی تھی۔ لیکن وہیں کچھ گوشوں میں خدائے واحد کی عبادت بھی ہوا کرتی تھی۔

حجاز اور خصوصی طور پر یثرب میں یہودیوں اور مسیحیوں کی رہائش کی وجہ سے خدائے واحد کی پرستش حجاز میں مقیم لوگوں کے لیے کوئی عجوبہ نہیں تھی۔

حضرت محمد سے پہلے عرب کے مختلف علاقوں میں نبی مبعوث ہوئے اور اُنھوں نے لوگوں کو دین کی دعوت دی اور بُت پرستی سے منع کیا۔ اُن میں سے چند ایک کا ذکر قرآن میں آچکا ہے جیسے مدائن میں

30: ورقہ بن نوفل، حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی اور عبرانی زبان کے عالم تھے۔ پہلے حنیف اور بعد میں نصرانی ہوگئے۔ بائبل کا عربی میں ترجمہ کیا۔ حضرت محمد کے نبی ہونے کی پیشین گوئی کی، لیکن خود مسلمان نہیں ہوئے

31: عبید اللہ بن جحش، حضرت محمد کے پھوپھی زاد بھائی تھے، حبشہ ہجرت کی۔ مسلمانوں کی اُس ٹولی کی قیادت کی جس نے مقدس مہینے میں ایک قریشی قافلے کو لوٹا جس کے نتیجے میں عمرو بن الحضرمی نامی ایک قریشی مارا گیا۔ کامیاب واپس لوٹے اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ حضور کو پیش کرنے کے بعد بقیہ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ جنگ احد میں مارے گئے۔ مشرکین نے ان کی لاش کا مثلہ کیا، اور ناک اور کان کاٹ کر دھاگے میں پروئے۔

32: عثمان بن حویرث چار اہم حنیفوں میں سے ایک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضور کی پیدائش سے پہلے ہی عثمان رومی سلطنت منتقل ہوگئے تھے۔ جہاں مسیحیت قبول کرلی اور مرتے دم تک مسیحی رہے۔

قوم عاد کے ہاں صالح اور قوم ثمود کے ہاں شعیب آئے۔ عربی ذرائع حنظلہ بن صفوان، خالد بن سنان، عامر بن ظرب عدوانی اور عبد اللہ قضاعی جیسے مبلغین کا نام بھی لیتے ہیں۔ قس بن ساعدہ ایادی جو ایک شعلہ بیان مقرر اور فصیح شاعر تھے، کعبہ میں اور عکاظ کے سالانہ میلے پر خطابت کے جوہر دکھانے کے علاوہ اپنے اشعار میں بت پرستی سے منع کرتے تھے۔ طائف کے رہنے والے امیہ بن ابوصلت جن کا تعلق بنو ثقیف سے تھا اور محمد کے ہم عصر تھے، ان کا شمار حنفاء کے مشاہیر میں ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کو خدا شناسی اور خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دیا کرتے تھے۔ وہ کئی بار شام گئے اور وہاں کے یہودی و مسیحی علماء سے بات چیت میں بہت وقت گزارتے تھے۔ اُنھی دنوں جب اُنھوں نے مکّہ میں محمد کے ظہور کی خبر سنی، تو روایات کے مطابق وہ آ کر آپ سے ملے، لیکن اسلام قبول نہیں کیا اور طائف واپس چلے گئے اور اپنے دوستوں سے کہا "اہل کتاب اور اُن کی کہانیوں سے میری واقفیت محمد سے زیادہ ہے، اس کے علاوہ مجھے آرامی اور عبرانی زبان بھی آتی ہے چنانچہ نبوت پر میرا حق اُن سے زیادہ ہے"۔ حدیث بخاری میں رسول اللہ کے حوالے سے کہا گیا ہے "کاد امیہ بن ابو الصلت ان یسلم" (امیہ بن ابوصلت ایمان لانے کے قریب آ چکا تھا)۔

شاعری، خصوصی طور پر کسی قوم کے عروج کے وقت کی شاعری اُس قوم کے جذبات اور رسوم کی نمائندہ ہوتی ہے۔ دور جاہلیت میں لکھی گئی کچھ شاعری پر گمان ہوتا ہے گویا اُنھیں کسی مسلمان نے لکھا ہے جیسے زہیر کے یہ دو اشعار[33]۔

33: اسلام کے عروج کے نتیجے میں زہیر کے بھائی کعب نے اسلام قبول کر لیا۔ زہیر جو کعب کا چھوٹا بھائی اور ایک معروف شاعر تھا، اُس نے حضور کی ہجو لکھی، حضور نے اُس کے قتل کا حکم صادر کیا۔ قتل کے ڈر سے زہیر مسلمان ہو گیا اور حضور کا قصیدہ لکھا، جسے سُن کر حضور اس قدر خوش ہوئے کہ اپنی چادر زہیر کو عطا کی۔

فلاتکتمو اللہ ما فی نفوسکم ۔ لیخفی و مہما یکتم اللہ یعلم

یؤخر فیوضع فی کتاب فیدخر ۔ لیوم الحساب او یعجلی فینفقم

(جو تمہارے دل میں ہے اسے اللہ سے مت چھپاؤ۔ تم اسے چھپانے کی جتنی بھی کوشش کرو گے، اللہ اسے جان لے گا۔ اس میں تاخیر ہو سکتی ہے لیکن یوم محشر کے لیے یہ کتاب میں درج ہو جائے گا۔ جلدی کرو وگرنہ یہ بہت مہنگا پڑے گا)۔

عبداللہ بن ابرص یوں کہتے ہیں۔[34]

من یسئل الناس ۔ یحرموہ ٫ سائل اللہ یخیب

باللہ بدرک کل خیر ۔ و القول فی یعضہ تغلیب

و اللہ لیس لہ شریک ۔ علام ما اخفت القلوب

(یہ وہی ہے جو چاہتا ہے کہ لوگ اُس کی عبادت کریں، وہ جو اللہ کی طرف جاتے ہیں وہ مایوس نہیں ہوں گے۔ اللہ ان کی تمام آرزوئیں پوری کرے گا۔ بہت کم لوگ گھاٹے میں رہیں گے۔ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسے پتہ ہے کہ تم اپنے دل میں کیا چھپائے ہوئے ہو)۔

اور خود حضرت محمد مشہور عرب شاعر لبید بن ربیعہ بن کلاب کا یہ شعر دوہرایا کرتے تھے[35]۔

الا کل شی ما سو اللہ باطل ۔ و کل نعیم لا محالہ زائل

(اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور اُس کے سامنے سب نعمتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی)۔

34: عبداللہ بن ابرص کا نام کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے۔ اس نام سے میں واقف نہیں ہوں۔ ممکن ہے، یہاں عبداللہ بن محمد انصاری نامی معرف شاعر کا ذکر کیا گیا ہو، جو الاحوص کے نام سے جانا جاتا تھا۔

35: لبید بن کلاب ایک مشہور شاعر تھا جو اپنی شاعری کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ اسلام سے قبل کئی شعرا اللہ کی شان میں شاعری کر چکے تھے اور کافی مشرکین بچوں کا نام عبد اللہ رکھتے تھے۔ جن میں محمد کے والد بھی شامل ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے نام سے نا آشنا نہ تھے۔ قرآن میں بھی درج ہے کہ بُت اللہ کے پاس پہنچنے کا ایک ذریعہ تھے[36]۔
زمانہ جاہلیت کے شاعروں میں سے عمرو بن فضل[37] عربوں کے مشہور بُتوں کو واضح انداز میں یوں رد کرتا ہے۔

ترکت الات و العزی جمیعاً۔ کذالک یفع الجلد الصبور

فلا العزی ازور ولا ابنتیھا۔ ولا صنمی بنی غنم ازور

ولا ھبلاً ازور وکان ربا۔ لنا فی الدھر اذحلمی صغیر

(میں نے لات و عزیٰ کو چھوڑ دیا ہے کوئی بھی صاحب عقل ایسا ہی کرے گا، میں عزیٰ کی پوجا کرتا ہوں اور نہ اُس کی دونوں بیٹیوں کی اور نہ ہی بنو غنم کے دو بتوں کی زیارت کروں گا۔ میں ہبل کے پاس بھی نہیں جاؤں گا جو ہمارا رب تھا۔ زندگی میں میرے پاس زیادہ صبر نہیں ہے)۔
چنانچہ بُت پرستی ترک کر کے خدائے واحد کو قبول کرنے کی بات کچھ ایسی نہیں تھی جس کی پہلے مثال نہ ملتی ہو۔ اس سلسلہ میں جو نیا تھا وہ اُن کی ثابت قدمی اور پُر زور اصرار تھا۔ یہاں پر محمد کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے سفر سے رکے نہیں۔ اُنھوں نے تمام ذلتوں اور دشمنیوں کا مقابلہ کیا اور تب تک پیچھے نہیں ہٹے جب تک جزیرہ عرب میں اسلام نہیں پھیلا اور مختلف عرب قبائل اسلام کے جھنڈے تلے نہیں آ گئے۔

36: مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى : ہم تو اُنھیں صرف اتنی بات کے لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں (الزُّمَر۔ 3)۔

37: غالباً یہاں کتابت کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ سیرت ابن ہشام میں عمرو بن فضل کی بجائے زید بن عمرو نفیل لکھا گیا ہے۔ زید بن عمرو بن نفیل شاعر ہونے کے علاوہ اُن چار حنیفوں میں سے ایک تھا، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ زید بن عمرو کا تعلق قریش کی شاخ بنو عدی سے تھا۔

عرب مابعد الطبیعات سے نابلد تھے۔ اپنی بدوی طبیعت کے باعث اُن کا دائرہ کار صرف محسوسات یعنی دیکھی اور سنی جانے والی چیزوں تک محدود تھا۔ فوری فائدے کے علاوہ اُن کا کوئی ہدف نہیں ہوتا تھا۔ ان کے ہاں دوسروں کے مال پر دست درازی میں کوئی برائی نہیں تھی۔ اور اُن کا مقصد دوسروں پر تسلط حاصل کرنا اور اُنھیں زیر کرنا تھا۔ جیسے کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ ابوجہل نے اخنس بن شریق سے کہا۔

"بنو عبد المناف پیغمبری کا کھیل اس لیے کھیل رہے ہیں تاکہ سیادت میں بازی لے جائیں"۔ 61 ہجری میں اسی بات کو یزید بن معاویہ نے یوں دوہرایا" کاش کہ بدر میں شکست کھانے والے یہ دیکھ پاتے کہ ہم نے کیسے بنو ہاشم کو زیر اور حسین کو قتل کیا ہے"[38]۔ اور آخر میں اس نے واضح طور پر کہا۔

لعبت هاشم بالملک فلا

خبر جاء ولا وحی نزل

بنی ہاشم نے اقتدار کے حصول کے لیے صرف ڈھونگ رچایا تھا، نہ کوئی (آسمان سے) خبر آئی اور نہ ہی کوئی وحی نازل ہوئی۔

اس باب کے آخر میں اس بات کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ دور جاہلیت کے ادب کے متعلق تمام عرب محققین متفق نہیں ہیں۔ اور بعض کو اس کے قبل از اسلام ہونے کے متعلق شکوک وشبہات ہیں۔ لیکن یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ حجاز کے اندر چھٹی صدی عیسوی میں بُت پرستی سے نفرت اور اللہ کی پرستش کی باتوں کا آغاز ہو چکا تھا۔

38: کاش آج اس مجلس میں بدر میں مرنے والے میرے بزرگ اور قبیلہ خزرج کی مصیبتوں کے شاہد ہوتے تو خوشی سے اچھل پڑتے اور کہتے: "شاباش اے یزید تیرا ہاتھ شل نہ ہو، ہم نے اُن کے بزرگوں کو قتل کیا اور بدر کا انتقام لے لیا، بنی ہاشم سلطنت سے کھیل رہے تھے اور نہ آسمان سے کوئی وحی نازل ہوئی نہ کوئی فرشتہ آیا ہے"—دمع السجوم

رسالت

حالیہ دنوں میں میں تھیودور نولدیکے[39]، اگناز گولڈ زیہر[40]، آلفرید فون کریمر[41]، آدم میتز[42]، ریجی بلیشیر[43] اور درجنوں دیگر بڑے مغربی دانشوروں نے اسلام کے ظہور اور اس کی نشوونما، قرآن کی

39: تھیودور نولدیکے (Theodor Noldeke) جرمن مستشرق تھے، 2 مارچ 1838ء میں پیدا ہوئے۔ عہد نامہ عتیق، سامی و عربی زبان، فارسی و سریانی ادب پر تحقیق کی۔ کیل اور سٹراتسبرگ کی جامعات میں پروفیسر رہے اور 70 سال کی عمر میں ریٹائر ہوئے۔ تاریخ قرآن، اسلامی تاریخ و تہذیب، حیات محمد سمیت کئی موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ اسلام کے متعلق اُن کے کئی مضامین کو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی وفات 25 دسمبر 1930ء میں ہوئی۔

40: اگناز گولڈ زیہر (Ignaz Goldziher) بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں اور ادب کے استاد تھے۔ عربی زبان سیکھی۔ شام، فلسطین اور مصر کے سفر کیے۔ جامعہ الازہر کے علماء کے لیکچرز سے بھی استفادہ کیا۔ گولڈ زیہر کی اسلام سے محبت کی وجہ سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مصر کے قیام کے دوران جمعہ کی نماز بھی پڑھی، لیکن اپنے مذہب یعنی یہودیت پر قائم رہے۔، تاریخ اسلام اور دین اسلام کے متعلق وسیع علم رکھتے تھے۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ

"گولڈ زیہر نے حدیث کے متعلق جو لکھا ہے، علم اُس کا مرہون منت ہے۔ مستشرقین کی اسلامی تحقیقات پر جتنا اثر انداز گولڈ زیہر ہوا ہے، اتنا اس کا کوئی دوسرا معاصر مستشرق نہیں ہوا۔ ان کی کتاب "اسلام میں عقیدہ اور شریعت" کا "تئیس سال" میں بہت ذکر ملے گا۔

41: آلفرید فون کریمر (Alfred von Kremer,) ایک مستشرق تھے، 1828 میں پیدا ہوئے ان کا تعلق آسٹریا سے تھا۔ اپنے طور پر یونانی، عبرانی، عربی اور فارسی سیکھی۔ اکیڈمی آف سائنس سے وظیفہ لے کر مصر گئے۔ مصر کے متعلق دو جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی۔ "اسلام میں عقائد کی تاریخ"، "اسلامی تمدن کی مختصر تاریخ"، دو جلدوں پر مشتمل "خلفا کے دور میں مشرقی تمدن کی تاریخ" کے علاوہ جرمن اور عربی میں بہت زیادہ کتابیں لکھیں۔

42: آدم میتز (Adam Mez) جرمنی کے شہر فریبورگ میں پیدا ہوئے، سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں پروفیسر رہے۔ عربی اور تاریخ اسلام میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ جرمن زبان میں Die Renaissance des Islams (تجدد اسلام) نام سے لکھی گئی کتاب کے حوالے سے جانے جاتے ہیں جس کا عربی، فارسی کے علاوہ کئی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ آدم اس کتاب کو چوتھی صدی ہجری کے اسلامی تمدن کی تاریخ کہتے تھے۔

43: ریجی بلیشیر (Régis Blachère) کا تعلق فرانس سے تھا، اُنھیں مستشرقین کے سلسلے کا آخری بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ عربی زبان و ادب کے استاد رہے۔ عربی فرانسیسی لغت مرتب کی۔ عربی زبان، ادب اور عربی ادب کی تاریخ پر درجن بھر کتابیں اور بہت زیادہ مضامین لکھے۔ کئی مضامین اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں شامل کیے گئے۔ عربی زبان و ادب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ان کی کتابیں اور مضامین ایک خزانے کی مانند ہیں۔ ان کا اہم ترین کارنامہ دو جلدوں پر مشتمل "قرآن" کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہے۔ جس میں اُنھوں نے نزول کی مناسب سے قرآن کو نئی ترتیب دی ہے۔

تنظیم و تفسیر اور اس کی آیات کی شان نزول، حدیث کی ابتدا اور ارتقاء کے علاوہ محدثین کی جانفشانہ کاوشوں پر بہت باریک بینی اور سائنسی انداز سے تحقیق کی ہے۔ اور اُنھوں نے اسلام کی شان کے خلاف کسی بھی قسم کے تعصب کا مظاہرہ نہ کرتے ہوئے اسلامی مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی بینائی کو اُن کے مذہبی تعصب نے دھندلا دیا ہے۔ اس لیے وہ محمد کو ایک مہم جُو، طاقت کے حصول کا طلب گار اور نبوت کا جھوٹا مدعی قرار دیتے ہیں اور اُن پر قرآن کو اپنے ذاتی مقاصد کے حصول اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایک ذریعے کے طور استعمال کرنے کا الزام دیتے ہیں۔ اگر ان لوگوں نے اسی انداز میں موسیٰ اور عیسیٰ پر تنقید کی ہوتی تو ان کی رائے کو اہمیت دی جا سکتی تھی، لیکن یہ موسیٰ اور عیسیٰ کو تو مامور من اللہ گردانتے ہیں لیکن محمد کو رد کرتے ہیں۔ لہذا یہ لوگ بحث سے خارج ہیں۔

اُن کی باتوں میں عقلیت پسندی کی کوئی دلیل کیوں نظر نہیں آتی؟۔ اُن کے لیے بہتر یہ ہے کہ پہلے نبوت کی بنیاد پر بات کریں کہ وہ نبوت کو کیوں ضروری امر اور مسلّم گردانتے ہیں؟ اور وہ کیسے ایک کی

تصدیق اور دوسرے کا انکار کرتے ہیں؟۔ محمد بن زکریا رازی[44] اور ابو العلاء المعری[45] جیسے بہت سے عقلیت پسند اور روشن خیال دانشور نبوت کی بنیاد کے منکر ہیں۔ اُن کے نزدیک علمائے علم الکلام جو کہتے ہیں اور نبوت کے اثبات کیلئے جو دلائل دیتے ہیں وہ منطقی طور نامناسب اور بودے ہیں۔ علمائے علم

44:رازی 854ء میں ایران کے شہر رے میں پیدا ہوئے۔ ایک فلسفی، ریاضی دان، طبیب، ہیئت دان اور نقاد کے طور پر شہرت پائی۔ بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے۔ رازی نبوت اور وحی کے منکر تھے۔ اُن کے بقول خدا کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کو منتخب کرے اور اُسے اپنا پیغمبر بنا کر دوسرے لوگوں پر مسلط کر دے۔ وہ قرآن کو معجزاتی کتاب بھی تسلیم نہیں کرتے تھے، اُن کا کہنا تھا کہ قرآن سے بہتر کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ "تم کہتے ہو کہ قرآن ایک واضح معجزہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ جو اس کا انکار کرتا ہے وہ اس جیسا لے کر آئے۔ بیشک ہم بلیغ اور فصیح لوگوں، اور بہادر شاعروں کے کام سے اس جیسی ہزاروں کتابیں لا سکتے ہیں۔ جن کی تحریریں موزوں تر ہیں اور مسائل کو دقیق تر انداز میں بیان کرتی ہیں۔ وہ مطالب کو بہتر طور سے پیش کرتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ نثر زیادہ مقفیٰ ہے۔ خدا کی قسم، تمھاری باتیں ہمیں حیران کرتی ہیں، اور قدیم اساطیر اور خرافات کو دوہراتی ہیں۔ جو نہ صرف تضادات سے بھرپور ہیں بلکہ ان میں کوئی بھی مفید معلومات یا وضاحت نہیں ہے اور پھر تم کہتے ہو کہ اسی جیسی کتاب بنا کر لاؤ۔ (رازی: مخارق الانبیاء)۔ مذہبی نظریات کی وجہ سے البیرونی اور ابن سینا سمیت کافی لوگوں نے رازی پر تنقید کی ہے۔ ابن سینا نے رازی کے متعلق کہا تھا:" اسے جراحی، پیشاب اور پاخانہ ٹیسٹ کرنے تک خود کو محدود رکھنا چاہیے تھا۔ در حقیقت اس نے اپنے آپ کو ننگا کیا ہے اور ان معاملات میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے"۔۔ امیر بخارا کو جب رازی کے نظریات کی خبر ہوئی تو اُس نے حکم دیا کہ رازی کی کتابیں اُس کے سر پر تب تک ماری جائیں جب تک کتابیں نہ پھٹ جائیں یا رازی کا سر نہ پھٹ جائے۔ اس تشدد کے نتیجے میں رازی اپنی بینائی کھو بیٹھے۔

45:المعّری کا تعلق شام سے تھا۔ 983ء میں پیدا ہوئے۔ ماہر لسان اور عظیم شاعر تھے۔ چالیس سال کی عمر میں چیچک کے نتیجے میں بینائی کھو بیٹھے۔ قرأن کے مقابلے پر "الفصول الغایات" نامی کتاب لکھی، جو اُن کے بقول قرآن سے بہتر تھی۔ معرّی کا کہنا تھا۔ "پیغمبروں کی باتوں کو سچ مت گردانو، یہ تمام صرف اختراعات ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے انسان اچھی زندگی گزار رہا تھا جو اِنھوں نے آکر تباہ کر دی۔ مقدس کتابوں ایسی بے تکی اور فضول کہانیوں کا مجموعہ ہیں جو کسی بھی دور میں وجود پذیر ہوتی ہیں اور واقعی ہوئیں۔۔۔۔۔ دنیا میں دو قسم کے انسان پائے جاتے ہیں۔ مذہب کو نہ ماننے والے ذہین لوگ اور مذہب کو ماننے والے ذہانت سے محروم لوگ"۔ معرّی اسلامی عقائد کے علاوہ مسیحیت اور یہودیت کا بھی مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اُن کے بقول اگر یہ لوگ زرتشتیوں یا صابئین کے ہاں پیدا ہوتے تو زرتشتی یا صابی ہوتے۔ شامی خانہ جنگی کے دوران 2013ء میں القاعدہ کی النصرۃ فرنٹ نامی شاخ نے معرّی کے مزار کو تباہ کر دیا تھا۔

الکلام نبوت کے اثبات میں کہتے ہیں کہ خدا اپنے بندوں کو شر اور بدکاری سے دور رکھنے کیلئے کسی خاص بندے کو نامزد کرتا ہے۔

لیکن عقلیت پسندوں کا کہنا ہے: اگر خدا کو انسانوں کی بھلائی، نیکی، بہتری اور نظم اس قدر عزیز ہے تو اُس نے اُنھیں اچھے اور نیک انسانوں کی شکل میں پیدا کیوں نہیں کیا؟۔ اُس نے اُن کے اندر شرّ اور بدی کا مادہ کیوں رکھا جس کی وجہ سے رسول بھیجنے کی ضرورت پیش آئی؟۔

اس کا عمومی جواب یہ دیا جاتا ہے کہ خدا نے شرّ اور بدی کو تخلیق نہیں کیا۔ خدا خالص اچھائی ہے۔ اور یہ انسانی فطرت ہے کہ اُس کے اندر شیر و خیر کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

ہم کہتے ہیں: انسانی فطرت جس میں شرّ اور بدی کا امکان اور اُسی طرح خیر اور نیکی کا امکان موجود ہوتا ہے، اسے یہ فطرت کون ودیعت کرتا ہے؟۔ جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے اور زندگی گزارتا ہے اسے ماں باپ کی طبیعت اور مزاج کی خصوصیات حمل کے وقت نطفے کے ذریعے ملتی ہیں، اور بچہ مخصوص جسمانی و طبعی خصوصیات کے علاوہ دماغی و نفسیاتی خصوصیات کے ساتھ دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ جو اس کے مادی جسم کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ جس طرح کوئی انسان اپنے طور پر اپنی آنکھوں کا رنگ، ناک کی ساخت، دل کی دھڑکن کی کیفیت، قد کے چھوٹے بڑے ہونے، دیکھنے کی قوت اور گردے کی کمزوری کو تبدیل کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، اسی طرح اُس کی دماغی و اعصابی استعداد، اور اندرونی خواہشات بھی اُس کی دسترس سے باہر ہیں۔

کچھ لوگ فطری طور پر پر سکون اور معتدل مزاج ہوتے ہیں اور کچھ تیز مزاج اور جھگڑالو ہوتے ہیں اور دوسروں سے زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ نیک منش لوگ دوسروں کی آزادی میں مخل نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی کا حق مارتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو دوسروں کے ساتھ بدمعاشی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

کیا رسولوں کا اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی فطرت کو تبدیل کریں؟ مگر کیا ایسا ممکن ہے کہ وعظ سے کالے چمڑے کو سفید میں تبدیل کیا جاسکے؟۔ اُسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شرّ کی طرف مائل اپنی فطرت کو خیر کی طرف موڑلے۔ اور اگر ایسا ممکن ہے تو پھر دین قبول کرنے والے انسانوں کی تاریخ جرائم، ظلم اور غیر انسانی اعمال سے کیوں بھری ہوئی ہے؟

پس ہم اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، کہ اللہ تعالی نے انسانوں کے پاس جو انبیاء بھیجے، تاکہ وہ نیک بن جائیں اور خیر کی طرف آئیں، اُس عمل سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے۔ کسی بھی معروضی سوچ رکھنے والے انسان کے نزدیک اس ہدف کو حاصل کرنے کا یقینی راستہ صرف یہی تھا کہ قادر مطلق سب کو نیک پیدا کرتا۔

علماء اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں کہ یہ دنیا ایک دارالامتحان ہے جس میں نیک اور بد انسانوں کے فرق کو واضح کیا جاتا ہے۔ انبیاء کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اُن کے بتائے ہوئے راستے پر عمل کریں اور جنت کے حق دار ٹھہریں اور جو اس سے انکار کریں، وہ اپنے برے اعمال کی سزا پائیں۔

نبوت کے منکر کہتے ہیں: یہ انتہائی عامیانہ بات ہے۔ امتحان کس لیے؟ خدا کا اپنے بندوں کا امتحان لینے والی بات تو سرے سے ہی غلط ہے کیونکہ خدا اپنے بندے کی اُن باتوں کو بھی جانتا ہے جن سے بندہ خود آگاہ نہیں ہوتا۔ کیا اس امتحان لینے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ برائی کے متعلق آگاہ ہوں؟ لیکن وہ تو اسے برائی نہیں گردانتے، وہ بدی کے مرتکب ہی اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ وہ اسے بدی نہیں سمجھتے۔

وہ جو بھی کرتے ہیں اپنی فطرت اور طبع کے مطابق کرتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ سب لوگوں کی فطرت ایک سی ہے تو پھر کچھ لوگوں کی نبی کی پیروی اور کچھ کی پیروی نہ کرنے کی کوئی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ باالفاظ دیگر اگر اُن میں نیکی و بدی اور خیر و شرّ کی یکساں استعداد رکھی جاتی تو یا تو سب پیروی کرتے یا سب نافرمانی کرتے۔

اس کے علاوہ علماء کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قرآن میں درجن کے لگ بھگ آیات ہیں جن کے مطابق بندوں کی گمراہی یا راہ راست پر ہونے کو اللہ کی مرضی کے تابع بتایا گیا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ (جس کو دوست رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے: القَصَص۔56)۔

سورت الزُّمَر کی آیت 23 میں فرمایا گیا ہے

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (جس کو اللہ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں)۔

سورت السَّجدَة کی آیت 13 میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

(اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے۔ لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا)۔

اس کے علاوہ بہت سی آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ہدایت اور گمراہی خدا کی طرف سے ہے۔ میں اُن سب کو یہاں موضوع سے خارج کرتا ہوں کیونکہ اس سے بات بہت طویل ہو جائے گی۔ لیکن ان سب سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر ہدایت نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ مذہب کا صحیح معنوں میں معاشرے میں جڑیں نہ پکڑ سکنا بھی اس کا ثبوت ہے۔ پس یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاء کو بھیجے جانے سے مطلوبہ نتائج بر آمد نہیں ہو سکے اور متکلمین کو نبوّت کو ثابت کرنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔

نبوت کو برحق ثابت کرنے کے لیے مذہبی متکلمین نے خواہ اُن کا تعلق اسلام یا دوسرے ادیان سے ہے، سخت کوشش کی ہے کہ وہ ایک ایسی بات کو سچ ثابت کر پائیں جو مشکوک اور عقلی پیمانوں سے ناقابل

اثبات ہے۔ کیونکہ انبیاء اپنے آپ کو جس پروردگار کا بھیجا ہوا گردانتے ہیں، اُس کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے یہ مؤقف اختیار کرنا لازمی ہے کہ جہان کو حادث اور عدم سے وجود میں آیا ہوا سمجھا جائے۔ اگر کائنات پہلے سے موجود نہیں تھی اور بعد میں وجود میں آئی تو فطری بات ہے کہ کسی خالق نے اُسے تخلیق کیا ہو گا۔ لیکن یہ دعویٰ خود اپنے طور پر ناقابل اثبات ہے۔ ہم اتنی قطعیت سے کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا کہ کائنات نہیں تھی اور نہ ہی کسی قسم کے وجود کا کوئی نشان تھا؟۔

یہ مفروضہ کہ ایک وقت ایسا تھا کہ جب کائنات کا وجود نہیں تھا، ہمارا سورج اور اُس کے تابع سیارے بھی نہیں تھے، تو قابل تصور و تصدیق ہے۔ لیکن اُس کو تشکیل دینے والے مادے موجود نہیں تھے اور وہ عدم سے وجود میں آیا، یہ دعویٰ قطعاً معقول نظر نہیں آتا بلکہ معقولیت کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی وہ مادے موجود تھے جن کے ایک دوسرے کے ساتھ ملنے سے سورج پیدا ہوا۔ اس کے باوجود کہ ہم زیادہ نہیں جانتے کہ کن عوامل کی وجہ سے پیدائش کی ترکیب و کیفیت ہوئی، یہ مفروضہ اس لیے زیادہ جائز اور معقول ہے کیونکہ ستاروں کے بُجھ جانے اور نئے ستاروں کے وجود میں آنے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ دوسرے لفظوں میں وقوع کا تعلق صورت بدلنے سے ہے نہ کہ ماہیت سے۔ اور اگر صورت حال یہ ہے تو ایک صانع کے وجود کا اثبات مشکل ہو جاتا ہے۔

اس مشکل اور ناقابل حل قضیے سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ایک وقت کائنات کا وجود نہیں تھا اور وہ ایک قادر مطلق خدا کے ارادے سے وجود میں آئی ہے۔ تو کائنات کو پیدا کرنے کے مقصد پر سوال کھڑا ہو جاتا ہے، اور ہم خواہ کتنا بھی سر کھپا لیں ہمیں اس مسئلے کا حل نہیں ملتا کہ جب کائنات تخلیق ہوئی تو وہ اُسی وقت ہی کیوں تخلیق ہوئی؟ اور خدا نے اسے تخلیق کرنے کا ارادہ کیوں کیا ؟ اور اس سے پہلے اس کا وجود کیوں نہیں تھا؟۔ وہ کیا چیز تھی جس نے خدا کو کائنات کی تخلیق کے لیے تحریک دی؟۔

ان امور کو عقلی دلائل سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ عقلی استدلال سے خالق کے وجود کا اثبات یا نفی مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

اس الجھن کے علاوہ ایک اور ناقابل تردید امر بھی باقی بچ جاتا ہے۔ جس کا تعلق ہم زمین کے باسیوں سے ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نہیں چاہتے کہ اُنھیں زمین پر موجود دوسرے حیوانات کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ انسان سوچ سکتے ہیں، اور زمانہ بعید سے، جہاں تک انسانی یاداشت کام کرتی ہے، انسان نے یہی تصور کیا ہے کہ اس نظام کو کوئی چلارہا ہے اور خیر اور شرّ کے حوالے سے وہ اثر انداز رہا ہے۔

اس عقیدے کی جو بھی بنیاد ہو، خواہ غرور ہو یا خود پسندی کہ جس سے وہ خود کو حیوانات سے ممتاز سمجھتا ہے، اس نے خالق کی تخلیق کی راہ ہموار کی ہے۔

ابتدائی ترین اور وحشی ترین معاشروں میں بھی مذہب موجود تھا، اور ترقی یافتہ اور افضل اقوام کے ہاں بھی پہنچا ہے۔ ابتدائی یا دور وحشت کے انسان کے عقائد اوہام و خرافات سے عبارت تھے۔ ترقی یافتہ لوگوں کے ہاں اپنے داناؤں اور مذہبی بزرگوں کے خیالات کی روشنی میں اخلاقی ضابطے اور سماجی نظام ترتیب پائے۔ جن سے وہ وحشت کی حالت سے باہر نکلے۔ اس سے اُن کے ہاں نظم وضبط اور انصاف پیدا ہوا جس نے زندگی کی آسائشوں کی طرف راستہ ہموار کیا۔

یہ تبدیلی اور بھلائی کی سمت کا سفر اسلاف کا مرہون منت ہے۔ جو کبھی فلسفیوں کے طور پر، کبھی مصلحین کے نام سے، کبھی قانون سازوں کے نام سے اور کبھی پیغمبروں کے عنوان تلے ظاہر ہوئے۔ جیسے حمورابی، کنفیوشس، بدھا، زرتشت، سقراط، افلاطون وغیرہ۔

سامی اقوام میں مصلحین ہمیشہ پیغمبروں کی شکل میں آئے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی طرف سے مبعوث ہونے کے طور پر پیش کیا۔ موسیٰ کوہ طور پر گئے جہاں اُنھیں پتھر کی سلیں دی گئیں جن پر بنی اسرائیل کے لیے اصلاحی احکامات درج تھے۔

عیسیٰ نے یہودیوں کو اوہام و خرافات میں مبتلا پایا، چنانچہ وہ اُن کے اخلاقی سُدھار کی خاطر اُٹھ کھڑے ہوئے اور خدا کے متعلق ایک شفیق باپ اور خیر خواہ کا تصور متعارف کروایا۔ شائد اُنھوں نے خود اپنے آپ کو آسمانی باپ کا بیٹا بتایا ہو، یا یہ خطاب ان کے حواریوں نے انہیں دیا ہو، یا اناجیل اربعہ میں نے اُن کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر یا مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

چھٹی صدی کے اواخر میں محمد نامی ایک شخص کا حجاز میں ظہور ہوتا ہے جو اصلاح کی آواز بلند کرتا ہے۔ اُس کے اور عیسیٰ و موسیٰ کے درمیان کیا فرق ہے؟۔ پروپیگنڈا کرنے والے سادہ لوح لوگوں نے اُس کی نبوّت کے اثبات کی خاطر اُس کی ذات سے معجزات منسوب کیے۔ اس ضمن میں تاریخ نویسوں نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں معجزات کو اُس سے وابستہ کر دیا۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ایک مسیحی دانشور حدادنے "القرأن والکتاب" نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اُس کی وسیع و عمیق تحقیق اور اطلاعات کی گواہی دیتی ہے۔

اس کتاب میں اُس نے قرآنی آیات کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ محمد سے کوئی معجزہ صادر نہیں ہوا تھا، وہ قرآن کو بھی معجزہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ لیکن پھر کمال سادہ لوحی سے معجزے کو نبوّت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے عیسیٰ و موسیٰ کے معجزات کا اقرار کرتا ہے۔ جب کہ وہ تمام معجزات اوہام اور توہمات ہیں، جن کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اگر واقعی حضرت عیسیٰ مُردوں کا زندہ کر تے تھے، تو اُس وقت ایک بھی یہودی ایسا نہ رہتا جو اُن کے قدموں پر نہ گرتا اور اُن پر ایمان لے نہ آتا۔

اگر خدا نے اپنے بندوں میں سے کسی کو یہ صلاحیت واقعی عطا فرمائی تھی کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دے۔ دریا کے پانی کو بہنے سے روک دے، آگ سے جلانے کی صلاحیت کو سلب کر لے تا کہ لوگ اُن پیغمبروں پر ایمان لے آئیں اور اُن کے مفید احکامات پر عمل کریں، تو کیا یہ زیادہ آسان اور عقل کے قریب تر حل

نہیں تھا کہ لوگوں کے دماغوں کو پیغمبروں کے تصرف میں دے دیتا یا لوگوں کو نیک پیدا کرتا۔ چنانچہ نبوّت کے مسئلے کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھنا زیادہ مفید ہو گا اور وہ یہ ہے کہ اسے ایک قسم کا غیر معمولی روحانی و دماغی عطیہ اور خصوصیت تصور کیا جائے۔

مثلاً جنگجوؤں میں سے کوروش، جولیس سیزر، سکندر یونانی، نپولین اور نادر جیسے انسانوں میں کسی خاص تربیت کے نہ ہونے کے باوجود جنگی منصوبہ بندی اور حریف پر غلبہ پانے کی صلاحیت موجود تھی۔ یا جیسے علم و فن کی دنیا میں آئن سٹائن، ارسطو، ایڈیسن، ہومر، مائیکل اینجلو، فردوسی، حافظ، ابن سینا، نصیر الدین طوسی، ابو العلاء المعری اور سینکڑوں فلسفیوں اور فنکاروں، ایجاد کنند گان اور دریافت کنند گان کا ظہور ہوا تھا، جنھوں نے اپنے خیالات، دریافتوں، ایجادات اور فنی شہ پاروں سے انسانوں کی تاریخ تمدن کو منور کیا ہے۔ تو پھر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ روحانی اور فکری امور میں اس قسم کا امتیاز اور خصوصیات انسانوں میں کسی ایک کے پاس ہو۔

کیا ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کے امکان کو عقلی بنیادوں سے رد کیا جا سکتا ہے، جو اپنی روحانی سوچ و بچار کے نتیجے میں کس مطلق ہستی کے تصور تک پہنچ جائیں۔ عمیق تفکر کے نتیجے میں وہ کچھ چیزوں کو محسوس کریں جو رفتہ رفتہ ایک قسم کا کشف، ایک باطنی بصیرت اور ایک قسم کے الہام کی صورت اختیار کر جائے جو اُنھیں دوسرے لوگوں کو ہدایت دینے اور راہنمائی کرنے کی تحریک دے۔

اپنے بچپن سے محمد اسی صورت حال میں سے گزر رہے تھے۔ اسی لیے شام کے سفر کے دوران اُنھوں نے اپنا وقت تجارت پر صرف کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیحی راہبوں اور پادریوں سے ملے اور واپسی پر مدائن، عاد و ثمود کے علاقے سے گزرتے ہوئے اُن کی اساطیری روایات سنیں اور مکہ واپسی پر اہل کتاب لوگوں سے مجلس رہی۔

وہ پہروں جبر[46] کی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے اور ورقہ بن نوفل، جو خدیجہ کے چچازاد تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے انجیل کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، کے ساتھ اُن کا مسلسل رابطہ تھا۔ امکان ہے کہ یہی وہ تجربات تھے جو ان کی بے چینی کا باعث تھے جس نے بعد میں اُن کی روح میں ہلچل مچادی۔

بعثت کی یہی داستان سیرت کی کتابوں اور احادیث میں نظر آتی ہے کہ ایک سوچنے والے عمیق بین انسان کے خیالات حقائق تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ روایات اور قرائن کے مطابق اسی طرح کی پیش رفت، جذبہ اور ایک ایسا غیر اختیاری جوش حضرت محمد کی روح کے اندر پیدا ہو چکا تھا جس نے اُنھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جو خواب یا اشراق یا باطنی کشف سے سورت العَلق کی پانچ ابتدائی آیات پر منتج ہوا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔

46: ”رسول اللہ اکثر مروہ کی پہاڑی کے پاس ایک نصرانی لڑکے کی دوکان کے قریب تشریف فرما ہوا کرتے تھے جس کا نام جبر تھا اور ابن الحضرمی کا غلام تھا۔ اس لیے لوگ کہا کرتے تھے کہ بہت سی باتیں جن کو محمد پیش کرتا ہے وہ صرف ابن الحضرمی کے چھوکرے جبر نصرانی کی سکھائی ہوئی ہیں“ سیرت النبی، عبدالرحمٰن بن ہشام۔ سورت النحل کی آیت 103 میں اسی بات کا جواب دیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) کو ایک شخص سکھا جاتا ہے۔ مگر جس کی طرف (تعلیم کی) نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے)۔

اس کے علاوہ سیرت کی کتابوں میں دوسرے لوگوں جیسے عائش علام حویطب کا ذکر بھی آتا ہے جس کے پاس کتاب اور معلومات تھیں، حضور کا بعثت سے قبل اُس کے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ آپ کی سلمان فارسی، بلال حبشی حتیٰ کہ بعثت سے قبل ابو بکر صدیق کے ساتھ بھی تفہیم اور بات چیت ہوتی تھی۔

(پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ آدمی کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھ۔ اور تمہارا رب سب سے بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا)۔

بعثت کے وقت حضرت محمد کی عمر چالیس سال تھی۔ درمیانہ قد، چہرے کا رنگ سرخی مائل سبز، سر کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ سیاہ تھا۔ بہت کم مذاق کرتے تھے اور بہت کم ہنستے تھے۔ ہنستے وقت منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ چلتے وقت ایک طرف جھکتے تھے، آہستہ چلتے تھے اور اس دوران دائیں بائیں نہیں دیکھتے تھے۔ قرائن و روایات کے مطابق اس بات کا امکان ہے کہ اپنی قوم کی زیادہ تر رسوم و رواج میں شائد ہی حصہ لیا ہو۔ یا قریش کے جوانوں کے ساتھ مل کر نمود و نمائش یا بیہودگی کا مظاہرہ کیا ہو۔ دیانت، امانت اور سچ بولنے کی وجہ سے اپنے مخالفین میں بھی مشہور تھے۔ خدیجہ سے شادی کے بعد فکر معاش سے آزاد ہو گئے اور اپنا زیادہ وقت روحانی امور میں صرف کرتے تھے۔ دوسرے حنیفوں کی طرح ابراہیم کو خداشناسی کا نمونہ سمجھتے تھے اور قدرتی طور پر اپنی قوم کی بُت پرستی سے بیزار تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے مطابق قریش کے سرداروں کا کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں پر ایمان نہیں تھا لیکن چونکہ عرب میں رائج بُت پرستی کے عقیدہ سے ان کا معاش وابستہ تھا لہٰذا وہ اس احمقانہ عقیدے کا احترام کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

حضرت محمد سوچ سمجھ کر اور محتاط انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکیوں کی طرح شرمیلے تھے۔ انداز بیان بہت جاندار اور لفاظی و تکرار سے مُبراء تھا۔ بال لمبے تھے جو آدھے کانوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ زیادہ تر سر پر سفید کلاہ رکھتے تھے اور بالوں اور داڑھی پر عطر لگاتے تھے۔ منکسر مزاج اور رحم دل تھے۔ جس کسی کے ساتھ مصافحہ کرتے تو پہلے ہاتھ واپس نہیں کھینچتے تھے۔ اپنے لباس اور جوتوں کی خود مرمت کرتے تھے۔ کمزوروں کے ساتھ میل جول تھا۔ ایک بار ایک غلام کی دعوت قبول کی اور اُس کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر جو کی روٹی کھائی۔ برائی کو روکنے کے وقت اُن کی آواز بلند ہو جاتی آنکھیں سرخ اور چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرتے۔

حضرت محمد بہادر تھے اور جنگ کی حالت میں کمان پر ٹیک لگا لیتے تھے۔ جنگ کرنے کے لیے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اگر مسلمان جنگجو ہراس کا شکار ہوتے، محمد آگے بڑھتے اور دشمنوں کے نزدیک تر ہو جاتے تھے۔ تاہم انہوں نے کسی کو قتل نہیں کیا سوائے ایک بار کے، جب ایک شخص نے اُن پر حملہ کر دیا، تو آپ نے آگے بڑھ کر اسے ہلاک کر دیا۔

اُن کے ارشادات:

- جو بھی کسی ظالم کا ساتھ دیتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔
- وہ آدمی مومن نہیں جو خود تو سیر شکم ہے لیکن اُس کا ہمسایہ بھوکا ہے۔
- حسن خلق نصف ایمان ہے۔
- ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔
- تم میں سے سب سے زیادہ طاقتور وہ ہے جسے اپنے غصے پر قابو ہے۔

بعثت

مکہ کے شمال مشرق میں تین کلو میٹر کی مسافت پر حراء نام کی ایک بنجر اور پتھریلی پہاڑی ہے۔ جس کی دشوار گزار چڑھائیوں پر چند غاریں ہیں جہاں حنیفی زاہد اعتکاف کی خاطر اکثر جایا کرتے تھے اور چند روز تنہائی میں رہ کر غور و فکر اور مراقبہ کیا کرتے تھے۔

ایک عرصہ تک محمد نے بھی ایسے ہی کیا۔ تنہائی اور ارد گرد کی زندگی کے شور شرابے سے دوری کی شدید خواہش اُنھیں وہاں لے جاتی تھی۔ کبھی اپنے ساتھ کھانے کا کافی سامان لے جاتے تھے اور تب تک واپس نہیں آتے تھے جب تک کھانا ختم نہ ہو، اور کبھی صبح کو جاتے تھے اور شام کو گھر واپس آجاتے تھے۔

610ء کی ایک شام اُنھوں نے واپس آنا تھا لیکن مقررہ وقت پر گھر واپس نہیں پہنچے، جس سے خدیجہ بہت پریشان ہوئیں اور کسی کو اُن کی تلاش میں بھیجا۔ لیکن اس سے تھوڑی دیر بعد محمد خود ہی گھر آ پہنچے۔ لیکن اُن کے چہرے کی رنگت زرد تھی۔ اُنھوں نے ایک دم سے کہا: "مجھے کوئی کپڑا اوڑھا دو" جو اوڑھا دیا گیا اور جب تھوڑی دیر بعد اُن کے حواس بحال ہوئے اور خوف و اضطراب کی حالت ختم ہوئی تو اُنھوں نے اپنے ساتھ پیش آنے والا وہ تمام واقعہ خدیجہ کو سنایا جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچے تھے۔

بہتر ہو گا کہ اس واقعہ سے متعلق عائشہ سے روایت کردہ حدیث کا ذکر کیا جائے جس کو تقریباً تمام معزز و معتبر محدثین جیسے مسلم[47]، بخاری[48]، ابن عبد البر[49]، ابو داؤد طیاسی[50]، نویری[51]، ابن سید الناس[52] اور احمد بن حنبل[53] نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے۔

"وحی کا آغاز سچے اور صالح خوابوں سے ہوا، جو صبح کی سفیدی کے مانند روشن ہوتی تھی۔ ایک دن غروب کے بعد جب وہ غار حراء میں موجود تھے تو ایک فرشتہ ظاہر ہوا اور کہا: "اقرأ! پڑھ!" اور محمد نے جواب دیا: "میں پڑھنا نہیں جانتا"۔ جو واقعہ محمد نے خدیجہ کو بتایا وہ یوں ہے۔

47: مسلم بن الحجاج خراسان کے شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے، اور امام مسلم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ بہت بڑے محدث تھے۔ علمائے اسلام کے نزدیک قرآن کے بعد پہلا مرتبہ صحیح بخاری کا ہے، اُس کے بعد دوسرا مرتبہ صحیح مسلم کا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک صحیح مسلم کا مرتبہ صحیح بخاری کے مساوی ہے، اور کچھ کے نزدیک یہ صحیح بخاری سے زیادہ مرتبہ رکھتی ہے، کہ بہت زیادہ تحقیق کے بعد اس میں احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔

48: محمد بن اسماعیل بخاری، بخارا میں پیدا ہوئے۔ امام مالک بن انس کے شاگرد تھے۔ سنی فرقہ کے سب سے بڑے محدث کے طور پر مشہور ہیں۔ اُن کی جمع کردہ احادیث کا مجموعہ صحیح بخاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جسے قرآن کے بعد اسلام کی معتبر ترین کتاب کا درجہ حاصل ہے۔

49: عبد البر مراکشی محدث تھے۔ حدیث اور اسلامی فقہ پر بہت زیادہ کتابیں تالیف کیں۔

50: غالباً یہاں پر کتابت کی غلطی ہوئی ہے۔ ابو داؤد سلیمان بن داؤد الطیاسی ہونا چاہیے۔ نسلاً ایرانی تھے۔ عربوں کے حملے کے نتیجے میں ان کا خاندان جنگی قیدی کے طور پر عرب پہنچا۔ بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں زندگی بسر کی۔ بہت ہی معتبر اور معزز عالم اور محدث شمار ہوئے۔ احادیث جمع کرنے کے لیے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ ان کی جمع کردہ احادیث کے مجموعے کا نام مسند ابو داؤد طیالسی ہے۔ اِنھیں ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی نامی محدث کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جائے جو "سنن ابو داؤد" کو مرتب کرنے کے حوالے سے جانے جاتے ہیں، سنن ابو داؤد "صحاح ستہ" میں شمار ہوتی ہیں۔

51: محمد بن کندی مصری ایک نامور مورخ اور خطاط تھے۔ نویری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ تیس جلدوں پر محیط "نھایت الادب فی فنون الادب" ان کا اہم کارنامہ ہے۔ 1350ء میں وفات پائی۔

52: فتح اللہ ابو الفتح آندلسی نے دمشق میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں قاہرہ میں اسلامی علوم کے استاد مقرر ہوئے۔ ابن سید الناس کے طور پر جانے جاتے تھے۔ رسول کے فضائل پر نثر و نظم میں کام کیا۔ 1350ء کے لگ بھگ انتقال ہوا۔

53: احمد بن محمد بن حنبل بغداد میں پیدا ہوئے۔ اہل سنت کے چار آئمہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ حنبلی فقہ کی بانی ہیں۔ ان کی جمع کردہ احادیث کو "مسند احمد بن حنبل" کہا جاتا ہے۔ عباسی دور میں قرآن کو مخلوق تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے بہت زیادہ اذیتیں برداشت کیں۔

"فاخذنی وغطنی حتی بلغ منی الجھد" (اس نے مجھے اس قدر زور سے بھینچا کہ میں بے حال ہو گیا)۔ جب میری حالت بہتر ہوئی تو اُس نے پھر کہا: "اقرأ! یعنی پڑھ!"، میں نے جواب دیا: "میں پڑھ نہیں سکتا"۔ اس نے پھر مجھے اس قدر بھینچا کہ میری تمام قوت ختم ہو گئی، اس کے بعد اس نے مجھے چھوڑ دیا اور اس نے تیسری بار کہا: "پڑھ"۔ میں نے دوہرایا: "میں پڑھ نہیں سکتا"۔ فرشتے نے مجھے پھر بھینچا اور چھوڑ دیا اور کہا: " اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ "۔ (پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لو تھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھ، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا)۔ اس واقعہ کے بعد فرشتہ غائب ہو جاتا ہے اور حالت بہتر ہونے کے بعد محمد گھر آ جاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ خدیجہ کو کہتے ہیں کہ مجھے اپنی جان کا ڈر لاحق ہو گیا ہے۔ حضور اس بات سے کیا کہنا چاہ رہے تھے؟ وہ اس قدر کیوں ڈر گئے تھے؟۔ کیا اُنھیں گمان گزرا تھا کہ وہ اختلال کا شکار ہو گئے ہیں؟ یا اُن پر کسی نے جادو کر دیا ہے؟ یا وہ کسی لاعلاج مرض کا شکار ہو گئے ہیں؟۔

خدیجہ نے اُنھیں جو جواب دیا اور تسلی دی، اُس سے وہ پُر سکون ہو گئے۔ اس بات کا امکان ہے کہ خدیجہ نے اُنھیں یہ کہا ہو گا: " اللہ ہر گز ایک اچھے انسان کو اپنی عنایت سے مایوس نہیں کرے گا جو ضرورت مندوں کی دست گیری کرتا ہے۔ مہمان نواز ہے، اپنے عزیزوں کے ساتھ مہربان ہے اور مصیبت زدگان کی مدد کرتا ہے"۔

اس گفتگو کے بعد جب محمد پُر سکون ہو جاتے ہیں۔ تو خدیجہ جلدی سے ورقہ بن نوفل کے ہاں چلی جاتی ہیں اور اُسے تمام واقعہ سناتی ہیں۔ ورقہ جو بت پرستی سے بیزار تھا اور کئی بار محمد کو اعتکاف کرنے اور

قریش کے احمقانہ عقائد سے دور رہنے کا مشورہ دے چکا تھا، خدیجہ کو کہتا ہے: ”بعید نہیں ہے کہ خدا کے توجہ کرنے کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا ہو اور محمد کو اپنی قوم کی راہنمائی کیلئے مامور کیا گیا ہو“۔

عائشہ کی روایت کردہ حدیث میں کچھ بھی ان ہونی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس پر علم نفسیات کے اصول منطبق ہوتے ہوں۔ کسی چیز کو دیکھنے کی شدید خواہش مطلوبہ شے کو حقیقی اور واضح انداز میں دکھا دیتی ہے۔ آرزو کی ایک ہی صورت جس پر ایک آدمی نے تیس سال تک سوچ بچار کی، اہل کتاب لوگوں سے مسلسل رابطے سے وہ روح میں راسخ ہو گئی اور غارِ حراء میں کی گئی ریاضت اور اعتکاف سے وہ شخصیت میں حلول کر گئی۔ اور پھر وہ خواب یا تصوف کی اصطلاح میں اشراق کی صورت میں ایک زندہ شئے کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ وہ صورت جو اُن کے تحت الشعور میں چھپی ہوئی تھی، سامنے آن کھڑی ہوتی ہے اور اُنھیں دعوتِ عمل دیتی ہے لیکن اس سمت میں قدم اٹھانے کا خوف اُن کو اس قدر نچوڑ دیتا ہے کہ اُن کی تمام طاقت و توانائی سلب ہو جاتی ہے اور اُنھیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے، وگرنہ فرشتے کے اس زور سے بھینچنے کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی جس سے وہ بے حال ہو جائیں۔ وہ فرشتہ اصل میں محمد کے تحت الشعور اور اندر چھپی ہوئی آرزوؤں کی تجسیم تھا۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ تجزیہ ایک مفروضہ ہے لیکن اس تجزیے اور مفروضے کو ایک اور واقعے سے تقویت ملتی ہے۔ جس میں محمد خدیجہ سے کہتے ہیں: ”جائنی و انا نائم بنمط من الدیباج فیہ کتاب فقال۔ اقرأ، و ھبت من نومی فکأنما کتب فی قلبی کتاباً“ (جب میں سو رہا تھا تو وہ میرے پاس زربفت کے ایک ٹکڑے میں کتاب لپیٹ کر لایا اور مجھے پڑھنے کو کہا، میں جاگ گیا اور گویا وہ کتاب میرے دل میں نقش ہو گئی)۔ دن بھر کی سوچ بچار اور تفکر کی تھکاوٹ نے محمد کو وجد کی سی نیند میں بھیج دیا تھا۔ اور وجد اور راحت کی اس حالت میں اُن کی پنہاں آرزوئیں ظاہر ہوتی ہیں لیکن کام اور عمل کی مشکلات نے انہیں وحشت زدہ کر دیا۔

عائشہ سے روایت کردہ حدیث کی عبارت یوں ہے: ”فرجع بها رسول الله یرجف فؤادہ فدخل علی خدیجه فقال زملونی، فزملو. حتی ذهب عنه الروح“۔ رسول اللہ دھڑکتے دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے، وہ خدیجہ کے پاس گئے اور کہا: ”مجھے کپڑا اوڑھا دو“۔ اُنھوں نے اس وقت تک اُنھیں کپڑا اوڑھائے رکھا جب تک اُن کی کپکپی دور نہ ہو گئی“۔ یعنی اُس واقعے کے اضطراب اور خوف نے آپ پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ ایسی حالت کا سامنا اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو دوہری زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔ وہ ایک عام معمول کی زندگی اور دوسری ناآشنا اور نیم تاریک روحانی زندگی جو ہیولوں سے بھری ہوتی ہے، کا سامنا کرتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد محمد دوبار غار حراء میں گئے لیکن نہ تو کوئی فرشتہ آیا، نہ ہی وحی نازل ہوئی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔ کیا وہ تمام واقعہ ایک واہمے یا خواب سے زیادہ کچھ نہیں تھا؟ کیا ورقہ کی دی ہوئی نبوت کی خوش خبری یاوہ گوئی اور مبالغہ آمیزی تھی؟۔ اس کے بعد سے وہ جان لیوا قسم کے شکوک کا شکار ہو گئے۔ مایوسی نے اُن پر اس قدر غلبہ پا لیا کہ وہ خودکشی کرنے کے متعلق سوچنے لگے۔ چند بار پہاڑ کی چوٹی سے کودنے کا ارادہ کیا، لیکن خدیجہ اور ورقہ ہمیشہ ان کو پُرسکون کرتے اور ہمت بندھاتے رہے۔

کوئی نیا پیغام نہ ملنے یا غیبی آواز سنائی نہ دینے کو تاریخ اسلام میں انقطاعِ وحی کا نام دیا جاتا ہے۔ جس کا دورانیہ مختلف روایات کے مطابق تین دنوں یا تین مہینوں یا تین سالوں کی طوالت اختیار کر گیا تھا۔ وحی کا انقطاع تب ختم ہوا جب سورت المدّثّر نازل ہوئی۔ وحی کے منقطع ہونے کی وجہ سمجھی جا سکتی ہے۔ اُس خواب یا ظہور یا اشراق کے بعد روح کی تشنگی ختم ہو چکی تھی۔ بصیرت پانے کے شعلہ کی تپش اور اشتیاق میں کمی آ چکی تھی۔ ذات کے اندر سالوں سے جلتے ہوئے شعلے کی جگہ پر سردی اور خاموشی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ پرانی ناامیدی اور شبہات کو اپنا کام دوبارہ دکھانا ضروری ہو چکا تھا، تا کہ مراقبت اور تفکر

سے روشنی کے اُس خزانے کو دوبارہ پُر کریں جو خالی ہو چکا تھا جس سے محمد کا سفر رک گیا تھا۔ اور اس ظاہری محمد کے اندر جو محمد سویا ہوا تھا، وہ بیدار ہو سکے اور حرکت میں آئے۔

بعثت کے حوالے سے عائشہ کی بیان کردہ حدیث کے بعد سیرت رسول اللہ کے مؤلف کی چند سطریں درج کرنا نکتہ بین اہل دانش کیلئے سود مند ہو گا۔ محمد بن اسحاق کا انتقال 150 ہجری میں ہوا۔ انہوں نے پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے آغاز میں سیرت رسول اللہ لکھی۔ اصل واقعہ کے سو سال بعد حقیقت بیان کرنے کی بجائے افسانہ طرازی نے جنم لیا۔ معجزہ سازی اور خیال پردازی کے ذکر بہت زیادہ اور عام ہو گیا۔

بعثت سے قبل مکّہ میں رفع حاجت کیلئے محمد جب بھی گھر سے باہر جاتے تھے اور شہر کی گلیوں کے پیچ و خم سے گزرتے ہوئے مکانات سے دور پہنچ جاتے تھے تو درختوں اور پتھروں سے " السلام علیکم یا رسول اللہ " کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ لیکن پیغمبر جب آگے پیچھے دیکھتے تھے تو اُنھیں وہاں کوئی اور نظر نہیں آتا تھا اور اُن کے ارد گرد پتھروں اور درختوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ نہ درخت بول سکتے ہیں اور نہ پتھر۔ کیونکہ اُن میں آواز پیدا کرنے کا آلہ یعنی صوتی تار (vocal chords) نہیں ہوتے اور اس سے بھی زیادہ مسلمہ بات یہ ہے کہ وہ ذی روح نہیں ہوتے جو سوچیں یا ارادہ کریں، جس کا اظہار وہ الفاظ کی صورت میں کریں۔

یہ روایت اس حد تک لغو اور عقلی طور پر ناقابل قبول ہے کہ کئی فقہاء، مفسرین اور سیرت نگار اس کو رد کرتے ہیں اور ان آوازوں کو فرشتوں کی آوازیں سمجھتے ہیں۔ صاف ظاہر کہ ان علما میں سے کسی کے دماغ میں بھی یہ بات نہیں آسکی کہ یہ آوازیں محمد کی اپنی روح کی آوازیں تھیں۔ جو سالوں کے تفکر کے نتیجے میں اُن کی روح کا ایسا حصہ بن چکی تھیں کہ اُن پر اصلیت کا گمان ہوتا تھا اور وہ ایک شکل اختیار کر چکی تھیں۔ در حقیقت یہ آوازیں ایک ایسے دماغ سے آرہی تھیں جو اپنی سوچوں سے مسخر ہو چکا تھا۔

چونکہ اُن میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ابن اسحاق کی کہی ہوئی بات کو یاوہ گوئی اور مجہول کہہ کر رد کریں۔ چنانچہ اُنھوں نے اسے فرشتوں کی آواز قرار دے کر اس کی توجیہ کی۔ دانستہ یانادانستہ طور پر اُن کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ اگر فرشتوں نے حضور کو سلام کرنا ہی تھا تو وہ سب لوگوں کی موجودگی میں سلام کرتے۔ تاکہ سب لوگ اُن پر ایمان لے آتے اور عرب میں اسلام پھیلانے کا خدائی مقصد بغیر کسی سر درد کے پورا ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کے اُس دور میں مفسرین اور فقہا سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اگر یہ قضیہ سچا بھی ہے تو وہ اس کی یوں توجیہ کرتے کہ وہ آوازیں خود محمد کی اپنی روح کی آوازیں تھیں۔

یہاں ایک اور مشکل بھی پیش آتی ہے کہ اگر محمد تنہا باہر جاتے تھے اور اُنھیں وہ آوازیں سنائی دیتی تھیں تو دوسرے اس سے باخبر کیسے ہوئے؟۔ کیونکہ محمد نے کسی سے ایسی بات نہیں کہی اور اس سلسلے میں کوئی معتبر و مستند حدیث بھی نہیں ملتی۔ چنانچہ یہ کسی کی قوت متخیلہ کی کارستانی ہے جس نے معجزہ سازی کرتے ہوئے جعل سازی کا ارتکاب کیا ہے۔

ابن اسحاق نے جھوٹ نہیں بولا، یعنی اُن کا جھوٹ بولنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اُنھوں نے یقیناً یہ کہانی کسی سے سنی ہو گی اور ایک مؤمن ہونے کے ناطے اسے بلاچوں وچرا تسلیم کر لیا ہو گا۔ اُنھوں نے راوی سے کبھی نہیں پوچھا ہو گا اور نہ خود اس قضیے میں سنجیدگی دکھائی ہو گی کہ جب پتھر اور درخت سلام کرتے تھے تو وہاں تو کوئی اور موجود ہی نہیں ہوتا تھا اور حضور نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا تھا یا پھر کیا کوئی ایسا ثبوت ہے کہ پیغمبر نے خود ایسا کہا ہو؟۔ بعثت کے متعلق جو واقعہ ہے وہ صرف وہی ہے جو عائشہ کی روایت کردہ حدیث میں درج ہے، جس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

لیکن انسان اپنے عقائد اور جسمانی و روحانی خواہشات کا اسیر ہوتا ہے۔ جب انسان کی سوچنے کی صلاحیت پر تاریکی چھا جاتی ہے، تو وہ واضح انداز میں نہیں دیکھ سکتا۔ یوں وہ ہر اُس دلیل کو نظر انداز کر دیتا ہے جو

اُس کے عقیدے اور مادی و روحانی خواہشات و ضروریات سے متصادم ہو اور ہر اُس اشارے کو سچ گردانتا ہے جو اُس کی سوچوں اور آرزوؤں کو سچ ثابت کر سکے۔ توہمات و خرافات کی موجودگی کی اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہیں سکتی۔

بعثت کے بعد

دعوت اسلام کے آغاز کے وقت کا یقینی طور پر تعین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ سورت العلق کی پانچ آیات جو چالیس سال کی عمر میں محمد پر نازل ہوئیں اور وہ مبعوث ہوئے، اُس کے بعد وحی کچھ عرصہ کے لیے منقطع رہی۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ تک تبلیغ خفیہ انداز میں بھی ہوئی اور اسے مخصوص لوگوں تک محدود رکھا گیا۔ لیکن سورت العلق کے بعد جوں ہی ساتویں سے دسویں سورتیں نازل ہوئیں، تو لوگوں میں مخالفت، استہزا اور انکار ظاہر ہوا۔ جس کے نتیجے میں محمد میں تزلزل اور شک کی حالت نظر آتی ہے۔ بد قسمتی سے قرآن کی تدوین نہایت بد ذوقی اور بد نظمی سے کی گئی ہے۔ جس سے قرآن کا مطالعہ کرنے والے حیران ہوتے ہیں کہ قرآن کی تدوین کرتے وقت عمومی ترین اور منطقی ترین طریقہ کیوں نہیں اپنایا گیا؟۔ اور قرآن کو علی بن ابو طالب کے نسخے کے مطابق تدوین کیوں نہیں کیا گیا جسے تاریخ نزول کی مناسبت سے جمع کیا گیا تھا؟۔ اس سے قرآن زیادہ با معنی ہوتا اور بعد میں آنے والے لوگوں کو اسلام کے آغاز کی کیفیت، اسلام کی نشو و نما اور اس کے شارع کے طرز فکر اور روحانی سوچوں سے آشنائی ہوتی۔

قرآن کی تدوین کی وجہ عمر تھے جو ابو بکر کے پاس گئے اور اصرار کیا کہ قرآن کو جمع کر کے اس کی تدوین کی جائے۔ کیونکہ قرآن کے متن اور قرأت پر اختلاف بڑھ گئے تھے۔ اس کے علاوہ جنگ یمامہ میں بہت زیادہ صحابی مارے جا چکے تھے۔ اور جو قرآن درختوں کے پتوں پر لکھا ہوا تھا اسے جانور کھا گئے

تھے[54]۔ ابو بکر شروع میں اس تجویز کے مخالف تھے کہ اُن کے بقول اگر یہ ضروری ہوتا تو پیغمبر نے خود اپنی زندگی میں ایسا کیوں نہیں کیا۔ لیکن عمر کے اصرار سے وہ مجبور ہو گئے اور زید بن ثابت جو آخری کاتب وحی تھے اُنھیں قرآن جمع کرنے پر مأمور کیا۔ اس کے بعد خود عمر اور عثمان کی خلافت کے زمانے میں بھی زید اس کام پر مامور رہے۔ اور کچھ لوگوں کے تعاون سے قرآن کی اس انداز میں تنظیم کی گئی کہ بڑی اور چھوٹی سورتوں کو بنیاد بنایا گیا۔ اور بعض مّکی آیات کو مدنی سورتوں اور مدنی آیات کو مّکی سورتوں میں شامل کر دیا گیا۔

قرائن و تاریخی ریکارڈ، حوادث و واقعات اور آیات کے متن کی مدد سے مسلمان اور مغربی محققین (خصوصاً نولدیکے) قرآنی آیات اور سورتوں کی ترتیب و نزول کے وقت کو تقریباً طے کر چکے ہیں۔ بہر حال قرآن کی اولین مّکی سورتیں اسلام کے ابتدائی سالوں کی مشکلات سے متعلق کسی حد تک ہمیں معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ مثلاً سورۃ الضّحیٰ میں قسمیں کھانے کے بعد (آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات (کی تاریکی) جب چھا جائے) یوں فرمایا گیا ہے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى۔

(تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا، اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے، کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا

54: ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رجم کی آیت اور بڑی عمر کے آدمی کو دس بار دودھ پلا دینے کی آیت اتری، اور یہ دونوں آیتیں ایک کاغذ پہ لکھی ہوئی میرے بستر کے نیچے تھیں، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور ہم آپ کی وفات میں مشغول تھے ایک بکری آئی اور وہ کاغذ کھا گئی۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب رضاع الکبیر)

اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟، اور تمھیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی، اور تمھیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا)

ایسا کونسا واقعہ پیش آیا تھا کہ اللہ نے محمد کو تسلی دی اور حوصلہ بڑھایا؟۔ کیا یہ سورت وحی کے انقطاح کے بعد نازل ہوئی تھی؟ جس کی تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے "تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا"۔

اگر یہی صورت تھی اور جلالین نے بھی یوں ہی تفسیر کی ہے، تو اس سورت کو قرآن کی دوسری سورت ہونا چاہیے تھا۔ جب کہ تدوین کاروں نے اسے گیارہویں سورت قرار دیا ہے۔ شائد یہ آیات پیغمبر کی حوصلہ افزائی اور تزلزل کو دور کرنے کی خاطر نازل ہوئی تھیں۔ مخالفین کے انکار کے مقابلے میں فرمایا گیا ہے کہ تمھارے کام کا انجام آغاز سے بہتر ہوگا۔ خدا تمھیں اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے، کیا تم یتیم نہ تھے؟ کیا اس نے تمھیں پناہ نہیں دی؟۔ کیا تم گمراہ نہ تھے؟ تمھیں ہدایت دی۔ کیا تم نادار نہ تھے؟ تمھیں آسودہ کر دیا۔

اسی طرح سورت الشّرح جو اس کے بعد والی سورت قرار پائی اور ترتیب نزول کے حساب سے بارہویں سورت سمجھی جاتی ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، "اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ۔ وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ" (کیا ہم نے تمھارا سینہ کھول نہیں دیا، اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا)۔

اس سورت میں آخر تک تقریباً وہی مضمون ہے جو اس سے پہلی سورت میں ہے۔ اور اسے محمد کو نفسیاتی تقویت پہنچانے اور تزلزل دور کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اگر ہم حقیقت پسندانہ طور پر دیکھیں اور ان کے معانی کی نفسیات کے لحاظ سے توجیہ کریں تو یہ دونوں سورتیں محمد کی اندرونی دنیا سے آنے والی آوازیں اور ذاتی خواہشات تھیں۔

جب اسلام کی تبلیغ خفیہ انداز میں ہونے اور اسے مخصوص لوگوں تک محدود رکھنے کی مدت ختم ہوتی ہے تو خدا کا نیا حکم اور آیت نازل ہوتی ہے۔ "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ" (اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ: الشُّعَرَاء۔214)۔ محمد قریش کے رؤسا کو صفا کی پہاڑی پر آنے کی دعوت دیتے ہیں اور جب وہ سب وہاں جمع ہو جاتے ہیں تو انھیں اسلام قبول کرنے کو کہتے ہیں۔ درمیان ہی میں ابولہب اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور غصے سے کہتا ہے: "تبّاً لکَ یا مُحمد، اَلھذَا دَعَوتنا" (اے محمد تم تباہ ہو جاؤ، کیا تم نے ہمیں یہاں اس لئے بلایا ہے)

سورت المَسَد ابولہب کی اسی سخت بات کا جواب ہے۔ اور وہی لفظ "تَبّ" استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب تباہ ہو جانا اور نقصان پہنچنا ہے۔ "تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ" (ابولہب کے ہاتھ کٹ جائیں اور وہ برباد ہو)۔ اسے اپنی دولت اور بیٹوں پر ناز تھا۔ خدا فرماتا ہے "جب وہ آگ کی لپیٹ میں ہوگا تو اس کی دولت اور اولاد کسی کام نہیں آئے گی۔ اور اس کی بیوی اُمّ جمیل جو محمد کی راہوں پر کوڑا پھینکتی اور کانٹے بچھایا کرتی تھی وہ بھی آگ سے نہیں بچے گی۔ اور اس کی جورو جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے، اس کے گلے میں مونج کی رسّی ہوگی۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ۔ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ۔ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ۔ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ

بعثت کے بعد کے تیرہ سالوں کی تاریخ اور خصوصاً مکّی سورتوں کے جائزے سے ایک ایسے انسان کی رزمیہ داستان سامنے آتی ہے، جو تن تنہا پورے قبیلے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ ہر وسیلہ استعمال کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے کچھ ساتھیوں کو حبشہ بھیج کر نجاشی سے اپنے قوم کی سرکوبی میں مدد چاہتا ہے، اور مخالفین کے استہزا اور بدزبانی کو خاطر میں نہیں لاتا۔

عاص بن وائل نے حضور کو ان کے بیٹے قاسم کے مرنے کے بعد "اَلْاَبْتَرْ" اور "بلا نسل" ہونے کا طعنہ دیا تو ایک دم سے سورت الکوثر نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ فرماتا ہے۔ "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ" (تمھارا دشمن اور طعنے دینے والا ہی ابتر ہے)۔

حج کے دنوں میں جب قبائل کعبہ آتے ہیں تو محمد اُن کے رؤسا کے پاس جا کر اُنھیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں، تب اُن کا با اثر چچا ابو لہب بھی پیچھا کرتے وہیں پہنچ جاتا ہے اور محمد کے سامنے اُن لوگوں سے کہتا ہے "میرا یہ بھتیجا پاگل ہے، اس کی باتوں پر دھیان مت دو"۔

سورت الطُّور جو مکّی سورتوں میں سے فصیح ترین اور خوش آہنگ ترین سورت ہے۔ اس میں محمد کی اپنی قوم سے چپقلش کی کچھ جھلکیاں یوں بیان ہوئی ہیں۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ۔ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ۔۔۔۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۔ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ

(تو تم نصیحت کرتے رہو تم اپنے پروردگار کے فضل سے نہ تو کاہن ہو اور نہ دیوانے۔ کیا کافر کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، ہم اس کے حق میں زمانے کے حوادث کا انتظار کر رہے ہیں۔ کہہ دو کہ انتظار کیے جاؤ میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں: 29 تا 31۔۔۔۔۔۔ کیا کہتے ہیں کہ ان پیغمبر نے قرآن از خود بنا لیا ہے بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں رکھتے۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسا کلام بنا تو لائیں: 33-34)۔

سورت الفُرقان کی آیت 4-5-6-7-8 میں وہ الزامات بیان ہوئے ہیں جو محمد پر لگائے گئے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا۔ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ

فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا۔ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا

(اور کافر کہتے ہیں کہ یہ من گھڑت باتیں ہیں جو اس نے بنالی ہیں۔ اور لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی ہے۔ یہ لوگ ظلم اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جس کو اس نے لکھ رکھا ہے اور وہ صبح و شام اس کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ کہہ دو کہ اُس نے اس کو اُتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نازل نہیں کیا گیا اس کے پاس کوئی فرشتہ اس کے ساتھ ہدایت کرنے کو رہتا۔ یا اس کی طرف خزانہ اتارا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہوتا کہ اس میں کھایا کرتا۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک جادوزدہ شخص کی پیروی کرتے ہو)۔

کافروں کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا:

قرآن جھوٹ اور اختراع ہے۔ اس میں بیان کردہ واقعات کو دوسرے لوگ بتا کر مدد کرتے ہیں۔ کتنے بے انصاف لوگ ہیں! قرآن ماضی کی کہانیاں ہیں جو دوسرے اُس کے لیے لکھتے ہیں اور صبح سے شام تک وہ عبارت اسے سکھاتے ہیں۔ اُنھیں کہہ دو کہ جو زمین و آسمانوں کے بھید جانتا ہے وہ اِنھیں بھیجتا ہے۔

وہ کہتے ہیں: یہ کیسا پیغمبر ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازار بھی جاتا ہے۔ اگر سچ کہہ رہا ہے تو کیا بہتر نہ ہوتا کہ آسمان سے ایک فرشتہ آکر اس کی باتوں کی تصدیق کرتا۔ یا کم از کم اسے خزانہ لا دیتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس سے اسے روز کا کھانا مل جاتا اور اسے بازار جانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

مّکی سورتوں میں فراوانی سے چپقلش کا ذکر ملتا ہے۔ جو الزامات لگائے گئے وہ دیوانہ، جادوگر، آسیب زدہ، شیطان کا ساتھی ہونے کے ہیں۔ ان کے علاوہ کہا جاتا تھا کہ یہ سب باتیں اُسے دوسرے لوگ سکھاتے

ہیں۔ کیونکہ محمد خود تو پڑھنا جانتا ہے اور نہ لکھنا۔ جو لوگ نرم خو تھے، وہ کہتے تھے کہ یہ شخص وہمی، اپنے آشفتہ خوابوں کا اسیر اور شاعر ہے جو اپنے خوابوں اور سوچوں کو مسجع نثر میں پیش کرتا ہے۔

لیکن مکّی سورتوں میں کبھی ہمیں ایسی آیات بھی ملتی ہیں جو اس مسلسل چپقلش سے ہٹی ہوئی ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور پر مایوسی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اور اُن کی قوت مقابلہ میں ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ اور اُن میں مخالفین سے سمجھوتے کی خواہش نظر آتی ہے۔ تاکہ دوستی اور صلح کرنے سے وہ مشرکین سے کسی قسم کی رعایت حاصل کر سکیں۔ سورت الإسرَاء کی آیات 73 تا 75 میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

وَاِنۡ کَادُوۡا لَیَفۡتِنُوۡنَکَ عَنِ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ لِتَفۡتَرِیَ عَلَیۡنَا غَیۡرَہٗ ۔ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡکَ خَلِیۡلًا ۔ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡہِمۡ شَیۡـًٔا قَلِیۡلًا ۔ اِذًا لَّاَذَقۡنٰکَ ضِعۡفَ الۡحَیٰوۃِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیۡنَا نَصِیۡرًا ۔

(اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے اس چیز سے بہکا دیں جو ہم نے تجھ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے تاکہ تو اس کے سوا ہم پر بہتان باندھنے لگو اور پھر تجھے اپنا دوست بنا لیں، اور اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ تھوڑا سا اُن کی طرف جھکنے کے قریب تھا، اس وقت ہم تجھے زندگی میں اور موت کے بعد دہرا عذاب چکھاتے پھر تو اپنے واسطے ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتا)۔

ان تینوں آیات کا مفہوم ہمیں تفکر اور سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر سے کہہ رہے ہیں: وہ قریب تھے کہ تجھے اس چیز سے بہکا دیں جو ہم نے تجھ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے اور پھر وہ تمھارے دوست بن جاتے۔ اور ہم نے تمھیں اس لغزش سے روکا ورنہ تم نے اپنے لیے دنیا اور آخرت میں عذاب کا سامان پیدا کر لیا تھا۔

کیا یہ سچ ہے کہ محمد پر ایسا وقت آیا تھا کہ وہ قریش کی مخالفت و مخاصمت سے تھک گئے جس کے نتیجے میں اُنھوں نے قریش سے دوستی و مفاہمت کرنے کے متعلق سوچنا شروع کیا؟۔

شائد یہ انسانی فطرت ہے کہ دشواریوں اور ناامیدی کے نتیجے میں اُس کا ردعمل ایسا ہو۔ خصوصاً غرانیق کی کہانی کا ذکر سیرت کی بہت سی کتابوں اور روایات میں ملتا ہے۔ اور بعض مفسرین قران نے ان آیات کی شان نزول قضیہ غرانیق [55] کو ہی بتایا ہے۔

قضیہ غرانیق

کہتے ہیں کہ ایک دن کعبہ کے نزدیک حضرت محمد نے قریش کے لوگوں کے سامنے سورت النّجم پڑھی۔ یہ خوبصورت سورت جو پیغمبر کی قوت خطابت اور روحانی قوت کا مظہر ہے۔ جب وہ اپنی رسالت کے سچے ہونے کا دعویٰ کر رہے تھے تو فرشتہ ان کے پاس وحی لے کر آیا ہے۔ جسے بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے عربوں کے مشہور بتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

''اَفَرَاَیتُم اللاتَ وَالعُزّٰی وَمَنوۃَ الثَّالِثَۃَ الاُخریٰ'' [56]

سورت النجم کی آیت 19۔20 میں ان کی تحقیر کی گئی ہے کہ یہ ناکارہ ہیں۔

55: غرانیق: غرنوق کی جمع ہے، بگلا قسم کا کوئی پرندہ ہے، یہاں قریش کے مشہور بتوں کے متعلق ذکر ہے۔ قضیہ غرانیق کے موضوع پر ڈاکٹر محمود رامیار نے ''تاریخ قرآن'' کے عنوان اور ڈاکٹر سید محمد رضا جلالی نائینی نے ''تاریخ جمع قرآن کریم'' کے عنوان سے بہت قیمتی اور تحقیقی کتب تالیف کی ہیں۔

56: بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا، اور اس تیسری منات کو۔

ان دو آیات کے بعد دو دوسری آیات ہیں جن کو قرآن سے حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان دو آیات کو شیطان نے پیغمبر کے منہ سے جاری کیا تھا۔ اور پیغمبر ان کے ادا کرنے پر پشیمان ہوئے تھے۔ وہ دو آیات یہ ہیں۔

"تِلکَ غَرَانِیقُ العُلیٰ. فَسوفَ شَفَاعَتُھُنَّ لَتُرجَیٰ"[57]

وہ تینوں جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ بلند پرواز کونجیں ہیں اور ان تینوں کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے، اس کے بعد وہ سجدے میں چلے گئے، وہاں پر موجود قریش نے جب دیکھا کہ محمد نے ان کے بتوں کو احترام دیا ہے اور اُنھیں قابل شفاعت اور اُن کی وساطت کو تسلیم کیا ہے تو وہ بھی سجدے میں چلے گئے۔

جن لوگوں کے بقول پیغمبروں کا معصوم ہونا مسلّم ہے۔ وہ اس واقعے کو جھوٹا اور اصول کے خلاف پاتے ہیں۔ اُن کے بقول یہ کہانی لغو ہے اور وہ اس واقعے کا کلی طور پر انکار کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان دو جملوں کو قرآن سے حذف کیے جانے کو بھی رد کرتے ہیں۔ لیکن چند متواتر روایات اور کئی مفسرین کی تفسیر و تعبیر کے مطابق یہ واقعہ ہوا تھا۔[58]

57: وہ جلیل کونجیں ہیں اور یقیناً ان کی شفاعت بھی قبول کی جائے گی۔

58: تفسیر جلالین کے علاوہ تفسیر کی کئی اور پرانی کتابوں میں بھی اس واقعے کا ذکر ہوا ہے۔ اوپر دی گئی سورت الحج کی آیت 52 کی تفسیر کے سلسلے میں تفسیر ابن کثیر میں یوں درج ہے: "سورت النجم نازل ہوئی اور مشرکین کہہ رہے تھے کہ اگر یہ شخص ہمارے معبودوں کا اچھے لفظوں میں ذکر کرے تو ہم اسے اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیں۔ مگر اس کا تو یہ حال ہے کہ یہود و نصاریٰ اور جو لوگ اس کے دینی مخالف ہیں اُن سب سے زیادہ گالیوں اور برائی سے ہمارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے۔ اُس وقت حضور پر اور آپ کے اصحاب پر سخت مصائب توڑے جا رہے تھے۔ جب سورت نجم کی تلاوت آپ نے شروع کی اور وَلَهُ الْأُنثَىٰ تک پڑھا تو شیطان نے بتوں کا ذکر کرتے وقت یہ کلمات ڈال دیے۔ "وَاِنَّ شَفَاعَتَهَا لَتُرتَجٰی وَاِنَّهَا لَمَعَ الغُرَنِیقِ العُلیٰ" یہ شیطان کی مقفیٰ عبارت تھی۔ ہر مشرک کے دل میں یہ کلمے بیٹھ گئے اور ایک ایک کو یاد ہو گئے۔ یہاں تک مشہور ہو گیا کہ حضرت محمد نے سورت نجم کے خاتمے پر سجدہ کیا تو سارے مسلمان اور مشرکین بھی سجدے میں گر پڑے، ہاں ولید بن مغیرہ چونکہ بہت بوڑھا تھا اس لیے اُس نے ایک مٹھی مٹی کی بھر کر اونچی لے جا کر اُس کو اپنے ماتھے پر

تفسیر جلالین کے دونوں لکھنے والے جن کے اہل دین اور علما ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ انہوں نے سورت الحجّ کی آیت 50 کی شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ یہ خدا کی جانب سے ایک قسم کی تسلی تھی جو محمد کی اُس شدید ندامت کو دور کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی جو اُنھیں اُن دو جملوں کی ادائیگی پر ہوئی تھی۔ اور یہ ان کو سکون فراہم کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی۔ سورت الحجّ کی آیت 52 یوں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔

(اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی بھی ایسا رسول اور نبی نہیں بھیجا کہ جس نے جب کوئی تمنا کی ہو اور شیطان نے اس کی تمنا میں کچھ آمیزش نہ کی ہو پھر اللہ شیطان کی آمیزش کو دور کر کے اپنی آیتوں کو محفوظ کر دیتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے)۔

لگالیا۔ اب ہر ایک کو تعجب ہونے لگا کیونکہ حضور کے ساتھ دونوں فریق سجدے میں شامل تھے۔ مسلمانوں کو تعجب تھا کہ یہ لوگ ایمان تو لائے نہیں، یقین نہیں، پھر ہمارے ساتھ حضور کے سجدے پر سجدہ اُنھوں نے کیسے کیا۔ شیطان نے جو الفاظ مشرکوں کے کانوں میں جھونکے تھے وہ مسلمانوں نے سُنے ہی نہ تھے۔ ادھر ان کے دل خوش ہو رہے تھے کیونکہ شیطان نے اس طرح آواز میں آواز ملائی کہ مشرکین اس میں تمیز ہی نہیں کر سکتے تھے وہ تو سب کو اس یقین پر پکا کر چکا تھا کہ خود رسول اللہ نے اسی سورت کی ان دو آیتوں کو تلاوت فرمایا ہے۔ پس مشرکین کا سجدہ اپنے بتوں کو تھا۔ شیطان نے اس واقعہ کو اتنا پھیلا دیا کہ مہاجرین حبشہ کے کانوں میں بھی یہ خبر پہنچی۔ عثمان ابن مظعون اور اُن کے ساتھیوں نے جب یہ سنا کہ اہل مکّہ مسلمان ہو گئے ہیں بلکہ اُنھوں نے حضور کے ساتھ نماز پڑھی اور ولید بن مغیرہ سجدہ نہ کر سکا تو اُس نے مٹی کی ایک مٹھی اُٹھا کر اُس پر سر ٹکالیا۔ مسلمان اب پورے امن اور اطمینان سے ہیں تو اُنھوں نے وہاں سے واپسی کی ٹھانی اور خوشی خوشی مکے پہنچے۔ اُن کے پہنچنے سے پہلے شیطان کے ان الفاظ کی قلعی کھل چکی تھی۔ اللہ نے ان الفاظ کو ہٹا دیا تھا اور اپنے کلام کو مضبوط کر دیا۔ یہاں مشرکین کی آتش عداوت اور بھڑک اُٹھی تھی اور اُنھوں نے مسلمانوں پر نئے مصائب برسانے شروع کر دیے تھے"۔

چونکہ قرآن میں اس کی مثالیں موجود ہیں، اور پیغمبر کے بے خطا نہ ہونے کے واضح حوالے ملتے ہیں۔ اس وجہ سے بہت سے مسلمان علماء صرف رسالت کے پیغام کو خطا سے بالا قرار دیتے ہیں، یوں قضیے کی توجیہ آسان ہو جاتی ہے۔

محمد جو مخالفین کے عناد سے تھک چکے تھے۔ اُنھوں نے حاضرین کی خوشنودی اور صلح جوئی کی خاطر ایک دو جملے ایسے کہہ دیئے جن سے وہ رام ہو جائیں۔ اس کے علاوہ وہ تب بھی خوش ہوئے جب اُنھوں نے محمد کو سجدہ کرتے دیکھا۔ لیکن جوں ہی ہجوم منتشر ہوا، اور وہاں کوئی نہ رہا۔ تو اُن کی روح کی گہرائیوں سے آواز اٹھی کہ تیس سال تک وہ توحید کے ماننے والے تھے اور اپنے لوگوں کے شرک کو تاریکی اور پلیدی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اٹھتے ہیں اور اس رعایت دینے پر معافی مانگتے ہیں۔ اُسی وقت سورت الإسرَاء کی آیت 73 تا 75 نازل ہوتی ہے جو اس صورت حال پر مکمل طور پر منطبق ہوتی ہے۔

اگر ہم فرض کریں کہ وہاں جو بھی ہوا وہ ایک ناٹک تھا۔ یعنی پیغمبر قریشی مشرکین کو یہ سمجھانا چاہ رہے تھے کہ میں تو تم سے صلح اور مصالحت کے لیے آیا ہوں اور تم سے دوستی کی خاطر قدم اٹھایا ہے، لیکن مجھے خدا نے منع کر دیا ہے۔ لیکن محمد جو اپنی صداقت، استقامت اور امانت کی وجہ سے معروف تھے، یہ احتمال ان کی ہستی سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔

ظہور اسلام کا ماحول

مذہب اپنے حقیقی معنوں میں کبھی بھی عرب بدوؤں کے ہاں جڑ نہیں پکڑ سکا۔ اُنھیں آج بھی مذہب کے روحانی یا مافوق الطبیعات پہلوؤں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

یہ غریب لوگ ایک خشک اور بے برکت زمین پر رہتے تھے۔ سوائے چند ایک عادات ورسوم کے ان کے ہاں کوئی بھی اجتماعی نظام موجود نہ تھا۔ مزاج کے حوالے سے غیر مستحکم اور جلد بازی ان کا خاصہ تھا۔ کسی ایک شعر کی وجہ سے خوشی میں جھوم جھوم جاتے اور کسی دوسرے شعر کی وجہ سے ناراضگی اور دشمنی پر اتر آتے۔ خود غرضی اور غرور کی انتہا یہ تھی کہ اپنی ہر بات حتیٰ کہ اپنی کمزوریوں، جرائم اور تشدد کی داستانوں کو بھی فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ جاہلیت اور توہم پرستی کی حد یہ تھی کہ اِنھیں ہر پتھر کے پیچھے شیطان یا جنات کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

اپنی زمین کے بنجرپن کی وجہ سے زراعت جو کہ انسانی تمدن کی بنیاد ہے، سے نفرت کرتے تھے۔ گائے کی دُم کو بدنامی اور گھوڑے کی پیشانی کو عزت کا نشان سمجھتے تھے۔ اپنی اہم اور فوری ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ اُن کا کوئی اور ہدف نہیں تھا۔ بتوں کو پسند کرنے اور پرستش کا مقصد بھی اُنھی مقاصد کے حصول میں مدد طلب کرنا تھا۔ دوسروں پر حملہ کر کے لوٹ لینا قابل قبول اور عام سی بات تھی بشرطیکہ وہ غیر مسلح ہو یا اپنے دفاع کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔

دوسروں کی حق تلفی کو فخریہ کارنامہ سمجھتے اور اُس واقعے کو شعروں میں سراہتے تھے۔ اگر کسی دوسرے کی بیوی کو چھین لیتے تو اسے شیوہ جوانمردی تصور کرتے۔ اُس عورت کے اسرار و رموز کو آشکار کر کے رسوا کرتے اور اس کے جسم کے مختلف حصوں کا ذکر شاعری میں کرتے۔

یہ لوگ خدا کو ایک رسمی چیز سمجھتے تھے اور اس کے معروضی وجود کے اتنے زیادہ قائل نہیں تھے۔ اگر کسی قبیلے کے پاس کوئی معروف بُت ہوتا تو رقابت میں آکر اس کے مقابلے میں اپنا بُت تخلیق کر کے اس کی حمد و ثنا شروع کر دیتے۔ کعبہ ایک بہت بڑا بُت خانہ اور عرب قبائل کا قبلہ تھا۔ چنانچہ اسے ایک قابل احترام اور مقدس حیثیت گھر کی حیثیت حاصل تھی۔ قبیلہ جہینہ کے عبد الدار بن حدیب نے اپنے قبیلے والوں کے سامنے تجویز رکھی کہ کعبہ کے مقابلے پر حوراء کے علاقے میں ایک بت خانہ تعمیر کیا جائے تاکہ کعبہ جانے والے عرب قبائل ان کے ہاں آئیں۔ لیکن جب قبیلے والوں نے خطیر اخراجات کی وجہ سے اقدام کی حمایت نہ کی۔ تو اُس نے اُن کی ہجو لکھی۔[59]

"تنکیس الاصنام" میں ہی ایک روایت درج ہے جو عربوں کی ذہنیت کو بہت اچھے انداز میں آشکار کرتی ہے۔

ابرہہ نے صنعاء کے مقام پر پتھروں اور قیمتی لکڑی سے قلیس نامی کلیسا بنایا اور اس نے کہا کہ میں عربوں کو تب تک نہیں چھوڑوں گا جب تک وہ کعبہ چھوڑ کر یہاں نہ آئیں۔ تو ایک عرب سردار نے چند آدمیوں کو یمن بھیجا کہ وہ رات کے وقت قلیس کے اندر جا کر پاخانہ کر دیں۔ ایک آدمی کا باپ قتل ہو گیا۔ باپ کے قتل کا بدلہ لینے سے پہلے وہ ذوالخلصہ نامی بُت کے پاس گیا۔ تیر کے ذریعے فال نکال کر اس نے جاننا چاہا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا پیچھا کرے یا نہ کرے؟۔ اتفاق سے بُری فال نکلی یعنی ذوالخلصہ نے اُس کا پیچھا کرنے اور اس کام سے منع کیا۔ تو اُس نے ذوالخلصہ کی طرف پشت کر دی اور کہا: "جیسے میرا باپ مرا ہے اگر اس طرح تمہارا باپ مرا ہوتا تو تم مجھے باپ کا بدلہ نہ لینے کا حکم نہ دیتے"۔

59: یہ واقعہ ہشام بن محمد کلبی کی مستند و معتبر کتاب "تنکیس الاصنام" سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں عربوں کے مذہبی عقائد اور رسوم کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان کنت یا ذو الخلصہ الموتورا

مثلی و کان شیخک المقبورا

لسم تنہ عن قتل العداۃ زورا[60]

اگر دیگر قدیم اقوام سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش کر رہی تھیں۔ تو عرب بدّو پتھروں پر فدا تھے اور اُن کے گرد طواف کیا کرتے تھے۔ سفر کے دوران جب بھی کہیں پڑاؤ ڈالا جاتا تو عرب سب سے پہلے چار پتھر تلاش کرتے۔ اُن پتھروں میں سے سب سے خوب صورت پتھر کے گرد طواف کرتے اور باقی تین پتھروں سے چولھا بنا کر ہانڈی چڑھا دی جاتی۔ بکری، بھیڑ اور اونٹ کو پتھر کے نزدیک اس انداز سے قربان کیا جاتا کہ اُس کا خون پتھر کو رنگین کر دے۔

تنکیس الاصنام کی ایک اور روایت کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہو گا۔ جس سے اس بات کہ نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ بت پرستی میں بھی اتنے زیادہ سنجیدہ نہ تھے۔ بلکہ ان کی بت پرستی کی وجہ اوہام اور نادانی تھی۔

ایک عرب برکت کے حصول کی خاطر اپنے اونٹوں کو سعد نامی بت کے پاس لے کر آیا۔ تمام اونٹ اُس پتھر جو قربانیوں کے خون سے رنگا ہوا تھا، سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ غصے میں آ کر اُس عرب نے سعد کے سر پر پتھر مارنا شروع کر دیے اور بد دعا دی: "تم لوگوں کی حمد و ثنا کی برکت سے محروم ہو جاؤ"۔ یہ اشعار اسی واقعہ کی یادگار ہیں۔

آتینا الی سعد لیجمع شملنا

فشتتنا سعد فلا نحن من سعد

60: اے ذوالخلصہ اگر تم پر وہ گزرتی جو مجھ پر گزری ہے، اگر تمہارا باپ اس وقت میرے باپ کی طرح قتل ہوتا اور قبر میں سویا ہوتا تو تم مجھے قتل کا بدلہ لینے سے منع نہ کرتے۔

وھل سعد الاخصرہ بتنوفة

من الارض لایدعی لغی ولارشد

(ہم سعد کے پاس آئے کہ ہمیں انتشار سے نجات ملے اور اس نے ہمیں منتشر کر دیا۔ سعد ویرانے میں پڑے پتھر کے ایک ٹکڑے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جو نہ کسی کو ہدایت دے سکتا ہے اور نہ گمراہ کر سکتا ہے)۔

عربوں کی یہ قومی خصوصیت ہجرت کے بعد کے ابتدائی سالوں میں ہمیں بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اردگرد کے قبائل ڈر یا مال غنیمت کی امید پر مسلمانوں کے قریب آتے ہیں۔ لیکن احد کی جنگ میں شکست کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں سے دور ہو گئے بلکہ مسلمانوں کے مخالفین سے جا کر مل گئے۔

محمد ان کی فطرت اور روش سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لئے ہمیں بار بار ایسی آیات پڑھنے کو ملتی ہیں جن کا یہی موضوع ہے۔ خصوصاً سورت التّوبۃ جو نزول کے حساب سے قرآن کی آخری سورت ہے اور اسے پیغمبر کا وصیت نامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ آیت نمبر 97 اور 101 کو پڑھا جائے جن میں ایک واضح طور پر اُنھی کے متعلق کہہ رہی ہے۔

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ

(یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان احکام سے ناواقف ہوں جو اللہ نے نازل فرمائے ہیں)

یعنی ہر دوسری قوم کے مقابلے میں ان کے ہاں کفر اور نفاق کا زیادہ ہونا بتایا گیا ہے اور ان میں ایسا رویہ نہیں ہے کہ ہمیشہ خدا کے اصولوں پر کاربند رہیں۔

اور اسی وجہ سے آرزو کرتے ہیں کہ قرآن کسی غیر عرب پر نازل ہوا ہوتا۔ ''وَلَو نَزَّلناہُ عَلی بَعضِ الاعَجَمینَ ''۔ (اور اگر ہم اسے کسی عجمی پر نازل کرتے: سورت الشُّعَرَاء۔198)۔

عرب بدوؤں کے ہاں اوہام و خرافات کا عالم یہ تھا کہ ان کی روزانہ پرستش بھی روزمرہ کی فوری ضروریات اور حاجات کے گرد گھومتی تھی۔ لیکن حجاز اور خصوصی طور پر اس کے دو شہروں کا حال ایسا نہ تھا۔ ان دو شہروں کے باسی اور خصوصی طور پر یثرب میں مقیم لوگ یہودیوں کے عقائد سے متاثر تھے۔ ان کے ہاں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی اولاد سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل اور تورات کی روایات سے کم و بیش سبھی آگاہ تھے۔ آدم اور شیطان کے قصے سے بھی اِنھیں واقفیت تھی۔ وہ فرشتوں کے وجود کے بھی قائل تھے گو ان کے نزدیک فرشتے اللہ کی بیٹیاں تھیں۔ قرآن نے کئی بار اس باطل عقیدے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

''اَلکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الاُنثی ''(کیا تمہارے لئے تو بیٹے اور خدا کے لئے بیٹیاں: النّجم۔21)

اس کے علاوہ یہودیوں کی کئی مذہبی رسوم جیسے ختنہ، غسل جنابت، حیض کے دنوں میں عورت سے دور رہنا اور ہفتے کے مقابلے میں جمعہ کی تعطیل ان کے ہاں معمول کا حصہ تھیں۔

یوں اسلام کی دعوت حجاز کے لیے بالکل نئی بات نہیں تھی اور نہ ہی معاشرے کی اکثریت کلی طور پر اس سے ناواقف تھی۔ اس کے علاوہ وہاں روشن دماغ لوگ بھی تھے جنہیں حنیف کہا جاتا تھا جو بت پرستی سے اجتناب کرتے تھے۔ بلکہ کچھ بت پرستوں کے ذہنوں میں بھی ایک کمزور سی شمع جھلملا رہی تھی۔ جسے قرآن میں کئی بار یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَلَئِن سَألتَھُم مَن خَلَقَھُم لیَقُولَنَّ اللہُ۔ (اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو کہہ دیں گے کہ اللہ نے: الزّخرُف۔87)۔

وَلَئِن سَئَلتَھُم مَن خَلَقَ السَّموَاتِ وَالارضَ وَسَخَّرَ الشَّمسَ وَالقَمَرَ لَیَقُولُنَ اللہُ فَاَنّٰی یُؤفَکُونَ

(اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنائے آسمان اور زمین اور کام میں لگائے سورج اور چاند تو ضرور کہیں گے اللہ نے، تو کہاں اوندھے جاتے ہیں: العنکبوت۔61)

دونوں آیات میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کس نے دنیا تخلیق کی اور کس نے سورج اور چاند کو کام پر لگایا ہوا ہے، کہیں گے اللہ نے۔

مشرکین اپنے بتوں کو خدا کی روحانی قوت کا اشارہ اور اس کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اس کے متعلق سورت الزّمَر کی آیت 3 میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ما نَعبُدُ ھُم اِلاّلِیُقَرِبُونا اُلی اللہَ زُلفی۔(ہم اِن کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں)۔

اس کے باوجود مکّہ میں اسلام نشو و نما نہ پا سکا۔ محمد کی تیرہ سالہ مسلسل دعوت اسلام اور مکّہ میں معجزاتی آیات کا نزول بھی بار آور نہ ہو سکا۔ اندازے کے مطابق صدی کے آخر تک اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد سو سے زیادہ نہ تھی۔

محمد کی تیرہ سالہ شب و روز کی محنت قریش کی ہٹ دھرمی اور عناد کو توڑنے میں ناکام رہی۔ اس دوران اسلام قبول کرنے والوں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ابو بکر، عمر بن خطاب، حمزہ بن عبد المطلب، عبد الرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ شامل تھے۔ اور ان کے علاوہ اسلام قبول کرنے والے نچلے اور غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جن کی حجازی معاشرے میں کوئی حیثیت یا مقام نہیں تھا۔

ورقہ بن نوفل نے رسمی طور پر خود اسلام قبول نہ کیا لیکن محمد کی حمایت کی اور اُنھیں مشورہ دیا کہ ابو بکر کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دو۔ اور چونکہ وہ بہت معزز انسان ہے، اُس کے اسلام قبول کرنے سے

دعوت اسلام پر اچھا اثر پڑے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ یعنی اُن کے اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں عثمان بن عفان، عبد الرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص اور زبیر بن عوام مسلمان ہوئے۔

اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں محمد کی حد درجہ استقامت اور پائیداری بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اُن کی ثابت قدمی اور استواری یوں ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی چیز بھی اُنھیں اسلام کی دعوت سے نہ روک سکی۔ نہ وعدہ نہ وعید، نہ تمسخر نہ استہزا اور نہ کمزور ساتھیوں پر ہونے والا ظلم۔ اس کے علاوہ محمد ایک چارہ جُو انسان تھے چنانچہ اُنھوں نے ہر وسیلہ استعمال کیا۔ بعثت کے پانچویں سال اپنے ساتھیوں کو حبشہ کے حکمران کے پاس اس امید پر بھیجا کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ حبشہ کا حکمران خدا پرست اور مسیحی تھا۔ اس لیے ضروری ہو گا کہ وہ اُن لوگوں کی مدد کرے، جو بت پرستی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

اس بات نے قریش کو فکر مند کر دیا۔ اور اُنھوں نے اپنے چند آدمیوں کو نجاشی کے ہاں تحائف کے ساتھ اس امید پر روانہ کیا۔ کہ وہ ان مہاجروں کی باتوں پر کان نہ دھرے، اور اس کی بجائے مسلمانوں کو منحرف و مجرم گردانے۔

شائد آغاز میں قریش نے دعوت اسلام کو زیادہ اہمیت نہ دی اور محمد کی تحقیر، تمسخر اور استہزا پر ہی اکتفا کیا۔ اور اُنھیں دیوانہ، شاعر، یاوہ گو، جھوٹا، کاہن اور شیطان کے زیر اثر کہتے رہے۔ لیکن محمد کی تبلیغ میں ثابت قدمی کے نتیجے میں چند معزز اور اہم لوگوں کے مسلمان ہونے سے وہ فکر مند ہو گئے۔

محمد کے ساتھ قریش کے روز بروز بڑھتے عناد و مخالفت کی وجہ واضح تھی۔ رؤسائے قریش کا خیال تھا، اور وہ اس میں وہ برحق بھی تھے کہ اگر محمد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اُن کی روزی کا وسیلہ خطرے میں پڑ جائے گا۔

کعبہ عرب قبائل کی زیارت گاہ تھی۔ ہر سال ہزاروں لوگ وہاں آتے تھے۔ شاعر اور شعلہ بیان مقرر اکٹھے ہوتے۔ پورے شہر میں ایک میلے کا ساسماں ہوتا تھا۔ جزیرہ عرب کے لوگ آکر خرید و فروخت کرتے۔ مزید بر آں مکّہ کے لوگوں کی روزی اور رؤسائے قریش کی شان و شوکت کا انحصار ان بدوؤں کی آمد پر تھا۔ عربی بدّو کعبہ کے بتوں کی زیارت کیلئے مکّہ آتے تھے۔

اگر نئے مذہب کی وجہ سے کعبے سے بتوں کو ہٹادیا جاتا تو کسی نے بھی کعبہ کا رخ نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ پندرہ سولہ سالوں بعد جب اسلام نے قوت پکڑی اور دسویں ہجری میں مکّہ فتح ہوااور واضح قرآنی آیت کے مطابق پیغمبر نے خانہ کعبہ میں مشرکین کا داخلہ بند کر دیا تو مسلمان بھی اپنی روزی کیلئے فکر مند ہوئے۔ جن کی پریشانی دور کرنے کیلئے سورت التّوبَة کی آیت نمبر 28 سال نازل ہوئی۔

"اِن خِفتُم عَیلَۃً فَسَوفَ یُغنِیکُمُ اللہُ مِن فَضلِہٖ "(اور اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو تو خدا چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا)۔

جب محمد کو اپنی تبلیغ سے ہٹانے میں قریش کو مایوسی کا سامنا ہوا، اور خصوصاً اُنھیں دعوت اسلام سے لاحق خطرات کا احساس ہوا تو رؤسائے قریش نے مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرنے کی روش اختیار کی۔ وہ سب سے پہلے ابو طالب جو اپنے لوگوں میں عمر رسیدہ تھے، کے پاس یہ سوچ کر گئے کہ اُن کی بات بھتیجے پر اثر کرے گی۔ اور اُنھیں کہا کہ وہ محمد کو اس کام سے روکیں اور اس کے عوض وہ محمد کو خانہ کعبہ میں کوئی منصب اور مقام دے دیں گے۔

جب ابو طالب اپنے بھتیجے کو اپنی دعوت سے باز رکھنے میں ناکام ہوئے، تو تمام قریش نے فیصلہ کیا کہ کوئی بھی بنو ہاشم کے ساتھ تعلق نہیں رکھے گا۔ کچھ عرصہ تک اُنھوں نے بہت تکلیف میں وقت گزارا، تا آنکہ چند آدمیوں کی عربی حمیت نے جوش مارا، اور وہ بنی ہاشم کو اس حالت سے باہر لائے۔ اس واقعہ کے

بعد اور خصوصاً ابو طالب کی موت کے بعد جب محمد کو اپنے مقصد سے ہٹانے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ تو اُنھوں نے انتہائی قدم اٹھانے حربہ کا فیصلہ کیا۔

قید کر دیا جائے، جلا وطن کیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ ان تین تجاویز میں سے کافی بحث کے بعد قتل کرنے کو دانش مندانہ ترین فیصلے کے طور پر قبول کر لیا گیا، اور ضروری سمجھا گیا کہ سب لوگوں کے ہاتھ اس خون میں رنگے ہو تا کہ بنو ہاشم کسی ایک قبیلے سے انتقام نہ لے سکیں۔ یہ فیصلہ بعثت کے بارہویں یا تیرہویں سال ہوا تھا، جو پیغمبر کے مدینہ ہجرت کا سبب بنا۔

معجزہ

ایک ایرانی کے نزدیک اُس کے ہر در و دیوار سے معجزات کی بارش ہوتی ہے اور ہر امام زادہ خواہ اُس کا نسب کتنا ہی مشکوک کیوں نہ ہو، وہ مسلسل معجزات برپا کرتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کا جائزہ لیتے وقت ہمیں بہت حیرانی ہوتی ہے کہ وہاں معجزے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

شائد قرآن میں بیس سے زائد بار ذکر ہوا ہے کہ جب بھی منکرین نے محمد سے معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا تو یا تو وہ خاموش رہے یا اُنھوں نے یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ میں بھی تمھاری طرح ایک عام انسان ہوں جسے تمھیں اور اپنوں کو پیغام رسانی کا فریضہ تفویض ہوا ہے۔ اور فرمایا: میں مبشّر (بشارت دینے والا) اور مُنذِر (تنبیہ کرنے والا) ہوں۔ اس موضوع پر سورت الإسراء کی 91-93 آیات بہت واضح ہیں۔

وَقالُوا لَن نُؤمِنَ لکَ حَتّی تَفُجر لَنا مِنَ الاَرضِ یَنبُوعاً۔ اَو تَکُونَ لکَ جَنَۃٌ مِن نَخیل وَ عِنب فَتُفَجِّرَ الاَنهار خِلالَها تَفجیراً۔ اَو تُسقِطَ السَماءَ کَما زَعَمتَ عَلَینا کِسَفاً اَو تَأتِيَ بِاللّٰہِ وَ المَلائِکَہ قَبیلاً۔ اَو یَکُونَ لکَ بَیتٌ مِن زُخرُفٍ اَو تَرقیٰ فِي السَماءِ وَلَن نُؤمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّی تُنَزِّلَ عَلَینا کِتاباً نَقرُؤہُ قُل سُبحانَ رَبِّی هَل کُنتُ اِلاّ بَشَراً رَسُولاً

(اور کہنے لگے کہ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری کر دو، یا تمہارا کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو، یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان کے ٹکڑے لا گراؤ یا خدا اور فرشتوں کو سامنے لاؤ، یا تو تمہارا سونے کا گھر ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ۔ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک کہ کوئی کتاب نہ لاؤ جسے ہم پڑھ بھی لیں۔ کہہ دو کہ میرا پروردگار پاک ہے میں تو صرف ایک پیغام پہنچانے والا انسان ہوں)۔

ان تین آیات کے فوراً بعد منکرین کے تقاضوں پر تعجب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَن یُّؤمِنُوا اِذ جَاءَ ھُمُ الھُدٰی اِلَّا اَن قَالُوا اَبَعَثَ اللہُ بَشَراً رَّسُولاً۔ قُل لَو کَانَ فِی الاَرضِ مَلاَئِکَۃٌ یَّمشُونَ مُطمَئِنِّینَ لَنَزَّلنَا عَلَیھِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَکاً رَّسُولاً

(اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر کر کے بھیجا ہے، کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے چلتے پھرتے تو ہم اُن کے پاس فرشتے کو پیغمبر بنا کر بھیجتے: الإسرَاء۔94)

یہ دونوں آیات واضح اور منطقی ہیں۔ وہ انسان جو اُنھی لوگوں میں پیدا ہوا۔ اُن سے بہتر سوچتا تھا، اُن سے زیادہ واضح دیکھتا تھا۔ اُن کی خرافات و اوہام کے باطل ہونے کی طرف اشارہ کرتا تھا، اور اُن کی مضر اور خلاف انسانیت عادات کی نفی کرتا تھا۔ اُس کی سچی اور واضح باتوں کو کسی عذر کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اُن کے مخالفت اور حیلہ گیری کی وجوہات بھی واضح تھیں۔ لوگ اپنی مضحکہ خیز اور جاہلانہ عادات کے عادی تھے جو بچپن کی تلقین کے نتیجے میں اُن میں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ بیسیوں صدی جسے عقل و روشنی کی صدی کا نام دیا جاتا ہے۔ کیا اب بھی ویسا ہی نہیں ہے جہاں لاکھوں لوگوں نے اپنی عقل کو تلقینی عقائد و عادات کے تابع رکھا ہوا ہے؟۔

اُن وقتوں میں لوگوں کا ایک ایسے انسان کی پیروی سے شروع میں انکار کرنا جو اُنھیں اپنے اجداد کی عادات و عقائد کو چھوڑنے کا کہہ رہا ہو، ایک قابل فہم بات ہے۔ اور اگر وہ آدمی یہ دعویٰ کرے کہ میں خدا کی طرف سے بھیجی گئی باتیں بتا رہا ہوں، تو وہ اس کا ثبوت تو مانگیں گے، جب کہ خود یہ شخص پہلے پیغمبروں کے مختلف معجزات کا قائل تھا اور اُنھیں وہ قصے سنا چکا تھا جو اُس نے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے اُن کے نبیوں کے متعلق سنے تھے۔ فارسی کی مشہور مثل ہے "بادِ سرد نشانِ زمستان

است "[61](ٹھنڈی ہوا سردیوں کی علامت ہوتی ہے)۔ لہٰذا اب وقت آ چکا تھا کہ کوئی معجزہ دکھایا جائے۔ قریشی کسی ایسے شخص کی پیروی کے لیے تیار نہ تھے جو اُنھی جیسا تھا۔ اور وہ یوں کہتے تھے۔

وَقالُو ماھٰذَا الرَّسُولِ یَاکُلَ الطَّامَ وَیَمشی فِیْ الاسواقِ لَولا اَنزِلَ اَلیہُ مَلک فَیکُونَ مَعَہُ نَذِیْرًا۔ اَو یُلقی اَلیہِ کَنزٌ اَو تکُوْنَ لہُ جَنَّۃٌ یَاکُل مِنھا وَقالَ الظّالِمُونَ اِن تَتَّبِعُنَ اِلاّ رَجُلاً مَّسحُوْرًا

(اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نازل نہیں کیا گیا اس کے پاس کوئی فرشتہ اس کے ساتھ ہدایت کرنے کو رہتا یا اس کی طرف (آسمان سے) خزانہ اتارا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہوتا کہ اس میں کھایا کرتا۔ اور ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک جادو زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو: الفُرقان۔ 8،7)۔

گویا اُن کے نزدیک بازار جانا اور کھانا مقام نبوت کے خلاف تھا۔ شائد وہ توقع کر رہے تھے کہ نبی کو دوسرے انسانوں کی طرح نہیں ہونا چاہیے اور اسے کھانے اور پینے کی حاجت نہیں ہونی چاہیے۔ اسی سادہ لوحی کی وجہ سے وہ ایسی باتیں کرتے تھے۔

ان تقاضوں اور حیلہ جوئی کے مقابلے میں پیغمبر نے جواب نہیں دیا اور معجزات کے تقاضے پر بھی خاموشی اختیار کی۔ لیکن بعد کی آیات میں اُن کے اعتراضات کا خدا کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے۔

وَما أَرسَلنا قَبلَكَ مِنَ المُرسَلينَ إِلّا إِنَّهُم لَيَأكُلونَ الطَّعامَ وَيَمشونَ فِي الأَسواقِ

61: جیسے ٹھنڈی ہوائیں موسم سرما کی علامت ہوتی ہیں، اسی طرح کوئی انسان اگر غیر فطری واقعہ یا معجزہ برپا کر پائے تو وہ معجزہ اُس کے نبی ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔ انگریزی ترجمے میں اس کہاوت کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے: "دوسروں کی قابلیت کی تعریف اپنی نااہلیت کا اعتراف ہوتا ہے"۔

(اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے: الفُرقان۔20)۔

سورت الحِجر کی آیت 6 اور 7 میں اس قضیے کی تکرار ہوتی ہے۔ منکرین کا واضح انداز میں کہنا تھا کہ یہ جو سوچتا ہے کہ قرآن اس پر نازل ہوا ہے، یہ پاگل ہے، اگر سچ کہتا ہے تو فرشتے کو سامنے لائے۔

قالُوا یا ایُّھَا الّذی نُزِّل علَیہِ الذِکرُ اِنّکَ لمجنُون. لو ماتَأتِینا بالملائِکہِ اِن کُنتَ مِنَ الصّادِقین

(اور کہتے ہیں اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے بے شک تو مجنون ہے۔ اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے)

سورت الأنبیاء کی اولین آیات میں ان مطالب کی تکرار ہوتی ہے۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ

(یہ تمھاری طرح ایک انسان ہی تو ہے پھر کیا تم دیدہ دانستہ جادو کی باتیں سنتے جاتے ہو۔ بلکہ کہتے ہیں کہ یہ بیہودہ خواب ہیں بلکہ اس نے جھوٹ بنایا ہے بلکہ وہ شاعر ہے پھر چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جس طرح پہلے پیغمبر بھیجے گئے تھے: آیت 3 اور 5)

پیغمبر نے ان کو جواب میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ خداوند فرماتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ

(اور ہم نے تم سے پہلے بھی تو آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا ان کی طرف ہم وحی بھیجا کرتے تھے اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اور ہم نے اُن کے ایسے بدن بھی نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے: الأنبیاء۔ 7،8)

مجموعی طور پچیس سے زائد بار مکّی سورتوں میں اس حیلہ جوئی اور معجزہ دکھانے کے تقاضے کا ذکر ہے اور ان تقاضوں کے جواب میں پیغمبر نے یا تو خاموشی اختیار کی یا واضح طور فرمایا کہ میں تم جیسا ہی ایک انسان ہوں، مجھے خدا کی طرف سے وحی اور الہام ہوتا ہے۔

سورت یُونس کی آیت نمبر 20 انہی معنوں سے متعلق ہے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ

(اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی۔ کہہ دو کہ غیب کا علم تو خدا کو ہے سو تم انتظار کرو۔ میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں)۔

اور سورت الرّعد کی آیت نمبر 7 میں بھی دوبارہ اسی بات کی تکرار ہے کہ پیغمبر صرف اس پیغام کو پہنچاتا ہے جو اسے دیا گیا ہے لیکن نشانی کیوں نازل نہیں ہوتی کا جواب نہیں دیا گیا۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ

(اور کافر کہتے ہیں اس کے رب سے اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتری تم تو محض ڈرانے والے ہوں اور ہر قوم کے لیے ایک رہبر ہوتا آیا ہے)۔

یعنی کافر کہتے ہیں کہ اس کی گفتار کی سچائی کا کوئی اشارہ رب کی طرف سے ظاہر کیوں نہیں ہوتا؟۔ یہاں خدا فرماتا ہے کہ تم صرف انتباہ کرتے ہو اور ہر قوم کا ایک پیشوا ہوتا ہے۔ یعنی تمھارا کام پیغام پہنچانا ہے، معجزے دکھانا تمھارا کام نہیں ہے۔

مشرکین کے اعتراض میں پیغمبر کا یہ جواب دینا کہ میں مبشر و منذر ہوں گویا اس بات کا اعتراف تھا کہ معجزہ صرف خداوند کی ذات سے مخصوص ہے۔ دوسری جگہ پر اس بات کی تکرار ہوتی ہے کہ پیغمبر قرآن کو اپنا معجزہ قرار دیتے ہیں۔

وَقالُو لَولا اُنزِلَ عَلَیهِ آیاتُ مِن قُل اِنّمَا الایاتُ عِندَاللّٰهِ وَاِنّمَا اَنَانَذیرُ مُبِینُ

(اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں کہہ دو کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔ اور میں تو کھلم کھلا ہدایت کرنے والا ہوں: العَنکبوت۔50)۔

لیکن اس کے بعد خداوند اسی سورت کی اگلی آیت میں فرماتے ہیں۔

اوَلَم یَکفِهِم اَنّا اَنزَلنا عَلَیکَ الکِتابَ یُتلی عَلَیهِم اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَرَحمَةً وَذِکری لِقَومِ یُؤمِنُونَ

(کیا اُن لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ مؤمن لوگوں کے لیے اس میں رحمت اور نصیحت ہے)۔

سورت المُلك میں مشرکین کہتے ہیں۔ "تم جو قیامت کے آنے کا کہتے ہو، وہ کب آئے گی" تو اس کی تصریح کی جاتی ہے کہ اس کا علم صرف خداوند سے مخصوص ہے، میں صرف ڈرانے والا ہوں۔

وَیَقُولُونَ مَتیٰ هٰذَا الوَعدُ اِن کُنتُم صٰدِقِینَ۔ قُل اِنّمَا العِلمُ عِندَ اللّٰهِ وَاِنّمَا اَنَانَذیرُ مُبِینُ

(اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔ کہہ دو اس کی خبر تو اللہ ہی کو ہے اور میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں: المُلك۔ 25،26)

سورت النّازعَات کے آیات نمبر 43، 44، 45 میں دوبارہ روز حشر کا ذکر آیا ہے۔ جہاں واضح لفظوں میں رسول کو اس کا علم ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

فیمَ اَنتَ مِن ذِکریها۔ اِلی رَبِّکَ مُنتَهیها۔ اِنّمَا اَنتَ مُنذِرُ مَن یَخشیها

(تمھیں اس کے ذکر سے کیا واسطہ۔ اس کے واقع ہونے کا تمہارے رب کو ہی علم ہے۔ تم تو اسی کو ڈرانے والے ہو جو ڈرتا ہے)۔

مشرکین کا معجزہ دکھانے پر مسلسل اصرار اور قسم کھانا کہ اگر اُنھیں معجزہ دکھایا جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے، اس قدر بڑھ گیا کہ مسلمان آبادی حتیٰ کہ پیغمبر کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش خدا اُن پر فضل کرتا اور مشرکین کا تقاضا پورا کرنے اور ان کی رسالت کی تائید کرنے کیلئے اُنھیں ایک ایسے معجزے سے نوازتا جسے دیکھ کر مشرکین دنگ رہ جاتے اور ایمان لے آتے۔ سورت الأنعام کی یہ تین آیات پڑھیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ۔

(اور یہ لوگ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئے تو وہ اس پر ضروری ایمان لے آئیں۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو سب خدا ہی کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا معلوم ہے نشانیاں آ بھی جائیں تب بھی ایمان نہ لائیں، اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیں گے جیسے یہ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں بہکتے رہیں، اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے گفتگو کرنے لگتے اور ہم سب چیزوں کو ان کے سامنے لا موجود بھی کر دیتے تو بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے لیکن اکثر جاہل ہیں:109، 110، 111)۔

1: مشرکین نے قسم کھائی تھی کہ اگر پیغمبر اُنھیں ایک معجزہ دکھادیں جس کی اُنھوں نے خواہش کی ہے تو وہ آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور خداوند محمد سے کہتے ہیں کہ اُنھیں کہو، معجزہ مجھ سے نہیں بلکہ خدا کی

ذات سے مخصوص ہے۔ گویا یہ بات صحیح ہے کہ فطرت کو تبدیل کرنا کسی بھی انسان کے بس میں نہیں ہے خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی قوانین فطرت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اُن کے الٹ کچھ واقع ہو سکتا ہے۔ جلانا آگ کی خصوصیت ہے اور یہ خصوصیت ہمیشہ سے اس میں موجود ہے۔

2: فرمایا گیا کہ تمھیں کیا معلوم، اگر ہم تمھیں معجزہ دے بھی دیتے تو یہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ اس قضیے کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے، کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ اگر اُنھیں معجزہ دکھا بھی دیا جائے تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے؟۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اسے معمول سے ہٹی ہوئی کوئی بات نظر آئے تو وہ حیران ہوتا ہے اور جو کوئی اُسے حیران کن یا مافوق الفطرت چیز دکھائے گا، تو وہ اُسے ستائش کی نظروں سے دیکھے گا اور کوئی بعید نہیں ہے کہ وہ اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ مفسرین کے بقول معجزہ اس لئے نہیں دکھایا گیا کہ خداوند کو علم تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

3: فرمایا گیا: ”وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ“ (اور ہم اُن کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیں گے کہ یہ اس پر پہلی نشانیوں پر ایمان نہیں لائے)۔ خدایا! میں سچ کہہ رہا ہوں فتنہ تمہاری طرف سے ہے۔ اگر قادر مطلق خدا لوگوں کی راہِ حق دیکھنے کی بینائی ختم کر دیتا ہے، تو پھر اُن لوگوں سے کیا توقع کر سکتا ہے اور اُن پر پیغمبر کو کیوں مبعوث کیا گیا؟۔ اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ میں نے جو پہلی نشانیاں بھیجی تھیں، ان پہلی نشانیوں سے کیا مراد ہے؟۔ کیا ان سے مراد پرانے انبیاء ہیں یا محمد خود ہیں؟۔ پرانے انبیا کے متعلق کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ملتی۔ البتہ اگر اس کا تعلق محمد سے ہے تو ہمیں قرآن سے شہادت ملتی ہے کہ مشرکین نے ہمیشہ اُن سے معجزہ دکھانے کا تقاضا کیا تو اُنھیں ہمیشہ یہ جواب دیا گیا کہ میں بشیر (بشارت دینے والا) اور نذیر (خبردار کرنے اور ڈرانے والا) ہوں۔ شائد اس جملے ”ہم نے پہلے نشانیاں بھیجیں تب بھی ایمان نہیں لائے“ سے مراد قرآنی آیات کا نزول ہو۔ لیکن یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے۔ مشرکین قرآنی آیات پر ایمان لے آئیں اور اسے خدا کی طرف سے نازل کردہ کلام تسلیم کریں، اسی کی

خاطر ہی تو وہ تقاضا کر رہے تھے اور دلیل دے رہے تھے کہ عیسیٰ، موسیٰ، صالح اور دوسرے انبیا کے معجزات کو تو قرآن خود تسلیم کر رہا ہے، تو محمد بھی اُنھی کی طرح کوئی معجزہ دکھائیں۔

4: خداوند سورت الأنعَام کی آیات 111 میں فرماتے ہیں۔ اگر فرشتے ان کی طرف بھیجے جائیں اور مُردے اپنی قبروں سے اٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگیں تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ جب کہ وہ تو پیغمبر سے یہ چاہ رہے تھے کہ اپنے باتوں کی تصدیق کیلئے فرشتے کو آسمان سے نیچے زمین پر لاؤ یا عیسیٰ کی مانند مُردے کو زندہ کرو۔ پیغمبر کی آرزو تھی کہ کچھ ایسا ہو جائے لیکن خداوند اُنھیں جواب دیتے ہیں کہ اگر ایسا ہو بھی گیا تو یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

5: اس صورت میں کہ اُنھوں نے ایمان نہیں لانا تھا اور خدا کے علم کے مطابق اُن پر شرک و کفر کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔ تو پھر اُن کے پاس ایک ہدایت اور دعوت دینے والے آدمی کو بھیجنا کیا ایک بیکار امر نہیں تھا؟۔ ایک حکیم و دانا خدا نے حکمت و مصلحت سے عاری ایسا قدم اٹھانے سے گریز کیوں نہیں کیا؟ کیا ایسے عبث کام کو خدا سے منسوب کیا جانا چاہیے ؟۔ یقیناً مذہبی اور پرہیز گار لوگ جو عقائد کے معاملے میں دلیل و دانش کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ کہیں گے کہ اس کا مقصد لوگوں کی آزمائش تھی جس سے بدکاروں پر خود واضح ہو جائے گا کہ وہ اپنی بدکاریوں کی وجہ سے آخرت میں عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ لیکن اس کا جواب سورت الأنعَام کی آیت 111 کے آخر میں موجود ہے جہاں خداوند فرماتے ہیں: "الاَّ اَن یَشاء اللہ "۔ یعنی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خدا نہ چاہے۔ چنانچہ اس قضیے کا واحد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب اللہ نہیں چاہے گا تو یہ ایمان نہیں لائیں گے اور آیت نمبر 110 میں واضح طور پر اس کا مطلب فرما دیا گیا ہے کہ ہم نے ان کی آنکھوں اور دل کو حق قبول کرنے کی طرف سے پھیر دیا ہے۔

ان آیات سے پہلے سورت الأنعَام کی آیت 107 میں فرمایا جاتا ہے: "وَلَوشاءَاللہ مَا اَشرِکُو "۔ (اور اگر خدا چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے)۔ یعنی دوسرے لفظوں میں خدا چاہتا ہے کہ یہ لوگ شرک کریں۔

ایک قادر مطلق خدا کی مرضی کے سامنے ایک کمزور بندہ کیا کر سکتا ہے؟۔ پس محمد میں بھی اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ انھیں بت پرستی سے باز رکھ سکیں، کیونکہ ان کا شرک تو ارادہِ خداوندی کے تابع تھا۔ تو پھر اُنھیں روزِ آخرت کے عذاب سے کیوں ڈرایا جارہا تھا؟۔

اگر لوگوں کا ایمان لانا مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ تو کیا یہ انصاف، حقیقت اور عقلیت کے قریب تر نہیں ہے کہ مشیت الٰہی لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی توفیق دے دیتی، تاکہ انبیا کو بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی، نہ ہی لوگ پیغمبروں سے معجزات کا تقاضا کرتے اور نہ ہی معجزہ برپا نہ کر پانے پر اُنھیں عذر تراشنے پڑتے۔

ان آیات اور دیگر آیات کے سیاق سے واضح ہوتا ہے کہ حضور نے مشرکین کے تقاضے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جس کیلئے سورت التّکویر کو بہت اچھے انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ جو قران کی مّکی سورتوں میں سے بلیغ ترین اور شاعرانہ ترین سورت ہے۔ اس کا انداز بیان مسجع اور خوش آہنگ ہونے کے علاوہ پیغمبر کے قوت دلائل و خطابت کی روشن مثال ہے۔ لیکن یہاں بھی پیغمبر نے واضح انداز میں مشرکین کو جواب دینے سے اجتناب کیا ہے۔ بلکہ اس کی بجائے اپنے دعوے کو بہت مؤثر اور واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ البتہ تمام مطالب کو خدائی گفتگو کہا گیا ہے۔ چنانچہ اٹھارہ آیات میں اٹھارہ قسمیں کھانے کے بعد خدا مشرکین سے مخاطب ہوتا ہے جن کے نزدیک محمد کی باتیں کاہن کی اختراعات اور کسی دماغی خلل میں مبتلا انسان کا واہمہ ہیں۔

اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ۔ ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ۔ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ۔ وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ۔ وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ۔ وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ۔ وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ۔

”بے شک یہ فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے۔ جو بڑا طاقتور ہے عرش کے مالک کے نزدیک بڑے رتبہ والا ہے۔ سردار امانت دار ہے۔ اور تمہارا رفیق کوئی دیوانہ نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھُلے

کنارے پر دیکھا بھی ہے۔ اور وہ غیب کی باتوں پر بخیل نہیں ہے۔ اور وہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے"۔(التّکویر۔19 تا25)

ان لوگوں کی اکثریت جو مسلمان ہونے کیلئے معجزے کا تقاضا کرتے تھے اور خدا نے ان کے بارے میں فرمایاہے "اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے گفتگو کرنے لگتے تو بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے"۔ لیکن بارہ سال کے بعد جب محمد اور ان کے ساتھیوں کی تلوار کوندی تو وہ ایمان لے آئے۔ جس کے متعلق خدا نے خود فرمایاہے۔"یَدْخُلُونَ فِی دِینِ اللّٰہِ اَفوَاجاً "(لوگ غول در غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں: النّصر۔2)۔ اور ابوسفیان کا ایمان لانے کا واقعہ اس کی نمایاں مثال ہے۔ ابوسفیان جو بہت بڑا مخالف تھا، جس نے ہر جنگ میں حصہ لیا وہ دسویں ہجری میں مسلمان ہو گیا۔ جب محمد چند ہزار لوگوں کو ساتھ لے کر مکّہ فتح کرنے کیلئے آئے تو عباس بن عبدالمطلب اُسے پیغمبر کے پاس لائے تو پیغمبر نے اس سے پوچھا:"تجھ پر افسوس ہو، کیا تمھیں اب تک علم نہیں ہو سکا کہ اللہ کے سوا اس دنیا کا کوئی پروردگار نہیں ہے؟"۔

ابوسفیان نے کہا:"ہاں، مجھے بھی آہستہ آہستہ یہ عقیدہ درست لگنے لگا ہے"۔تب پیغمبر نے پوچھا:"کیا اب بھی اس بات سے منکر ہو کہ محمد اُس کے رسول ہیں؟"۔ ابوسفیان ناگواری سے بڑبڑایا۔"مجھے اس بارے میں سوچنے کی مہلت درکار ہے"۔ عباس نے اسے کہا:"ابوسفیان، جلدی سے مسلمان ہو جاؤ، وگرنہ محمد ابھی تمہاری گردن اتارنے کا حکم صادر کر دے گا"۔ مسلمان لشکر کے درمیان خود کو لاچار پاتے ہوئے ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا۔ اور اس کی تسلّی کیلئے عباس بن عبدالمطلب کی تجویز پر پیغمبر نے اس کے گھر کو خانہ کعبہ کی طرح امان کی جگہ قرار دے دیا۔ اور فرمایا:"مَن دَخَلَ بَیتِہٗ کانَ آمِناً"(جو بھی اُس کے گھر میں پناہ لے گا امن میں رہے گا)۔ اُسی سال قبیلہ بنو ہوازن پر فتح پانے کے بعد بہت

زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا تو ابوسفیان اور دیگر قریشی سرداروں کو اس شاہانہ انداز سے نوازا گیا کہ اُس پر انصار کے سرداروں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔[62]

62: آپ نے ابوسفیان کو سو اونٹ دیے۔ اُن کے بیٹے معاویہ کو سو اونٹ دیے۔ حکیم بن حزام کو سو اونٹ دیے۔ بنو عبداللہ کے نضیر بن الحارث کو سو اونٹ دیے۔ علاء بن حارثہ بنو زہرہ کے حلیف کو سو اونٹ دیے۔ حارث بن ہشام کو سو اونٹ دیے، صفوان بن امیہ کو سو اونٹ دیے۔ سہیل بن عمرو کو سو اونٹ اور حویطب بن عبدالعزیٰ کو سو اونٹ، عیینہ بن حصن کو سو، اقرع بن حابس کو سو، مالک بن عوف النصری کو سو اونٹ دیے۔ متذکرہ بالا اصحاب کو سو سو اونٹ دیے۔ اس کے علاوہ قریش کے مخرمہ بن نوفل، عمیر بن وہب اور بنو عامر کے ہشام بن عمرو کو سو سے کم دیے، صحیح تعداد تو معلوم نہیں مگر اتنا یقینی معلوم ہے کہ ان کی تعداد سو سے کم تھی۔ سعید بن یربوع اور سہمی کو پچاس پچاس دیے۔ عباس بن مرداسی کو چند اونٹ دیے جس سے وہ ناراض ہو گیا اور اُس نے اس کی شکایت میں چند شعر کہے۔ رسول اللہ کو جن اس کی اطلاع ہوئی آپ نے صحابہ سے فرمایا: ”جاؤ اور اس کی زبان بند کر دو“۔ آپ نے اسی بنا پر اُسے اور اونٹ دیے اور اس طرح اُس کا منہ بند ہو گیا۔

بنی تمیم کا ایک شخص ذوی الخویصرہ رسول اللہ کے پاس آیا اور کھڑا رہا۔ آپ اُس وقت لوگوں کو عطا دے رہے تھے۔ اُس نے کہا: ”اے محمد آج جو کچھ آپ نے کیا میں نے اُسے دیکھا“۔ رسول اللہ نے پوچھا: ”پھر کیا دیکھا“۔ اُس نے کہا: ”آپ نے عدل نہیں کیا“۔ رسول اللہ کو غصہ آ گیا، آپ نے فرمایا: ”مرد خدا اگر میرے یہاں عدل نہیں ہے تو پھر کہاں ہو گا؟“۔ عمر بن خطاب نے کہا: ”یا رسول اجازت ہو تو میں اس قتل کر دوں“۔ آپ نے فرمایا: ”نہیں اسے چھوڑ دو ممکن ہے اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہوں اور وہ اس طرح دین میں نکتہ چینی کر سکیں اور برگشتہ ہو جائیں اور تیر کی طرح دین سے نکل جائیں جس کی واپسی پھر ممکن نہیں کیونکہ جب تیر چلے سے نکلتا ہے تو پھر وہ کہیں نشانے کے علاوہ نظر نہیں پڑتا“۔

جب رسول اللہ نے قریش اور دوسرے قبائل میں وہ عطا تقسیم کی جس کا ذکر آ چکا ہے اور انصار کو اس میں سے کچھ نہیں دیا، وہ اپنے دل میں اس سے سخت ملول ہوئے اور اس پر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کسی نے یہ کہا: ”بخدا رسول اللہ اپنی قوم سے مل گئے ہیں“۔ سعد بن عبادہ آپ کے پاس آئے اور کہا: ”یا رسول اللہ یہ جماعت انصار آپ کے اس طرز عمل سے کبیدہ خاطر ہے کہ آپ نے اس مال کو صرف اپنی قوم میں تقسیم کر دیا ہے اور دوسرے قبائل عرب میں بھی بڑے بڑے عطیے تقسیم کیے،، مگر قبیلہ انصار کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملا“۔ رسول اللہ نے پوچھا: ”تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟“۔ سعد نے کہا: ”یا رسول اللہ، میں بھی اپنی قوم کا ہمنوا ہوں“۔ تاریخ الرُسل والملوک۔ محمد بن جریر الطبری

اس کے علاوہ وحشی جس نے حمزہ کو قتل کیا اور اس کی لاش کا مُثلہ کیا تھا، اور پیغمبر کے غیض وغضب اور نفرت کا باعث بنا تھا اور پیغمبر نے اُس سے اپنے محبوب چچا کا انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ جب اس نے پیغمبر کے پاس آکر اسلام قبول کیا تو پیغمبر نے اسے قبول کر لیا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نے ڈر کے مارے اسلام قبول کیا تھا لیکن پیغمبر نے اُس کے اس جھوٹے اسلام کو بھی منظور کر لیا۔

سورت الأنعام کی تین آیات کے بارے میں جو کہا گیا ہے وہ صرف گمان یا مفروضہ نہیں ہے۔ قرآن کی کئی دوسری آیات کے مطالعہ سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی نبوّت کی تصدیق کے لیے کسی بھی نشانی کو نہ بھیجے جانے سے وہ خود بھی اپنی رسالت کے حوالے سے شک میں مبتلا تھے۔ سورت یُونس کی 94 اور 95 اُن آیات سے زیادہ واضح آیات ہیں۔

فَإِنْ كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ مِن قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۔ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ

(اگر تم کو اس بارے میں جو ہم نے تم پر نازل کی ہے کچھ شک ہو تو جو لوگ تم سے پہلے کی کتابیں پڑھتے ہیں ان سے پوچھ لو۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس حق آچکا ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ اور نہ ان لوگوں میں ہونا جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں نہیں تو نقصان اٹھاؤ گے)۔

کیا ان دو آیات کو ایک قسم کی ڈرامہ بازی فرض کیا جائے کہ (محمد نے) اِنھیں کمزور عقیدے کے مالک اور شک کرنے والوں کو قائل کرنے کے لیے پڑھا تاکہ اُنھیں کہا جا سکے کہ وہ خود بھی اُن جیسے شکوک و شبہات سے دوچار ہوئے تھے لیکن اب خدا نے ان کا شک دور کر دیا ہے؟۔ یا یہ دونوں آیات اُس محمد کے باطن اور لاشعور میں چھپی آواز تھی جو معجزے سے مایوس ہو چکے تھے؟۔

صرف یہ دو آیات ہی نہیں جو ایسے مفاہیم ہم تک پہنچاتی ہیں۔ مکّی سورتوں میں ایسی نظیر ملتی ہے جو ہمیں محمد کے روحانی بحران کی خبر دیتی ہیں۔ چنانچہ سورت ھُود کی آیت نمبر 12 میں خدائی عتاب و ملامت کا اظہار ہوتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيۡكَ وَضَآئِقُۢ بِهِۦ صَدۡرُكَ أَن يَقُولُواْ لَوۡلَآ أُنزِلَ عَلَيۡهِ كَنزٌ أَوۡ جَآءَ مَعَهُۥ مَلَكٌۚ إِنَّمَآ أَنتَ نَذِيرٌ

(تو کیا جو وحی تمہاری طرف ہوتی ہے اس میں سے کچھ تم چھوڑ دو گے اور اس پر دل تنگ ہو گے اس بنا پر کہ وہ کہتے ہیں ان کے ساتھ کوئی خزانہ کیوں نہ اترا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ آتا، تم تو ڈر سنانے والے ہو)۔

پھر سورت الأنعام کی آیت 35 میں مورد عتاب ٹھہرتے ہیں جس سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ محمد اس وجہ سے بہت دلگیر تھے کہ اُنھیں معجزہ کیوں نہ عطا کیا گیا۔

وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيكَ إِعرَاضُهُم فَإِنِ استَطَعتَ أَن تَبتَغِيَ نَفَقاً فِي الأرضِ أَو سُلَّماً فِي السَّماءِ فَتَأتِيَهُم بِآيَةٍ وَلَو شَاءَ اللهُ لَجَمَعَهُم عَلَى الهُدىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الجَاهِلِينَ

(اور اگر ان کا منہ پھیرنا تم پر گراں ہو رہا ہے پھر اگر تم سے ہو سکے تو کوئی سرنگ زمین میں تلاش کر لو یا آسمان سے سیڑھی لگا پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لا اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا پس تم ہر گز نادانوں میں سے نہ ہونا)۔

سورت النِّسَاء کی آیات 153 میں یہی بات دوسرے انداز میں آئی ہے۔ اور اس بار اہل کتاب لوگوں سے بات کی جا رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہودیوں نے بھی معجزہ دکھانے کا تقاضا کیا تھا۔ اور ان کو قائل کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسئَلُکَ اَهلُ الکِتابِ اَن تُنَزِّل عَلَیهِم کِتاباً مِنَ الّسماء فَقَد سَالُوا مُوسی اَکبَرَ مِن ذلِکَ فَقالُوا اَرِنَا اللہَ جَهرَۃً فَاَخذَتهُمُ الصاعِقَۃُ بِظُلمِهِم ثُمَّ اتَّخَذُوا العِجلَ مِن بَعدِ ما جائتهُمُ البَیّناتُ فَعَفَونا عَن ذلِکَ وَ آتَینا مُوسی سُلطاناً مُبیناً

(اہل کتاب تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تو اُن پر آسمان سے لکھی ہوئی کتب اتار لائے سو موسیٰ سے اس سے بڑی چیز مانگ چکے ہیں اور کہا ہمیں اللہ کو بالکل سامنے لا کر دکھا دے ان کے اس ظلم کے باعث ان پر بجلی ٹوٹ پڑی پھر بہت سی نشانیاں پہنچ چکنے کے بعد بچھڑے کو بنالیا پھر ہم نے وہ بھی معاف کر دیا اور ہم نے موسیٰ کو بڑا رعب دیا تھا)۔

سورت الإسرَاء کی آیت 59 میں معجزہ نہ لانے کی یوں توجیہ پیش کی گئی ہے۔

وَما مَنَعَنا اَن نُرسِلَ بِالایاتِ اِلا اَن کَذَّبَ بِهَا الاَوّلُونَ وَ آتَینا ثَمُودَ النَاقَۃَ مُبصِرَۃً فَظَلَمُوا بِها وَ نُرسِلُ بِالایاتِ الاّ تَخویفاً

(اور ہم نے اس لیے معجزات بھیجنے موقوف کر دیے کہ پہلوں نے اُنھیں جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو اونٹنی کا کھلا ہوا معجزہ دیا تھا پھر بھی اُنھوں نے اس پر ظلم کیا اور یہ معجزات تو ہم محض ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں)۔

جلالین نے اس آیت کی یوں تفسیر کی ہے۔ کہ معجزہ نہ ہونے کہ وجہ یہ ہے کہ پہلے قوم ثمود کے پیغمبر صالح[63] کے پاس معجزے کے طور پر اونٹنی بھیجی گئی لیکن وہ ایمان نہ لائے تو ہم نے اُنھیں ہلاک کر دیا۔

63: ہجر کی بستی میں آباد قوم ثمود پر صالح مبعوث ہوئے۔ ثمودی بت پرست لوگ تھے اور صالح کی تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن صالح سے کہنے لگے کہ کہ اگر تم سامنے پڑی چٹان سے ایک گابھن اونٹنی کو برآمد کرنے کا معجزہ دکھاؤ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔ صالح کی دعا کے نتیجے میں چٹان ہلنے لگی اور پھر چٹان سے ایک بڑی سی گابھن اونٹنی نمودار ہوئی جسے دیکھ کر جندع بن عمرو اپنے چند

لہٰذا اگر ہم تمھیں معجزہ دیتے ہیں اور وہ ایمان نہ لائے تو وہ بھی ہلاک کیے جانے کے مستحق ٹھہریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مہلت دیں تا کہ محمد کا کام مکمل ہو جائے۔

اس کے بعد والی آیت بھی پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا

(اور جب ہم نے تم سے کہہ دیا کہ تیرے رب نے سب کو قابو میں کر رکھا ہے اور وہ خواب جو ہم نے تمھیں دکھایا اور وہ ملعون درخت جس کا ذکر قرآن میں ہے ان سب کو ان لوگوں کے لیے فتنہ بنا دیا اور ہم تو اُنھیں ڈراتے ہیں سو اس سے ان کی شرارت اور بھی بڑھتی جاتی ہے)۔

خدا اس آیت میں فرماتے ہیں کہ ہم نے تم سے کہا کہ تمھارا خدا انسانوں پر بھاری ہے اور ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے، یعنی مت ڈرو اور اپنی بات کہو۔ دوبارہ فرماتے ہیں کہ وہ خواب جو تمھیں دکھایا گیا وہ لوگوں کا امتحان لینے کیلئے تھا جس سے مراد معراج کی کہانی تھی اور یہ جو خواب کے انداز میں ہوا ہے اس سے لوگوں کی آزمائش مقصود تھی۔ کیونکہ جب اُنھیں معراج کی کہانی سنائی گئی تو اُنھوں نے مذاق اڑایا اور کچھ

ساتھیوں سمیت ایمان لایا لیکن ثمودیوں اکثریت بت پرست رہی۔ ایک دن صالح کی اونٹنی پانی پیتی اور اس قدر دودھ دیتی کہ ان لوگوں کے سارے برتن بھر جاتے۔ دوسرے دن ثمودیوں کے جانور پانی پیتے۔ قوم ثمود نے ایک دن فیصلہ کیا کہ وہ اونٹنی کو ہلاک کر دیتے ہیں تا کہ اُن کے جانور ہر روز پانی پی سکیں، چنانچہ اونٹنی ہلاک کر دی گئی۔ اونٹنی کا بچہ چیختا ہوا چٹان کے اندر غائب ہو گیا۔ صالح نے جب اونٹنی کو مرے ہوئے پایا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُنھوں نے لوگوں کو بتایا کہ تین روز بعد تم پر عذاب آئے گا اور تم سب ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ یہ سُن کر قوم ثمود نے صالح کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ تیسرے دن آسمان سے کڑاکا ہوا جس کی ہولناک چنگھاڑ نے ان کے کلیجے پھاڑ دیے اور نیچے سے زبردست زلزلہ آیا اور سوائے صالح اور اُن پر ایمان والے لوگوں کے پوری قوم ثمود ختم ہو گئی۔

اسلام سے برگشتہ ہو گئے [64]۔ فرمایا جاتا ہے۔ ملعون درخت تھوہر جس کا ذکر قرآن میں ہے، وہ لوگوں کی آزمائش اور ڈرانے کیلئے تھا لیکن وہ اور بڑھ گئے، کیونکہ عربوں نے تمسخرانہ انداز میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ آگ کے اندر درخت کیسے اُگ سکتا ہے؟۔

64: ہند ابو طالب کی سب سے بڑی بیٹی تھیں کچھ روایات کے مطابق اُن کا نام فاختہ تھا۔ حضور ہند سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن حضور تو خود چچا کے ہاں محتاجی کی زندگی گزار رہے تھے، شادی کی صورت میں وہ بیوی کو کیا کھلاتے۔ چنانچہ غربت کی وجہ سے اُن کی ہند سے شادی نہ ہو سکی۔ ابو طالب نے ہند کا بیاہ بنو مخزوم کے ہبیرہ بن ابو وہب سے کر دیا۔ ہبیرہ اسلام کا سخت دشمن تھا، مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں شرکت کی، جب مکّہ فتح ہوا تو ہبیرہ بھاگ کر نجران چلا گیا، وہاں اسے اپنی بیوی کے اسلام قبول کرنے کی خبر ملی، لیکن وہیں رہا اور وہیں موت ہوئی۔ ہبیرہ سے ہانی نام کے بیٹے کی وجہ سے ہند کی کنیت اُم ہانی ٹھہری۔ معراج کی رات حضور اُم ہانی کے گھر پر سوئے تھے۔ معراج کے متعلق اُم ہانی کا یہ بیان ہے: "وہ اُس رات کہیں بھی نہیں گئے تھے۔ وہ اُس رات میرے گھر سوئے تھے۔ اُنھوں نے عشا کی نماز پڑھی اور وہ سوئے اور ہم سوئے۔ فجر سے کچھ پہلے کا وقت تھا کہ اُنھوں نے مجھے جگایا، صبح کی نماز ادا کی اور کہا: "اے ام ہانی! میں نے آج رات کی آخری نماز تو تم لوگوں کے ساتھ اسی وادی میں پڑھی، جیسا کہ تم نے دیکھا پھر میں بیت المقدس پہنچا اور وہاں نماز پڑھی۔ اور پھر صبح کی نماز ابھی تمھارے سامنے پڑھی جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو"۔ وہ باہر جانے کے لیے اٹھے تو میں نے اُن کی قمیض پکڑ لی جس سے اُن کا پیٹ ننگا ہو گیا جو ایسا تھا جیسے کوئی مصری کپڑا تہہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے التجا کی: یارسول اللہ! ان لوگوں کو یہ مت کہنا، وہ تمھیں جھوٹا کہیں گے اور مذاق اڑائیں گے"۔ آپ نے فرمایا: "واللہ میں تو ضرور اُن سے یہ کہوں گا"۔ سیرت النبی ابن ہشام

ام ہانی اپنی ایک حبشیہ باندی کو حکم دیتی ہے کہ وہ حضور کے پیچھے جائے اور سنے کہ رسول اللہ لوگوں سے کیا کہتے ہیں اور لوگوں کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ آپ کو ابو جہل ملتا ہے اور پوچھتا ہے کوئی نئی تازی بات؟۔ آپ فرماتے ہیں: "آج رات مجھے بیت المقدس کی سیر کرائی گئی"۔ اُس نے تعجب سے کہا: "بیت المقدس کی؟"۔ آپ نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے کہا، میں اگر اور لوگوں کو لے آؤں تو یہ بات سب لوگوں کو بتاؤ گے؟ حضور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چنانچہ ابو جہل نے لوگوں کو اکٹھا کر کے آپ سے عرض کیا: جو بات آپ نے مجھے بتائی ہے وہ اُنھیں بھی بتائیں۔ چنانچہ آپ نے مجمع کو بتایا کہ میں آج رات بیت المقدس گیا اور وہاں نماز پڑھی۔ اس کو ناممکن سمجھ کر بعض سامعین جھٹلاتے ہوئے سیٹیاں بجانے لگے، بعض تالیاں پیٹنے لگے اور پھر یہ خبر پورے مکّہ میں پھیل گئی"۔ البدایہ والنہایہ، اسماعیل بن عمر بن کثیر۔

معراج کا واقعہ مکّہ کے لوگوں کے لیے کسی طور بھی قابل قبول نہیں تھا۔ "یہ سُن کر بہت سے جو مسلمان تھے اور عبادت گذار تھے وہ اسلام سے تائب ہو گئے۔ بہت سوں نے اسلام سے کنارہ کشی کر لی۔ کچھ حضرت ابو بکر کے پاس گئے اور کہا، اب تم اپنے دوست کے متعلق کیا کہتے

بالآخر معجزہ دکھانے کی بجائے جابجا دوزخ کی آگ کی دھمکی دی جاتی ہے۔ چنانچہ سورت الإسرَاء کی آیت 58 میں فرمایا جاتا ہے۔

وَاَن مِن قَریَۃٍ اِلاَّنَحنُ مُھلِکُوھا قُبلَ یَومِ القِیمُہ اَومُعَذّبُوھا عَذاباً شَدیداً۔ (اور ایسی کوئی بستی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا اسے سخت عذاب نہ دیں)۔

عجب بات ہے کہ خدا جو راست باز اور عادل ہے، وہ خود فرماتا ہے۔

وَلَو شِئنا لآتَینا کُلَّ نَفَسٍ ھُدیھا۔ (اور اگر ہم چاہتے ہیں تو ہر شخص کو ہدایت پر لے آتے: السَّجدَۃ۔ 13)

تاہم اس کے بعد جنھیں خود ہی ہدایت دینا مناسب نہیں سمجھا گیا، اُنھیں ہلاکت اور شدید عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ اس تشدد کی بجائے معجزہ برپا ہو جاتا تاکہ سب لوگ ایمان لے آتے اور وہ جنگ اور خونریزی نہ ہوتی؟۔ سورت الأنعَام کی آیت 37 میں معجزہ ظاہر نہ ہونے کا جو عذر ہے وہ عذاب کی دھمکی سے کم نہیں ہے۔

وَقالُوا لَولا نُزِّلَ عَلَیہِ آیَۃٌ مِن رَبّہٖ قُل اِنَّ اللہَ قادِرٌ عَلی اَن یُنَزّلَ آیَۃٍ وَلکِنَّ اَکثَرَھُم لایَعلمُونَ

(اور کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کے پاس کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی۔ کہہ دو کہ خدا نشانی اتارنے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

ہو، وہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ پچھلی رات یروشلم گیا، وہاں عبادت کی اور واپس مکّہ آ گیا۔ حضرت ابو بکر نے کہا تم نبی کے متعلق جھوٹ بول رہے ہو، لیکن جب اُنھیں پتہ چلا کہ حضور اس وقت کعبہ میں یہی واقعہ قریش کو بتا رہے ہیں تو آپ نے کہا: "اگر وہ یہ کہتے ہیں تو یہ سچ ہے، مجھے اُن پر یقین ہے۔ اس میں حیرانی والی کون سی بات ہے۔ اُنھوں نے مجھے بتایا ہے کہ عرش سے بھیجا ہوا اللہ کا پیغام زمین پر میرے پاس چند گھڑیوں میں پہنچ جاتا ہے اور میں اُس پر یقین کرتا ہوں اور معراج اتنا غیر معمولی واقعہ نہیں جتنا یہ (وحی) ہے۔ اس تصدیق کی وجہ سے ابو بکر "صدیق" کہلائے۔ سیرت النبی: ابن ہشام

اس آیت میں عقلی و منطقی استدلال کہاں ہے۔ منکرین معجزہ کی درخواست کر رہے ہیں، اُنھیں جواب دیا جاتا ہے کہ خدا معجزہ نازل کرنے پر قادر ہے۔ بیشک خدا قادر ہے، منکرین بھی جانتے تھے کہ خدا قادر ہے اسی لئے اُنھوں نے معجزے کا تقاضا کیا تھا۔ چنانچہ "خدا قادر ہے" کی دلیل کی بنیاد پر معجزہ واقع ہو جانا چاہیے تھا لیکن معجزہ برپا نہ ہوا، اور "اَکثَرَھُم لَا یَعلَمُونَ" کہنے پر اکتفا کر لیا گیا۔ لوگ کیا نہیں جانتے تھے؟ کہ خدا قادر ہے؟ وہ یہ جانتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھوں نے معجزہ دکھانے کا تقاضا کیا تھا۔

لوگوں کے منطقی مطالبے اور پیغمبر کے گول مول جواب کے متعلق تفسیر جلالین میں یوں لکھا ہے۔

"معجزے کی درخواست کرنے والوں کی اکثریت نہیں جانتی تھی کہ اگر معجزہ وقوع پذیر ہوا اور یہ ایمان نہ لائے تو ہلاکت کے مستحق ٹھہریں گے"۔

اوّل، معجزہ واقع ہونے کے صورت میں وہ ایمان کیوں نہیں لائیں گے؟۔

دوم، وہ لوگ جو معجزہ برپا ہونے کے بعد بھی اپنی جہالت اور کم عقلی کی وجہ سے ایمان نہ لاتے، کیا یہ بہتر ہے کہ اُنھیں ہلاک کر دیا جائے؟۔ اور وہ اڑتالیس لوگ جو جنگ بدر میں ہلاک ہوئے تھے اُنھوں نے دنیا کو کون سا نقصان پہنچایا تھا؟۔

معجزہ قرآن

گزشتہ باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ معجزہ دکھانے کے تقاضوں پر محمد نے نفی کی روش اختیار کی۔ اُنھوں نے مشرکین کو جواب میں یہ کہا کہ میں تو مبشّر اور مَنذِر ہوں۔ لیکن قرآن کے حوالے سے ان کا رد عمل مختلف تھا۔ جب بھی مشرکین نے قرآن کو خود سے گھڑی ہوئی اور دوسرے لوگوں سے سنی ہوئی باتیں قرار دیا تو فوراً اس کا جواب دیا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو اس جیسی دس آیات بنا کر لاؤ۔

اَم یَقُولُونَ افتَرٰیہُ قُل فَأتُوا بِعَشرِ سُوَرٍ مِثلِہٖ مُفتَرَیاتٍ وَ ادعُوا مَنِ استَطَعتُم مَن دُونَ اللهُ اِن کُنتُم صادِقِینَ۔

(یا کہتے ہیں کہ تو نے قرآن خود بنا لیا ہے کہہ دو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو: ھُود۔ 13)۔

مشرکین نے قرآن کو پہلے وقتوں کے لوگوں کی اساطیری داستانیں کہا[65]۔ اور دعویٰ کیا کہ اگر ہم چاہیں تو اُس جیسی کتاب لا سکتے ہیں۔

وَإِذا تُتلیٰ عَلَیھِم آیاتُنا قالوا قَد سَمِعنا لَو نَشاءُ لَقُلنا مِثلَ ھٰذا إِن ھٰذا إِلّاَ أَساطیرُ الأَوَّلین۔

65: اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ایسی باتیں کہنے والا نضر بن حارث تھا۔ وہ اکثر فارس کے علاقے میں جاتا تھا اور وہ ایرانی بادشاہوں اور رستم اسفندیار کے قصوں سے واقف تھا۔ جب کبھی حضور کوئی آیت سناتے تو یہ ایرانی بادشاہوں کی تاریخ سنا کر کہتا: "کس نے اچھی قصہ خوانی کی ہے، میں نے یا محمد نے"۔ جنگ بدر میں قید ہوا۔ حضور نے عقبہ بن ابی معیط، طعیمہ بن عدی سمیت نضر کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ نضر کو مقداد بن اسود نے قیدی بنایا تھا۔ وہ قتل کے بدلے فدیہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن حضور نے فرمایا کہ اس ملعون نے قرآن کی آیات کا مذاق اڑایا ہے، چنانچہ علی بن ابو طالب کے ہاتھوں قتل ہوا۔

(اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور اگر ہم چاہیں تو اس کے برابر ہم بھی کہہ دیں اس میں پہلوں کے قصے کے سوا اور کچھ نہیں: الأنفال - 31)۔

مشرکین کے اس الزام کہ قرآن پہلے گزرے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور اگر چاہیں تو ایسا کلام کہہ سکتے ہیں، کے متعلق قرآن میں یوں جواب میں دیا گیا:

قُل لَئِنِ اجتَمَعَتِ الإِنسُ وَالجِنُّ عَلىٰ أَن يَأتوا بِمِثلِ هٰذَا القُرآنِ لا يَأتونَ بِمِثلِهِ وَلَو كانَ بَعضُهُم لِبَعضٍ ظَهيرًا۔

(کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں: الإسراء - 88)۔

اس وجہ سے محمد قرآن کو اپنی رسالت کی سند سمجھتے تھے۔ علمائے اسلام کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن اُن کا معجزہ ہے۔ لیکن کیا قرآن عبارت، فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے یا اس کی معانی و مطالب معجزاتی ہیں یا دونوں حوالوں سے یہ کتاب معجزاتی ہے؟، ان پہلوؤں پر اب تک بہت زیادہ بحث ہو چکی ہے اور اکثر علمائے اسلام دونوں حوالوں سے قرآن کو ایک معجزہ گردانتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی قاطع سوچ کی بنیاد ایمانی شدت ہے نہ کہ غیر جانبدارانہ تحقیق۔ چنانچہ غیر مسلم محققین نے قرآن کی فصاحت اور بلاغت کے دعویٰ کو بہت شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مسلمان علما اس صورت حال سے نپٹنے کیلئے یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر پڑھی جائے۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "الإتقان في علوم القرأن" کا ایک باب اسی موضوع کیلئے وقف کیا ہے۔

قرآن زبان کے لحاظ سے

اسلام کے اوّلین دور کے علماء میں مذہبی تعصب اور بغض کی کمی تھی۔ چنانچہ اُن وقتوں کے ایک عالم ابراہیم نظام[66] بہت واضح انداز میں کہتے ہیں کہ قرآن کی تنظیم، ترتیب اور اس کے جملوں کی ترکیب قطعاً معجزاتی نہیں ہے۔ اللہ کا کوئی اور بندہ بھی اس جیسی یا اس سے بہتر کتاب لکھ سکتا ہے۔ قرآن کو البتہ اس لحاظ سے معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس میں مستقبل کی خبر دی گئی ہے جو کاہنوں کے انداز کی غیب گوئی نہیں بلکہ دور بینی سے کام لیتے ہوئے بعد میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق بتایا گیا ہے۔

ابراہیم نظام پر لعن طعن کرنے کیلئے ابو منصور عبد القادر بغدادی[67] اپنی کتاب "الفرق بین الفرق وبیان الفرقة الناجیةمنھم" میں ابن راوندی[68] سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن میں واضح انداز میں

66: ابراہیم نظام دوسری صدی ہجری کے ایک عظیم ادیب اور عالم دین تھے۔ 830ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید کے جانشین تھے، جو معتزلہ فرقہ کے بانی تھے۔ عظیم عرب ادیب جاحظ اِنھی کے شاگرد تھے۔ ابراہیم نظام کا عقیدہ تھا کہ قرآن حادث ہے اور یہ خدا کا کلام نہیں ہے۔

67: عبد القادر بغدادی کا انتقال 429 ہجری میں ہوا۔ ان کی اس اہم کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر محمد جواد نے "تاریخ مذہب اسلام" کے عنوان سے کیا۔

68: احمد بن یحیٰ راوندی نے 827ء سے 911ء کے دوران زندگی بسر کی، افغانستان کے علاقے راوند میں پیدا ہوئے، ان کے والد یہودی عالم تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ راوندی بغداد منتقل ہوئے۔ پہلے معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے، پھر شیعاؤں کے نزدیک ہوئے لیکن آخر میں نازل شدہ مذاہب کے ہی مخالف ہوگئے۔ اُنھیں اسلام کے اولین دور کا متشکک اور فری تھنکر سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی تمام کتابیں ضائع ہوچکی ہے۔ لیکن اُن کے ناقدین کی تحریروں میں درج اُن پر کی گئی تنقید سے اُن کے خیالات کا پتہ چلتا ہے، ناقدین اُن کی "کتابہ الزمرّد" نامی کتاب سے حوالے دیتے ہیں۔ راوندی کے بقول معجزات کے شاہد صرف چند اور بہت ہی نزدیکی لوگ تھے۔ اُن کی باتوں پر یقین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ چند لوگوں کو جھوٹ بولنے کی سازش پر با آسانی آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ غزوہ بدر میں فرشتوں کی مدد کے اسلامی دعوے کا مذاق اڑاتے ہوئے راوندی کہتے ہیں کہ یہ فرشتے بہت ہی کمزور تھے کہ صرف ستر آدمیوں کو ہلاک کرپائے، اگر بدر کے

درج ہے کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس جیسا قرآن بنالائیں تو اس جیسا نہ لاسکیں گے۔ پس نظام نے قرآنی نصّ کے خلاف بات کی ہے۔

ابراہیم نظام کے شاگردوں اور پیروکاروں ابن حزم[69] اور خیاط[70] نے اس تنقید کے جواب میں ابرہیم کے دفاع میں لکھا۔ معتزلہ[71] کے اکثر سرکردہ لوگ ابراہیم نظام سے متفق تھے اور اُنھی خیالات کا اظہار

مقام پر پیغمبر کی مدد کے لیے فرشتے راضی تھے تو غزوہ احد کے وقت ایسا کیا ہوا کہ فرشتے نہیں آئے، حالانکہ اُس وقت پیغمبر کو ان کی مدد کی سخت ضرورت تھی۔ راوندی حج اور شعائرِ حج کا بھی مذاق اڑاتے تھے۔ وہ نماز، وضو پر تنقید کے علاوہ حج پر بھی سوال اٹھاتے ہیں، پتھروں (پہاڑیوں) کے درمیان دوڑنے سے کیا فائدہ یا نقصان پہنچتا ہے؟ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟ اس کے مقابلے میں مکّہ کے نزدیک واقع جبل ابوقبیس میں کیا برائی ہے؟ کعبہ کس حوالے سے کسی دوسری عمارت سے بہتر ہے؟۔

69: ابو محمد بن حزم اندلسی ایک ایرانی نژاد تھے۔ اُن کے اجداد جنگی قیدی ہوئے۔ دسویں صدی کے وسط میں قرطبہ میں پیدا ہوئے اور گیارہویں صدی کے وسط میں انتقال ہوا۔ عربی زبان میں عربی ادب اور اسلامی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ابورافع کا کہنا تھا کہ ان کے والد نے چار سو کتابیں لکھیں جو اسّی ہزار صفحات پر محیط تھیں۔ لیکن سوائے چند ایک کے اُن کے سب کتابیں ضائع ہو چکی ہے۔ فقہ کے حوالے سے "المحلی" اور دینی حوالے سے "التوحید" ان کی اہم ترین کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک خبر کے مطابق "المحلی" کا ترجمہ اردو میں شائع ہو چکا ہے۔

70: عبدالرحمٰن بن محمد خیاط معتزلہ کے بانیوں میں سے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ خدا کے بھی جسمانی اعضا ہیں۔

71: معتزلہ اسلام کا ایک معروف فرقہ ہے جس کا ظہور بنی امیہ دور کے آخر میں ہوا۔ اور چند صدیوں تک اسلامی امور کو متاثر کیا۔ اس فرقے کی بنیاد حسن بصری کے شاگرد واصل بن عطاء، نے عمرو بن عبید کی مدد سے رکھی۔ اس فرقے نے اسلام میں ایک عظیم فکری تحریک کا آغاز کیا، اور مسلمان ایرانی علوم و فلسفہ سے متعارف ہوئے۔ ان لوگوں نے نقل کی بجائے عقل کو ترجیح دی اور مذہب کو عقلی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ معتزلہ عقیدہ تقدیر کے منکر تھے۔ اُن کے نزدیک اللہ مطلق خیر ہے اور وہ شرّ کا خالق نہیں ہے۔ اللہ عادل ہے، عدل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اُس پر واجب ہے کہ وہ گناہگار کو اُس کے گناہوں کی سزا دے، وہ کسی کے گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا۔ اللہ کے اوصاف کا علیحدہ وجود نہیں بلکہ وہ اُس کا جوہر ہیں۔ خدا کا کوئی جسم نہیں ہے، خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب دین سے نکل جاتا ہے لیکن وہ کافر نہیں ہوتا بلکہ کفر اور دین کے درمیان ہوتا ہے۔ معتزلہ نے اپنے عقائد کو پیش کرنے کے لیے فلسفیانہ، عقلی اور منطقی استدلال کو استعمال کیا۔ اُنھوں نے اسلام میں علم الکلام متعارف کیا اور اسی سے وہ قرآن کی تاویل و توجیہ کیا کرتے تھے۔ اُنھیں عام مسلمانوں اور بالخصوص محدثین اور اشعریوں کی نفرت اور دشمنی کا سامنا ہوا۔ معتزلہ کی بیخ کنی سے مسلمانوں کو

کرتے تھے جو ابراہیم نظام نے بیان کیے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ نظام نے قرآنی آیت کے منافی کچھ نہیں کہا۔ قرآنی معجزے کی صورت یوں ہے، کہ پیغمبر کے زمانے میں خدا نے اُن لوگوں سے یہ صلاحیت سلب کر لی تھی کہ وہ قرآن کی نظیر پیش کر سکتے، وگرنہ قرآنی آیات کے مثل لانا صرف ممکن ہی نہیں بلکہ بہت آسان ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ابو العلاء المعرّی نامی اندھے شامی شاعر نے گیارہویں صدی میں "الفصول و الغایات" نامی کتاب قرآن کے مقابلے پر لکھی۔ قرآن میں نارسا ترکیبات اور ناکامل فقرے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ غیر ملکی اور نامانوس عربی الفاظ، الفاظ کا معمول سے ہٹا ہوا استعمال، مونث مذکر کا دھیان نہ رکھنا، فعل کی فاعل یا صفت کی موصوف سے مطابقت نہ ہونا، اسم ضمیر کا خلاف دستور استعمال، مفعول کی اپنے فاعل سے دوری یا غائب ہونا اور اس قسم کے دیگر انحرافات منکرین کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کے دعوے کو رد کر دیں۔ مسلمان علماء کو بھی اس کا ادراک ہو چکا ہے، اسی وجہ سے اُنھوں نے اس کی تاویل و توجیہ لانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کی قرأت میں اختلاف کی ایک وجہ شائد یہ بھی ہے۔ چنانچہ "يَاَيُّهَا الْمُتدَثِّرُ" بدل کر "يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ" ہو گیا اور مفسرین کو مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ "ت" "د" میں تبدیل اور مدغم ہو گیا ہے۔ اسی طرح "يَاَيُّهَا الْمُتزَمِّلُ" بھی "يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ" میں تبدیل ہو گیا ہے۔

سورت النِّسَاء کی آیت 162 یوں نازل ہوئی تھی "لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔۔۔ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ"۔ (مگر جو لوگ ان میں سے علم میں پکے ہیں اور جو مومن

کس قدر علمی زوال کا سامنا ہوا اس کے متعلق مصری تاریخ دان احمد امین کہتے ہیں "اگر معتزلہ روایات آج تک جاری رہ پاتیں تو مسلمانوں کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اس وقت ہے"۔ جرمن مستشرق ایڈورڈ سخاؤ کے مطابق مسلمانوں کے گلیلیو، کیپلر اور نیوٹن جیسے نابغے پیدا کرنے والی قوم ہونے میں واحد رکاوٹ اشعری اور غزالی ثابت ہوئے۔

ہیں۔۔۔اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں)۔اس فقرے میں "مُقِیمِینَ الصلوۃ" کو "راسِخون"، "مؤمِنون"، "مؤتُون" کی مانند "مُقِیمونَ الصلوۃ" ہونا چاہیے تھا۔اور سورت الحُجرات کی آیت 9 میں " وَاِن طائِفَتانِ مِنَ المُومِنِینَ اقتَتَلوُا " (اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں) "طائفتان" میں "ن" کا حرف فقرے میں فاعل کی طرف اشارہ کرتا ہے، عربی زبان کے قواعد کے مطابق فعل کو "اقتتلتا" ہونا چاہیے تھا، تاکہ فعل اور فاعل میں مطابقت ہوتی۔

سورت البقرَۃ کی آیت نمبر 177 جس میں مسجد اقصیٰ کی بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دیئے جانے پر یہودیوں کے اٹھائے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا گیا۔اس آیت کا مضمون بہت خوبصورت اور ارفع ہے۔

لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَلٰـكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ

(نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لائے)یعنی اہم انسان ہے جس میں یہ صفت ہوتی ہے۔خوبی مشرق یا مغرب کی طرف منہ پھیرنا نہیں بلکہ خدا پر ایمان لانا ہے۔

اس سلسلہ میں جلالین نے "لکن البَر" کی تشریح کرتے ہوئے اسے "ولکن البِر" لکھا ہے۔

مُبَرّد[72] جن کا شمار اولین دور کے نحو کے بڑے علما میں ہوتا ہے، اُنھوں نے سہمے اور ڈرے ہوئے انداز میں سے کہا کہ اگر میں کسی لفظ کو تبدیل کر سکتا تو میں اس لفظ "برّ" کو کسر کے ساتھ نہ پڑھتا بلکہ زبر اور مفتوح کے ساتھ پڑھتا۔

72: مُبَرّد، محمد بن یزید بصری 210-285ہجری کے دوران زندگی بسر کی۔ نحو اور لغت کے حوالے سے عربی ادب کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔ کئی مفید کتابیں تالیف کیں۔ لغت میں اُن کی مشہور ترین کتاب "کامل" ہے، جو ادب اور علم الکلام کے موضوع پر ایک ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔

تا کہ "بَر" "بارّ" کا مخفف ہوتا، اور نیک انسان کے معنی دیتا۔ ایسا کہنے کی وجہ سے محمد بن یزید مُبَرّد مطعون ہوئے اور اُنھیں ایمان کی کمزوری کا طعنہ سننا پڑا۔

سورت طٰہٰ کی آیت 63 میں جہاں فرعون کی قوم موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کے متعلق کہتے ہیں "ان ھٰذانِ لَساحِرانِ"۔ اس صورت میں کہ "آن" کے حرف کے بعد "ھذا" اسم ہے، تو قواعد کے مطابق یہاں "ھذین" لکھا اور پڑھا جانا چاہیے۔ عائشہ اور عثمان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسی انداز میں پڑھتے تھے۔ لوگوں کس قدر مذہبی جمود اور تعصب کا شکار ہوتے ہیں اس کیلئے ایک مسلمان عالم کا ایک حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں جو میں نے کہیں پڑھا تھا، اس عالم کا کہنا ہے۔ "یہ اوراق جنھیں قرآن کا نام دے کر دو جلدوں میں اکٹھا کیا گیا ہے، ان پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ خدا کے کلام میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی لہذا عائشہ اور عثمان کے "ھذا" کی بجائے "ھذین" پڑھنے والی روایت جھوٹی اور فاسد ہے۔

جلالین نے نہایت دھیمے انداز میں اس مسئلے کو حل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہاں الف تینوں حالتوں یعنی زبر، پیش اور زیر کے ساتھ آیا ہو گا۔ لیکن ابو عمرو بن العلاء البصری[73]، عثمان اور عائشہ کی مانند "ھذین" پڑھتے تھے

سورت النُّور کی آیت نمبر 33 میں ہمیں اُن وقتوں کی ایک ناپسندیدہ اور غلیظ رسم سے آگاہی ہوتی ہے۔

73: ابو عمرو بن العلاء البصری: ولادت 80 ہجری مکہ میں ہوئی۔ بصرہ میں رہے۔ بڑے ادیب ہونے کے علاوہ ماہر عربیت عالم لغت اور مشہور نحوی تھے۔ حسین بن الولید، ہارون بن موسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ قرآن مجید پر سب سے پہلے نقطے اُنھوں نے لگائے۔ ان کا نام قراء سبعہ میں شامل ہے۔

لا تکرِھُوا فَتَیاتِکُم عَلَی البِغاءِ اِن اَرَدنَ تَحَصُّنا لِتَبتَغُوا عَرَضَ الحَیوٰۃِ الدُّنیا وَمَن یُکرِھھُنَّ فَاَنَّ اللّٰہَ مِن بَعدِ اِکراھِھِنَّ غَفُورٌ رَحِیم

(یعنی تم اپنی لونڈیوں کو مال کے حصول کی خاطر زنا کرنے پر مجبور مت کرو۔ اور جو ان کو مجبور کرے گا خدا بخشنے والا مہربان ہے۔)

صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر کا مقصد اس مکروہ رسم کا خاتمہ تھا یعنی جن لوگوں کے پاس کنیزیں ہیں وہ مال کے حصول کیلئے اُن کا استحصال نہ کریں اور نہ ہی اُنھیں غیروں کے پاس بھیج کر زنا کرنے پر مجبور کریں۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ اس جملے "فَاَنَّ اللّٰہَ مِن بَعدِ اِکراھِھِنَّ غَفُورٌ رَحِیم" سے مراد یہ تھی کہ وہ کنیز جس نے مالک کے حکم کی وجہ سے زنا کیا اسے بخش دیا جائے گا۔ لیکن اس آیت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اِس فعل کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے غفور و رحیم ہے۔ چنانچہ یہ نامناسب عبارت وہ معنی ادا نہیں کرتی جو پیغمبر چاہتے تھے۔ قرآن کے متعلق ابراہیم نظام کی رائے کی طرف دوبارہ اشارہ کرتے ہوئے ہم اس میں یہ اضافہ کرسکتے ہیں کہ ایسی رائے رکھنے کے سلسلے میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ معتزلہ کے کافی لوگ جیسے عباد بن سلیمان[74] اور فوطی[75] جیسے لوگ جو پکے مسلمان کہلاتے تھے، ان کی بھی یہی رائے تھی اور وہ اپنی رائے کو اسلام اور اپنے عقیدے کے منافی نہیں گردانتے تھے۔

ہم عرب کے روشن خیال ترین اور بڑے مفکر ابوالعلاء معرّی کا ذکر رہنے دیتے ہیں جو اپنی تحاریر کو قرآن سے زیادہ طبع زاد اور برتر سمجھتا تھا۔

74: عباد بن سلیمان کا انتقال 870ء میں ہوا۔ وہ معتزلی رہنما اور ہشام بن عمرو فوطی کے حامی تھے۔ انہوں نے کافی کچھ لکھا ہے۔

75: ہشام بن عمرو فوطی معتزلی رہنما تھے۔ ان کا انتقال نویں صدی عیسوی میں ہوا۔

سو سے زیادہ بار قرآن میں عربی گرامر کے قواعد اور تراکیب سے اسی قسم کا انحراف کیا گیا ہے۔ یہ بات بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ قرآن کے مفسرین اور شارحین ان انحرافات کی توجیہ کی خاطر مختلف تاویلات اور تفاسیر پیش کرتے ہیں۔ اُنھی میں زمخشری[76] کا نام بھی شامل ہے۔ جن کا نام عربی زبان کے اماموں کے علاوہ قرآن کے بہترین مفسرین میں بھی شمار ہوتا ہے۔

زمخشری کے ایک اُندلسی ناقد جن کا نام یاد نہیں رہا، نے لکھا ہے: ''یہ مُوشگاف مرد اور عربی زبان کے قواعد وضوابط کا غلام ایک انتہائی فاش غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ قرآنی عبارت پر عربی زبان کے قواعد کا انطباق کریں۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ قرآن کو جوں کا توں قبول کریں اور عربی زبان کے قواعد کو اس کے مطابق ڈھالیں''۔

یہ بات ایک حد تک درست ہے۔ ہر ملک کے فصحاء اور ماہر لسان اپنی قوم کی زبان کے قواعد وضوابط کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ الفاظ کے استعمال اور جملوں کی ترکیب کے سلسلے میں رائج، قابل فہم اور قبول عام اصولوں سے تب تک انحراف نہیں کرتے جب تک اِنھیں نظر انداز کرنے کی ضرورت اُنھیں مجبور نہ کرے۔ عربوں کے ہاں زمانہ قبل از اسلام میں اچھی شاعری اور حسن بیان نشو ونما پا چکے تھے، اس کے علاوہ زبان کے قواعد بھی استوار ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ فصاحت وبلاغت کے

76: محمود بن عمر زمخشری ایرانی نژاد تھے۔ خوارزم کے علاقے زمخشر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے لیے بخارا اور مراکش کا سفر کیا۔ بعد میں مکہ و مدینہ چلے گئے۔ ان کا لقب ''جار اللہ'' یعنی اللہ کا پڑوسی تھا۔ معتزلہ خیالات کے حامل تھے۔ بہت بڑے مفسر، خطیب اور زبان شناس تھے۔ عربی میں لکھتے تھے لیکن تعلیم فارسی میں دیا کرتے تھے۔ درجنوں کتابیں تالیف کیں۔ عربی صرف ونحو پر لکھی گئی اُن کی کتابوں کو ابھی تک عربوں کے ہاں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ''تفسیر الکشاف'' کے نام سے اُن کی لکھی قرآن کی تفسیر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ بعض فقہا تفسیر الکشاف کو پڑھنا حرام قرار دیتے ہیں۔ زمخشری کا انتقال 1144ء میں ہوا۔

حوالے سے قرآن پہلے سے موجود تمام کلام سے برتر ہے۔ لہٰذا اِس میں زبان کے اصولوں اور فصاحت کے ضوابط کے حوالے سے کم انحراف ہونا چاہیے تھا۔

زمخشری پر اُندلسی کی تنقید میں یہ عیب ہے کہ اس نے پورے قضیے کو الٹا کے رکھ دیا ہے۔ قضیے کی بنیاد کو یوں ہونا چاہیے تھا۔

قرآن فصاحت کی اُس انتہائی حد پر ہے کہ کوئی انسان اُس جیسا کلام لانے سے عاجز ہے۔ لہٰذا یہ خدا کا کلام ہے۔ چنانچہ جو اسے لے کر آیا ہے وہ پیغمبر ہے۔

لیکن اُندلسی ناقد کا کہنا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے، چنانچہ یہ طبع زاد اور ناقابل تبدیل ہے۔ اس میں عربی زبان کے قواعد سے جو بھی انحراف کیا گیا ہے، اس کے لیے عربی زبان کے قواعد کو تبدیل کیا جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ لوگ چاہتے ہیں کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو حضرت محمد کی نبوت کی دلیل قرار دیں تاکہ منکرین قائل ہو سکیں۔ زمخشری کے ناقد کے نزدیک محمد کی نبوت ایک مسلّم امر ہے اور چونکہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، تو پھر اس سلسلے میں کچھ بھی مزید کہنے یا سننے کی گنجائش نہیں بچتی، جو بھی کہا گیا ہے اسے جُوں کا توں قبول کر لیا جائے۔

اس کے باوجود قرآن دورِ جاہلیت کے ادب کے سامنے ایک بے مثال اور منفرد تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ مکّی سورتوں، مثلاً سورت النّجم میں ہم خود کو حساس اشعار اور روحانی رزمیے کے روبرو پاتے ہیں۔ جو محمد کی قوت بیان و استدلال اور خطابت کے علاوہ اُن میں دوسروں کو قائل کرنے کی پنہاں صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اگر آیت 33 جو کہ مدنی آیات میں سے ہے، کو علیحدہ کر لیں، تو انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ عثمان اور اس کے ساتھیوں نے کیا سوچ کر اسے مکّی سورت میں درج کیا۔ یہ سورت لطافت، شیرینی اور فکر

انگیزی میں سلیمان بن داؤد کی غزل الغزلات کی مانند ہے، سوائے اس کے کہ اس سورت میں یروشلم کی خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا ذکر نہیں جن کے پستانوں کی رنگت کوہِ جعلاد پر سوئی ہوئی سفید بھیڑوں کی مانند ہے۔ رجز خوانی اس قدر بلند پایہ ہے کہ خدا کی طرف سے بھیجے ہونے کا گمان ہوتا ہے اور پیغمبر کی وحی واشراق اور خوابوں کو بہت اچھے انداز میں بیان کرتی ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰی۔ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی۔ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا يَرٰی۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی۔ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰی۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی۔

ظاہر ہے کہ اس خوبصورت سورت کی چند آیات کے ترجمے سے محمد کی روح کی گرمی احاطہ نہیں کیا جاسکتا جو پڑھنے والے پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے، پھر بھی ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے

”غائب ہوتے تارے کی قسم، تمہارا رفیق نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ وہ بدکار ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی ہے اور ایک طاقتور فرشتہ اس کے سامنے ظاہر ہوا ہے۔ جس نے اسے اللہ کے احکامات سکھائے ہیں۔ وہ پیغمبر سے دو کمان فاصلے تک نزدیک آیا اور اس سے دوبدو باتیں کیں۔ اس کشف اور وحی کے سلسلے میں وہ تم سے جھوٹ نہیں بولتا۔ تم اس کے کشف اور اشراق کے متعلق جھگڑتے ہو۔ اور اس نے سدرۃ المنتہیٰ اور اس کے نزدیک بہشت کو دیکھا ہے۔ جو اس نے دیکھا ہے وہ اس کو بیان کرنے میں خیانت سے کام نہیں لے رہا۔ اس نے خداوند کے عجائبات دیکھے ہیں“۔

پندونصائح کے بعد اللہ کہتے ہیں۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی عَنۡ ذِکۡرِنَا وَلَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ۔ ذٰلِکَ مَبۡلَغُہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اہۡتَدٰی۔

(اور وہ جو ہم سے روگردانی کرتے ہیں اور دنیاوی زندگی کے ہی خواہاں ہیں تم ان سے منہ موڑ لو۔ یہ اس سے زیادہ نہیں جانتے اور تمہارا خدا ان کے متعلق سب سے زیادہ جانتا ہے: النّجم۔30،29)

ایک روز پیغمبر کے چچا کی بیوی ام جمیل آئی اور عورتوں کے انداز میں طعنہ دیا: "لگتا ہے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے"۔ یہ وہ وقت ہے جب وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور محمد اس قدر متفکر اور غمگین تھے کہ وہ خود کو پہاڑ سے گرانے کے متعلق سوچ رہے تھے[77]۔ اس واقعہ کے بعد الضّحیٰ جیسی مترنم سورت نازل ہوئی۔ اس خوبصورت سورت میں ابولہب کی تمسخرانہ بات کا ذکر نہیں بلکہ تسلی اور نوید دی گئی ہے۔

77: "میں نے دل میں کہا میرا نفس ضرور شاعر یا آسیب زدہ ہے مگر میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قریش میرے متعلق اس کا چرچا کریں۔ میں پہاڑ کی کسی بلند چوٹی پر چڑھ کر وہاں سے خودکُشی کیے لیتا ہوں تاکہ اس رُسوائی کے خیال سے اطمینان ہو۔ چنانچہ میں اس ارادے سے چلا پہاڑ کے وسط تک پہنچا تھا کہ میں نے آسمان سے یہ آواز آتے سُنی کہ کوئی کہہ رہا ہے: "اے محمد! تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرائیل ہوں"۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا مجھے جبرائیل انسان کی شکل میں نظر آئے، اُن کے دونوں قدم آسمان کے افق تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ کہہ رہے تھے: "اے محمد! تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرئیل۔ میں اُن کو دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس منظر نے مجھے میرے ارادے سے ایسا مشغول کیا کہ میں بغیر آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے وہیں ٹھہر گیا اور جبرئیل سے نظریں ہٹا کر آسمانوں کو دیکھنے لگا مگر جدھر میری نظر جاتی تھی وہی سامنے تھے۔ میں دیر تک بغیر آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے اُسی جگہ کھڑا رہا۔ تاریخ الرسل والملوک، محمد بن جریر الطبری

وَالضُّحیٰ۔ وَاللَّیلِ اِذا سجیٰ۔ ما ودّعک ربُّک وما قلیٰ۔ وللاخِرۃُ خیرٌ لک مِن الاولیٰ۔ ولسوف یُعطیک ربُّک فترضیٰ۔ الم یجِدک یتیماً فآویٰ۔ ووجدکَ ضالاًّ فھدیٰ۔ ووجدکَ عائِلاً فاغنیٰ۔ فأمّا الیتیمَ فلا تقھر۔ واَمّا السّائِلَ فلا تنھر۔ واَمّا بِنِعمۃِ ربّک فحدِّث۔

(دن کی روشنی کی قسم اور رات کی جب چھا جائے کہ تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ ناراض ہوا۔ اور آخرت تمہارے لیے پہلی سے کہیں بہتر ہے اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟ اور راستے سے بے خبر پایا تو راستہ دکھایا اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور سائل کو جھڑکا نہ کرو اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا (الضّحیٰ: 1 تا 11)

انصاف کی بات ہے کہ قرآن ایک اچھوتی کتاب ہے۔ مّکی اور چھوٹی سورتوں میں پُر معنی اظہار اور قائل کرنے کی جو قوت ہے۔ عربی زبان میں یہ انداز بیان ہمیں اس سے پہلے نہیں ملتا۔ اور پھر یہ ایک ایسے انسان کے منہ سے ادا ہوا جو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اس نے نہ مطالعہ کیا اور نہ ہی ادب تخلیق کرنے کی تربیت حاصل کی۔ یہ ایک عطیہ تھا جس کی نظیر پہلے نہیں ملتی۔ اگر اس لحاظ سے اسے معجزہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ لیکن قرآن کے اندر درج مواد کو جو لوگ معجزہ تصور کرتے ہیں وہ مشکل صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں کوئی بھی ایسی نئی بات نہیں ہے جو پہلے لوگوں نے بیان نہ کی ہو۔ قرآن کی تمام اخلاقی تعلیمات مسلمہ امور کے طور پہلے سے ہی رائج تھیں۔ پیغمبروں کی کہانیاں یہودی روایات سے لی گئی ہیں۔ جو محمد نے اپنے شام کے سفر کے دوران راہبوں اور عاد وثمود سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے بات چیت کے دوران سنیں اور اُنھیں ہو بہو یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دوہرا دیا۔

[78] اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اس امر سے محمد کی شان میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ ایک ان پڑھ آدمی جس نے اوہام اور خرافات میں لتھڑے ایک معاشرے میں پرورش پائی ۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں فساد اور لڑائیاں رائج تھیں۔ جہاں طاقت اور بے رحمی کے علاوہ کسی ضابطے کا وجود نہ تھا۔ ایسے معاشرے سے اٹھ کر یہ آدمی شرک اور برائی سے روکتا ہے اور اُنھیں مسلسل گزشتہ اقوام کی باتیں بتاتا ہے۔ اُس کا روحانی عزم اور پاک ضمیر کی آواز اس کے پیدائشی نابغہ پن کا ثبوت تھی۔ اُس ان پڑھ انسان کو سنیں جب وہ سورت عَبَسَ میں بولتا ہے۔ یہ سورت روحانی موسیقی اور روحانی قوت کا مکمل نمونہ ہے۔ ان خوش آہنگ آیات میں محمد کے گرم دل کی دھڑکن یوں سنائی دیتی ہے۔

قُتِلَ الاِنسانُ ما اَکفَرَہُ۔ مِن اَیِّ شَیءٍ خَلَقَہُ۔ مِن نُطفَۃٍ خَلَقَہُ فَقَدَّرَہُ۔ ثُمَّ السَّبیلَ یَسَّرَہُ۔ ثُمَّ اَماتَہُ فَاَقبَرَہُ۔ ثُمَّ اِذا شاءَ اَنشَرَہُ۔ کلاَّ لَمّا یَقضِ ما اَمَرَہُ۔ فَلیَنظُرِ الانسانُ اِلی طَعامِہِ۔ اَنّا صَبَبنَا الماءَ صَبّاً۔ ثُمَّ شَقَقنَا الاَرضَ شَقّاً۔ فَاَنبَتنا فیھا حَبّاً۔ وَ عِنَباً وَ قَضبا۔ وَزَیتوناً وَنَخلاً۔ وَ حَدائِقَ غُلباً۔ وَ فاکِہۃً وَ اَبّاً۔ مَتاعاً لَکُم وَلِاَنعامِکُم۔ فَاِذا جاءَتِ الصّاخَّۃُ۔

78: بعض محققین اس دعوے کو رد کرتے ہیں کہ محمد ان پڑھ تھے۔ اُن کے بقول عربی زبان میں اُمّی سے مراد غیر اہل کتاب ہونا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورت الجُمُعَۃ کی دوسری آیت اُنھی معنوں میں آئی ہے: "هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا" (وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول اُنھی میں سے مبعوث فرمایا)۔ لیکن اکثریت کا اجماع ہے۔ اور اس بات کے کافی ثبوت ملتے ہیں کہ حضرت محمد لکھنے پر قادر نہیں تھے۔ شائد بعد میں وہ کچھ الفاظ پڑھ سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں سورت العنکبوت کی آیت 48 میں واضح انداز میں لکھا ہوا ہے: "وَما کُنتَ تَتلو مِن قَبلِہِ مِن کِتابٍ وَلا تَخُطُّہُ بِیَمینِكَ" (اور اس سے پہلے تو نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ سکتا تھا)۔ اور سورت الفُرقان کی آیت 5 میں واضح انداز سے لکھا ہوا ہے: "وَقالوا أَساطیرُ الأَوَّلینَ اکتَتَبَھا فَھِيَ تُملیٰ عَلَیہِ بُکرَۃً وَأَصیلًا" (اور کہتے ہیں یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں جو اُنھوں نے لکھ رکھی ہیں اور صبح و شام اسے سنائی جاتی ہیں)۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین کو اس بات کا علم تھا کہ محمد لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔

(انسان پر خدا کی مار وہ کیسا ناشکرا ہے۔ اس نے کس چیز سے اس کو بنایا۔ ایک بوند سے اس کو بنایا پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔ پھر اس پر راستہ آسان کر دیا۔ پھر اس کو موت دی پھر اس کو قبر میں رکھوایا۔ پھر جب چاہے گا اٹھا کر کھڑا کرے گا۔ ایسا نہیں چاہیے اس نے تعمیل نہیں کی جو اس کو حکم دیا تھا۔ پس انسان کو اپنے کھانے کی طرف غور کرنا چاہیے۔ کہ ہم نے اوپر سے مینہ برسایا۔ پھر ہم نے زمین کو چیر کر پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور۔ اور گھنے باغ اور میوے اور گھاس۔ تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے سامان حیات۔ پھر جس وقت کانوں کا بہرا کرنے والا شور برپا ہو گا:17 تا33)۔

اس ترتیب سے ادا ہوئے ان خوبصورت جملوں کا حافظ شیرازی کی غزلیات کی مانند ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، جو ایک ان پڑھ کے منہ سے ادا ہوئے اور دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

گو اس قسم کے خوبصورت خطبات سے محمد اپنی قوم کو ہدایت دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور ہر وقت ان کی شخصیت سے روحانیت کا اظہار ہوتا ہے، لیکن اخلاقی ضوابط کے حوالے سے قرآن کو معجزہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ محمد نے اُنھی اصولوں کو دوہرایا ہے جو صدیوں پہلے کا انسان کہہ چکا تھا اور یہ ہر جگہ کہے جا چکے تھے۔ مہاتما بدھ، کنفیوشس، زرتشت، سقراط، عیسیٰ و موسیٰ کے ہاں بھی ہمیں یہی تعلیمات اور احکامات ملتے ہیں جنھیں اسلام لے کر آیا تھا۔

قوانین وضوابط کے لحاظ سے

سب سے پہلی بات جو یاد رکھنی چاہیے کہ یہ احکامات روزمرہ کے واقعات اور ضرورت مندوں کے سوالات کی بنیاد پر وضع ہوئے، یوں ان میں تبدیلی اور ناسخ و منسوخ موجود ہے۔ اور دوسری بات جو نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلامی فقہ مسلمان علماء کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اور ہجرت

کے بعد تین صدیوں کے دوران مدون ہوا، کیونکہ ہجرت سے ڈیڑھ صدی بعد آنے والے نئے مسلمانوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے شرعی قوانین بہت مختصر اور ناکافی تھے۔ مزید اہم اور قابل غور و فکر نکتہ یہ ہے کہ ان احکامات کی اکثریت یہودی شریعت سے ماخوذ ہے یا زمانہ جاہلیت کے عربوں کی عادات و رسوم کا تسلسل ہیں۔

روزہ

مثلاً روزہ اسلام میں یہودیوں سے آیا۔ زمانہ جاہلیت میں عرب عاشورہ یعنی دس محرم کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ مدینہ ہجرت کے بعد جب قبلہ کا رخ تبدیل ہوا تو روزہ رکھنے کے دن بھی تبدیل کر دیئے گئے۔ اب محرم کے پہلے دس دن روزہ رکھا جانے لگا۔ اس کے بعد یہودیت سے مکمل علیحدگی کا اظہار کرنے کیلئے روزہ رکھنے کیلئے رمضان کا پورا مہینہ مختص کر دیا گیا۔

نماز

ہر مذہب میں عبادت کا تصور موجود ہے اور اسے ہر مذہب میں بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ جس میں خدا کی طرف منہ کر کے اُس کی ستائش کی جاتی ہے۔ اسلام میں نماز کی ادائیگی اوّلین فریضہ ہے۔ اسے جس شکل اور طرز میں ادا کیا جاتا ہے اس کی بنیاد روایت پر قائم ہے، وگرنہ اس سے متعلق جزئیات اور تفصیلات قرآن میں درج نہیں ہیں۔ قیام مکّہ کے دوران کی تمام مدت، یعنی رسالت کے پہلے تیرہ سال اور مدینہ ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد تک یہودیوں اور مسلمانوں کا ایک ہی قبلہ یعنی مسجد اقصیٰ تھا۔

حج

عربی عادات و رسوم کو اپناتے ہوئے حج کو فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ حج اور عمرہ کے تمام مناسک، احرام باندھنا، حجر اسود کو چھونا اور بوسہ دینا، صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا، عرفات میں رکنا، شیطان کو کنکریاں

مارنا، یہ سب دور جاہلیت میں رائج تھا۔ دور جاہلیت کے حج کو اسلامی حج میں ڈھالنے کے لیے تھوڑی سی اصلاح کر دی گئی ہے۔

قبل از اسلام کے عرب طواف کے دوران "لبیک یا لات"، "لبیک یا عزیٰ" اور "لبیک یا منات" کے الفاظ ادا کرتے تھے۔ اور اپنے قومی بت کا نام لیتے تھے۔ اسلام میں ان بتوں کے ناموں کی جگہ "اللھم" نے لی، اور وہ عبارت یوں ادا کی جانے لگی "لبیک اللھم لبیک"۔

حج کے مہینے میں شکار کرنے کو عرب حرام سمجھتے تھے۔ پیغمبر نے شکار کی حرمت خاص دنوں میں، یعنی حج کے دوران اور جب احرام پہنا ہوا ہو، مقرر کر دی۔ بعض اوقات کچھ بدّو قبائل ننگے طواف کیا کرتے تھے اسلام نے اس سے منع کر دیا اور ان سلا کپڑا اپہننے کا حکم جاری کیا۔ عرب قربانی کا گوشت کھانے سے کراہت محسوس کرتے تھے، پیغمبر نے اسے کھانے کی اجازت دے دی۔

مشہور ہے کہ فتح مکّہ کے بعد جب قریش کے بتوں کو کعبہ سے ہٹا دیا گیا تو مسلمانوں نے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا کیونکہ قبل از اسلام ان دونوں پہاڑیوں پر پتھر کے دو بت پڑے ہوئے تھے، اور زمانہ جاہلیت کے حاجی اور زائرین صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان دوڑا کرتے تھے تا کہ ان کے قریب جا کر اُنھیں چھُو کر اور بوسہ دے کر برکت حاصل کر سکیں۔ لیکن پیغمبر نے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے کو نہ صرف جائز ٹھہرایا، بلکہ سورت البقرۃ کی آیت 158 میں اسے شعائر اللہ قرار دیا۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ

(بے شک صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے۔ (بلکہ طواف ایک قسم کا نیک کام ہے) اور جو کوئی نیک کام کرے تو خدا قدر شناس اور دانا ہے)۔

شہرستانی[79] نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے۔ اسلام کی بہت سے فرائض و سنت قبل از اسلام عربوں کی اُن رسوم کا تسلسل ہے جو اُنھوں نے یہودیوں سے مستعار لیں تھیں۔ اُن وقتوں میں ماں اور بیٹی سے شادی حرام تھی۔ باپ کی بیوی سے شادی کی اجازت نہ تھی۔ دو بہنوں سے شادی کو قبیح فعل اور باپ کی بیوی سے شادی کو حرام تصور کیا جاتا تھا۔ غسل جنابت، میت کو چھونے کے بعد غسل کرنا، کلی کرنا، پانی سے نتھنوں کو صاف کرنا، سر کو مسح کرنا، مسواک کا استعمال، استنجاء، ناخن کاٹنا، بغلوں اور زیر ناف بالوں کی صفائی، ختنہ، چور کا دایاں ہاتھ کاٹنا، یہ سب کچھ اسلام کے ظہور سے پہلے عربوں کے ہاں رائج تھا۔ ان رسوم کی اکثریت یہودیوں کے ہاں سے آئی تھی۔

جہاد اور زکات

فرائض اسلام میں دو فریضے ایسے ہیں جو صرف اسلام میں پائے جاتے ہیں، یہ جہاد اور زکات ہیں۔ دوسرے مذاہب میں ان فرائض کے نہ ہونے کی وجہ یہ تھی، کہ ان مذاہب کے بانیوں کے ذہن میں وہ ہدف نہیں تھا جسے محمد حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ محمد ایک ریاست کو تشکیل دینا چاہ رہے تھے جس کا قیام فوج اور سرمائے کے بغیر نہ تو ممکن تھا اور نہ ہی وہ زیادہ دیر تک قائم رہ سکتی تھی۔ جہاد ایک خالص اسلامی

79: ابوالفتح محمد شہرستانی 1076ء میں خراسان میں پیدا ہوئے، اور اپنے ملک میں ہی تعلیم پائی۔ حصول تعلیم کے بعد حج کے لیے مکہ گئے اور اس کے بعد تین سال تک بغداد میں مقیم رہے۔ خراسان واپس آنے کے بعد اپنی باقی عمر تحقیق و تالیف میں گزاری۔ 1153ء میں وفات پائی۔ "الملل والنحل" اُن کی اہم ترین کتاب ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

فریضہ ہے جس کو پہلے کسی انسان نے وضع نہیں کیا تھا۔ اور یہ محمد کی فہم و فراست اور حقیقت شناسی تھی کہ اُنھوں نے دریافت کر لیا تھا کہ اُن کے مقصد کے حصول کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو خوش آہنگ اور روحانی مکّی سورتوں سے نہیں بلکہ تلوار کی مدد سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ ہر لمحے جنگ کے لیے تیار ایک ایسے لشکر کی موجودگی جس کا ہر لشکری صحت مند اور جنگ کرنے پر قادر ہو، اس کے لیے سرمائے کی اشد ضرورت تھی۔ اگرچہ جنگ کرنے والوں کیلئے مال غنیمت کے حصول ایک محرک تھا لیکن ایک مستحکم اور قابل اعتماد ذریعے کی ضرورت تھی جسے زکات نے پورا کیا۔

شراب نوشی اور جوا

محمد کی تعمیری سوچ اور بصیرت نے نئے معاشرے کے حالات اور ضروریات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ جس سے اُنھیں اپنے اہداف کے حصول میں آسانی رہی۔ اس سلسلے کی ایک مثال شراب نوشی کو حرام قرار دے کر اسلامی قوانین کا حصہ بنانا بھی تھا۔ جس کے لیے عربوں کے مخصوص مقامی سماجی حالات کو مد نظر رکھا گیا۔ عرب بہت غصیلے اور گرم خون کے مالک تھے اور ان کے ہاں شراب نوشی عام تھی، جسے پی کر وہ فساد اور شر پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اسے تین مرحلوں میں ختم کیا گیا۔

سب سے پہلے سورت البَقَرَة کی آیت نمبر 219 آتی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ (لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں)۔

اس کے بعد ایک آیت تب نازل ہوتی ہے جب ایک مہاجر نماز پڑھنے کیلئے غلطی سے نشے کی حالت میں آتا ہے تو اُس حالت کے مطابق آیت نازل ہوتی ہے۔

يا اَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُو لاتَقرَبُوا الصَّلوٰةَ وَ اَنتُم سَكارىٰ۔ (اے ایمان والو! جس وقت کہ تم نشہ میں ہو نماز کے نزدیک نہ جاؤ: النِّساء۔ 43)۔

لیکن اس کی مطلق حرمت اور اس کی دلیل سورت المائدۃ کی آیت 90 اور 91 میں آتی ہے۔ آیت 90 میں بہت واضح اور حکمیہ لہجے میں فرمایا گیا ہے۔

اِنَّمَا الخَمرَ وَ المَيسِرَ وَ الاَنصابُ وَ الاَزلامُ رِجسٌ مِن عَمَلِ الشَّيطانِ فَاجتَنِبُوهُ۔ (اے ایمان والو شراب اور جوا اور بت اور فال کے تیر سب شیطان کے گندے کام ہیں سو ان سے بچتے رہو)۔

شراب کا ذکر ہمیشہ جوئے کے ساتھ آیا ہے لیکن یہاں "الاَنصابُ وَ الاَزلامُ" کے الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے فال نکالنے یا سعادت حاصل کرنے کے لیے بتوں کو نصب کرنے اور تیروں کے استعمال کو بھی شیطانی کام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس سے اگلی آیت 91 میں شراب اور جوئے پر زور دیتے ہوئے اس کی حرمت کی وجہ بھی بیان فرما دی گئی ہے۔ اور اس بات کا قوی احتمال ہے کہ یہ آیت کسی ناخوشگوار واقعے[80] کے نتیجے میں نازل ہوئی:

80: علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جنگ بدر کی غنیمت میں سے مجھے ایک اور اونٹنی ملی تھی اور اسی جنگ کی غنیمت میں سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو خمس کے طور پر حصہ مقرر کیا تھا اس میں سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک اونٹنی عنایت فرمائی تھی۔ پھر میرا ارادہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی کرا لاؤں۔ اس لیے بنی قینقاع کے ایک سنار سے بات چیت کی کہ وہ میرے ساتھ چلے اور ہم اذخر گھاس لائیں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس گھاس کو سناروں کے ہاتھ بیچ دوں گا اور اس کی قیمت ولیمہ کی دعوت میں لگاؤں گا۔ میں ابھی اپنی اونٹنی کے لیے پالان، ٹوکرے اور رسیاں جمع کر رہا تھا۔ اونٹنیاں ایک انصاری صحابی کے حجرہ کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں جن انتظامات میں تھا جب وہ پورے ہو گئے تو (اونٹنیوں کو لینے آیا) وہاں دیکھا کہ ان کے کوہان کسی نے کاٹ دیے ہیں اور کوکھ چیر کر اندر سے کلیجی نکال لی ہے۔ یہ حالت دیکھ کر میں اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ میں نے پوچھا، یہ کس نے کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے اور وہ ابھی اسی حجرہ میں انصار کے ساتھ شراب نوشی کی ایک

اِنَّما یُرِیُد الشَّیطانَ اَن یُوقِعَ بَینکَمَ العَداوَۃَوَ البَعضاءَ فِی الخَمرِ وَالمَیسرِ وَیَصُدَّکُم عَن ذِکرِ اللہِ وَعَنِ الصّلوٰۃِفَھَل اَنتُم مُنتَھُونَ

(شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تم میں دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکے تو کیا تم باز آئے؟)۔

ہماری نظر میں یہ آیت گذشتہ سطور کی تائید کرتی ہیں کہ شراب نوشی اور جوا کھیلنا عربوں کے درمیان جھگڑوں اور فساد کا باعث بنتا تھا۔ جہاں تک اسلام کے زنا، لواطت، کثیر الازواجی سے متعلقہ مسائل، طلاق اور دیگر احکامات کا تعلق ہے ان میں سے اکثریت تو یہودیوں شریعت کو تبدیل کر کے بنائے گئے ہیں اور باقی عربوں کے ہاں پہلے سے موجود رسوم ورواج کی اصلاح کے نتیجے میں وجود میں آئے۔

مجلس میں موجود ہیں۔ ان کے پاس ایک گانے والی ہے اور ان کے دوست احباب ہیں۔ گانے والی نے گاتے ہوئے جب یہ مصرع پڑھا۔ ہاں، اے حمزہ! یہ عمدہ اور فربہ اونٹنیاں ہیں، تو حمزہ رضی اللہ عنہ نے کود کر اپنی تلوار تھامی اور ان دونوں اونٹنیوں کے کوہان کاٹ ڈالے اور ان کی کوکھ چیر کر اندر سے کلیجی نکال لی۔ علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ پھر میں وہاں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے غم کو پہلے ہی جان لیا اور فرمایا کہ کیا بات پیش آئی؟ میں بولا: یارسول اللہ! آج جیسی تکلیف کی بات کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ حمزہ رضی اللہ عنہ نے میری دونوں اونٹنیوں کو پکڑ کے ان کے کوہان کاٹ ڈالے اور ان کی کوکھ چیر ڈالی ہے۔ وہ یہیں ایک گھر میں شراب کی مجلس جمائے بیٹھے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک منگوائی اور اسے اوڑھ کر آپ تشریف لے چلے۔ میں اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ ساتھ ہو لئے۔ جب اس گھر کے قریب آپ تشریف لے گئے اور حمزہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا تھا اس پر اُنھیں تنبیہ فرمائی۔ حمزہ رضی اللہ عنہ شراب کے نشے میں مست تھے اور اُن کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اُنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر اٹھائی، پھر ذرا اور اوپر اٹھائی اور آپ کے گھٹنوں پر دیکھنے لگے، پھر اور نظر اٹھائی اور آپ کے چہرہ پر دیکھنے لگے۔ پھر کہنے لگے، تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے کہ وہ اس وقت بے ہوش ہیں۔ اس لیے آپ فوراً الٹے پاؤں اس گھر سے باہر نکل آئے، ہم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی)۔

ان سب باتوں کے باوجود قرآن ایک معجزہ ہے۔ لیکن یہ اُن دوسرے معجزات کی مانند نہیں جو گذشتہ صدیوں کی دھند اور غبار میں لپٹی ہوئی کہانیوں میں گھرے ہوئے ہیں، اور صرف سادہ لوح اور کم عقل لوگوں کے عقیدے کا حصہ ہیں۔ نہیں، قرآن معجزہ ہے، ایک جیتا جاگتا اور بولتا ہوا معجزہ۔ قرآن معجزہ ہے، اپنی فصاحت و بلاغت کے حوالے سے نہیں اور نہ ہی اس میں درج اخلاقی مضامین یا شرعی قوانین کی وجہ سے۔ قرآن اس حوالے سے معجزہ ہے کہ تنہا اور خالی ہاتھ، لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت سے محروم محمد اس کے وسیلے سے اپنے لوگوں پر غالب آئے، اور ایک ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔ قرآن معجزہ ہے کیونکہ اس نے سرکش لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا اور اس کی آیات کے وسیلے سے محمد نے اپنے ارادوں کو اُن پر جاری کیا۔ محمد نے قرآن کو اپنی رسالت کے سچے ہونے کی سند کے طور پر پیش کیا۔ کیونکہ خدا کی جانب سے اُن پر وحی نازل ہوتی ہے جو وہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

وحی کا لفظ قرآن میں ساٹھ بار سے زیادہ آیا ہے اور غالباً ہر بار اس لفظ کو لغوی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے کہ عبارت کو ذہن میں ڈالا گیا۔ اس کے دوسرے معنی پھینکنا یا کسی مخفی چیز کا تیز اشارہ ہیں۔ چنانچہ جب بھی حضور پر وحی نازل ہوتی تھی آپ جلدی سے کسی کاتب وحی سے اس کو لکھوا لیتے تھے۔ قرآن میں دو تین بار اس اشارے کو سمجھے بغیر جلد بازی سے کتابت کروانے کے متعلق درج ہے۔

وَلا تَعجَل بِالقُرآنِ مِن قَبلِ اَن یُقضی اِلَیکَ۔ (اور قرآن میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تمہیں پوری نہ ہولے: طٰہٰ۔ 114)۔

لا تُحَرِّک بِہٖ لِسانَکَ لِتَعجَلَ بِہٖ (وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو کہ اس کو جلد یاد کر لو: القیامۃ۔ 16)۔

اس جلد بازی کے اندر ایک گہرا نکتہ پوشیدہ ہے کہ وحی کی حالت ایک مخصوص قسم کی حالت ہوا کرتی تھی، اُس لمحے پیغمبر کے ذہن میں جو شعلہ چمکتا تھا وہ روز مرّہ کی زندگی سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ اُس کے متعلق صحیح مسلم میں ابو سعید خدری سے روایت کردہ ایک حدیث درج ہے۔ حضور فرماتے ہیں:

"قران کے علاوہ میری کسی بات کو نقل نہ کیا کرو، اگر قرانی نص کے علاوہ کچھ لکھا گیا ہے تو اسے حذف کر دو"۔

یہ اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ وحی کے وقت حضور کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ گویا وہ اندرونی طور پر شدید قسم کی تھکاوٹ اور جہد سے گزرے ہیں۔ صحیح بخاری میں عائشہ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے حضور سے وحی کی کیفیت کے متعلق پوچھا، تو اُنھوں نے فرمایا: ان میں سے سخت ترین صورت وہ ہوتی ہے جب گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے پھر خاموشی کے بعد مجھے سب یاد ہو چکا ہوتا ہے کبھی فرشتہ ایک مرد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور مضمون مجھ تک پہنچانے کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔

عائشہ کہتی ہیں: کہ وحی کے دوران خواہ سردیوں کے دن ہی کیوں نہ ہوں حضور کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو جاتی تھی اور اس کے لیے وہ صفوان بن یعلیٰ بن امیہ سے روایت کردہ ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہتی ہیں[81]۔ یعلیٰ کی بہت خواہش تھی کہ وہ وحی کے وقت حضور کی حالت کا مشاہدہ کریں۔

81: صفوان بن یعلیٰ بن امیہ نے بیان کیا، ان سے ان کے والد نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا جبہ پہنے ہوئے اور اس پر خلوق یا زردی کا نشان تھا۔ اس نے پوچھا مجھے اپنے عمرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کپڑا ڈال دیا گیا، میری بڑی آرزو تھی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہو رہی ہو تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہاں آؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہو رہی ہو، اس وقت تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے آرزومند ہو؟ میں نے کہا ہاں! اُنھوں نے کپڑے کا کنارہ اٹھایا اور میں نے اس میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ زور زور سے خراٹے لے

ایک روز ایک شخص جس نے اپنے جبہ کو خوشبو لگائی ہوئی تھی، حضور سے سوال کیا کہ وہ اس جبے کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کر سکتا ہے؟۔ اسی لمحے وحی نازل ہوئی تو عمر نے یعلیٰ کو اشارے سے بلایا تو اس نے اندر آ کر دیکھا کہ حضور نیند کی حالت میں ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں اور ان کے چہرے کی رنگت سرخ ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اس حالت سے باہر آئے تو سوال کرنے والے کو فرمایا کہ اپنے احرام اور خود کو تین مرتبہ صاف کرو اور جبے کے بغیر عمرہ کرو۔

رہے تھے، میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے بیان کیا "جیسے اونٹ کے سانس کی آواز ہوتی ہے" پھر جب وحی اترنی بند ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے جو عمرہ کے بارے میں پوچھتا تھا؟ اپنا جبہ اتار دے، خلوق کے اثر کو دھو ڈال اور زردی صاف کر لے اور جس طرح حج میں کرتے ہو اسی طرح اس میں بھی کرو۔ (صحیح بخاری، کتاب العُمرہ)۔

محمد بشر ہیں

انبیاء عامی بدندی گر نہ از الطاف خویش

بر مس ہستی آنان کیمیا می ریختی

انبیا عام انسان ہوتے اگر تم اُن کے تانبے جیسے وجود پر کیمیا ڈالنے کی مہربانی نہ کرتے[82]۔

۔مولوی۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق اسلام کے اوّلین دور کے تمام علما اس بات پر متفق تھے کہ روحانی امتیاز کے علاوہ پیغمبر ایک عام انسان تھے۔

قُل إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثلُكُم يُوحَى إِلَيَّ۔

(کہہ دو کہ میں بھی تمہارے ہی جیسا آدمی ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے:الکھف۔110)۔

حتیٰ کہ اہل سنت کے علما بھی علم اور معصومیت کو نبی کی ذات یا صفات کا لازمی جزو نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے خدا کی طرف سے دیا ہوا عطیہ کہتے تھے۔ بنیادی سوال یہ ہے۔ کیا خدا کسی انسان کو اُس کے علم، معصومیت اور مافوق البشر خصوصیات کی وجہ سے نبوّت سے سرفراز کرتا ہے یا جب وہ کسی انسان کو دوسروں کی ہدایت کے لیے مأمور کرتا ہے تو اسے بشری اور مافوق البشری خصوصیات عطا کر دیتا ہے؟۔

82: پیغمبر بھی عام انسانوں جیسے ہوتے ہیں، لیکن عقیدت کی وجہ سے پیروکار اُن سے مافوق الفطرت باتیں منسوب کر دیتے ہیں۔ یعنی عقیدت کی وجہ سے لوگ تانبے کو بھی سونا سمجھنا اور کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی مضمون پر فارسی کی ایک کہاوت ہے۔ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔ پیر نہیں اڑتے اُنھیں مرید اڑاتے ہیں۔ ہندوؤں کا بھی یہی ماننا ہے کہ یہ آپ کی شردھا ہے جو آپ کو ایک پتھر کے اندر پرماتما دکھا دیتی ہے

اس مسئلے پر ان علماء کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ ایک انسان پر اس لیے ایمان لائے ہیں کہ اُس پر وحی نازل ہوتی ہے نہ کہ خدا نے اُس کی علمی و اخلاقی سطح کو دوسروں سے بلند تر قرار دیا ہے۔ پیغمبر بھی اس بات کو جانتے تھے چنانچہ اسی سلسلے میں قرآن کا حوالہ دیتے تھے۔

وَ کَذٰلِکَ اَوحَینا اَلَیکَ رُوحاً مِن اَمرِنا ما کُنتَ تَدرِی مَا الکِتابُ وَلاَ الایمانُ وَلکِن جَعَلناہُ نُوراً نَّھدِی بِہِ مَن نَشاءُ مِن عِبادِنا

(اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے تمھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر اُس روح کو ہم نے ایک روشنی بنادیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں: الشّوریٰ۔52)۔

اس سے پہلی آیت بھی اسی مضمون پر دلالت کرتی ہے۔ خصوصی طور سورت الأنعام کی آیت نمبر 50 اس صورت حال کو واضح انداز میں بیان کرتی ہے جو کسی کے پیغمبر سے معجزہ دکھانے کے تقاضے کا جواب ہے۔

قَل لا اَقُولُ لکُم عِندِی خَزائِنُ اللہِ وَلا اَعلمُ الغَیبَ وَلا اَقُولُ لکُم اِنّی مَلکٌ اِن اَتَّبِعُ اِلا ما یُوحیٰ اِلَیَّ

(کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے آتا ہے)۔

سورت الأعرَاف کی آیت نمبر 188 میں فرمایا گیا ہے:

قَل لا اَملِکُ لِنَفسی نَفعاً وَلا ضَرّاً اِلا ما شاءَاللہُ وَلو کُنتُ اَعلَمُ الغَیبَ لاَستَکثَرتُ مِنَ الخَیرِ وَما مَسَّنِیَ السّوءُ اِن اَنَا اِلا نَذیر وَبَشیر لِقَومٍ یُؤمِنُونُ

(کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں تو مؤمنوں کو ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں)

نیز یہ آیت مشرکین کی اس بات کا بھی جواب ہے جو کہتے تھے کہ اگر یہ سچ کہتا ہے اور عالم غیب کے ساتھ اس کا تعلق ہے تو یہ تجارت سے زیادہ منافع کیوں نہیں کماتا۔

قرانی آیات اس موضوع پر بہت واضح اور قطعیت کی حامل ہیں، اور حدیث و سیرت کی کتابیں بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں، کہ پیغمبر نے کبھی اپنی معصومیت یا غیب کا علم رکھنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ اور اُنھوں نے کمال سادگی اور صداقت سے کام لیتے ہوئے اپنی بشری کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ پیغمبر سے متعلق ایک معتبر حدیث میں درج ہے کہ جب وہ مشرکین کے معجزہ دکھانے کے لگاتار تقاضے سے عاجز آگئے تو اُنھوں نے فرمایا:

”یہ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں، میں خدا کا ایک بندہ ہوں، اور سوائے اس کے کچھ نہیں جانتا جو مجھے سکھایا گیا ہے“۔

محمد کی قابل تعریف صداقت اور درستی ہمیں سورت عَبَسَ کی پہلی گیارہ آیات میں ملتی ہے جہاں اللہ کی جانب سے محمد کو کی جانے والی سرزنش واضح طور پر نظر آتی ہے اور محمد اسے کمال سچائی سے بیان کرتے ہیں:

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی۔اَن جاءَ الاَعمی وَ ما یُدرِیکُ لَعَلَّهُ یَزَّکّٰی۔اَو یَذَّکَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّکری۔اَما مَن استغنی۔فَأَنتَ لَهُ تَصَدّٰی وَما عَلَیکَ اَلاّ یَزَّکّٰی وَ اَمّا مَن جاءَکَ یَسعی وَهُوَ یَخشی۔فَاَنتَ عَنهُ تَلَهّٰی کَلاّ اِنَّهَا تَذکِرَةٌ۔

بشر ہونے کے ناطے پیغمبر کی یہ آرزو تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ قریش کے امراء اور باحیثیت لوگ بھی اسلام قبول کریں۔ شائد اس آرزو کے پیچھے وہ سوال تھے جو مشرکین فخر سے پوچھتے تھے:

اَیُّ الفَرِیقَینِ خَیرٌ مَقاماً وَ احسَنُ نَدِیّاً۔

(دونوں فریقوں میں سے مکان کس کے اچھے اور مجلسیں کس کی بہتر ہیں: مَریَم ۔ 73)۔

چنانچہ پیغمبر کی یہ آرزو فطری تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ صاحب حیثیت اور معتبر افراد اُن پر ایمان لائیں۔ ایک دن وہ صحابیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اوور لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے موضوع پر بات چیت ہو رہی تھی کہ عبد اللہ بن مکتوم نامی اندھا[83] جو مسلمان ہو چکا تھا، وہ آیا اور محمد سے کہا کہ آپ کو اللہ نے جو سکھایا ہے وہ مجھے یاد کرا دیں۔ پیغمبر نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور گھر چلے گئے۔ اُس وقت سورت عَبَسَ کی یہ آیات نازل ہوئیں جس کے لہجے میں اللہ کی سرزنش واضح نظر آ رہی ہے۔

83: بلال ابن رباح کے علاوہ عبد اللہ بن مکتوم بھی مؤذن تھے۔ اندھے تھے اور نماز پڑھنے کے لیے اپنے کتے کی مدد سے مسجد آیا کرتے تھے ” جابر بن عبد اللہ انصاری سے مروی ہے۔ کہ رسول اللہ نے مدینہ کے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تو ابن مکتوم حاضر ہوئے اور عرض کی، یا رسول اللہ، میرا مکان دور ہے، نظر سے محروم ہوں، اور میرا ایک کتا ہے۔ آپ نے اُنھیں چند روز کی مہلت دے دی، پھر اُنھیں بھی اپنے کتے کو قتل کرنے کا حکم دیا“۔ (طبقات ابن سعد)۔

عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میں نابینا آدمی ہوں، میرا گھر بھی (مسجد سے) دور ہے اور میری رہنمائی کرنے والا ایسا شخص ہے جو میرے لیے موزوں و مناسب نہیں، کیا میرے لیے اپنے گھر میں نماز پڑھ لینے کی اجازت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم اذان سنتے ہو؟“، انہوں نے کہا: جی ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(پھر تو) میں تمھارے لیے رخصت نہیں پاتا“۔ (سُنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ)۔

(تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا۔ کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔ یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا۔ جو پروا نہیں کرتا اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔ حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو تم پر کچھ (الزام) نہیں۔ اور جو تمھارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ ڈر رہا ہے اس سے تم بے رخی کرتے ہو دیکھو یہ نصیحت ہے: عَبَسَ۔ 1 تا 11)۔

اس کے بعد پیغمبر جب بھی عبد اللہ ابن مکتوم کو دیکھتے تو فرماتے، خوش آمدید تمھاری وجہ سے مجھے خدا نے سرزنش کی۔

سورت غافر کی آیت نمبر 55 میں فرمایا گیا ہے:

فَاصبِر إِنَّ وَعدَ اللهِ حَقٌّ وَاستَغفِر لِذَنبِكَ وَسَبِّح بِحَمدِ رَبِّكَ بِالعَشِيِّ وَالإِبكارِ

(صبر کر اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہو)۔

محمد کی گناہ سے نسبت اور اس گناہ سے بخشش کی خواہش ثابت ہے اور بعد میں آنے والوں نے پیغمبر کی معصومیت کا جو دعویٰ کیا ہے وہ قرآنی نص کے منافی ہے۔ سورت الشّرح کی پہلی تین آیتوں میں اسی مضمون کی تکرار کی گئی ہے۔

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ۔ وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ۔ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ۔

(کیا ہم نے تمھارا سینہ کشادہ نہ کیا اور تم پر سے تمہارا بوجھ اتار لیا جس نے تمھاری پیٹھ توڑی تھی)

سورت الفتح میں "ذنب" یعنی گناہ کے لفظ نے "وزر" کی جگہ لی ہے:

إِنّا فَتَحنا لَكَ فَتحًا مُبينًا۔ لِيَغفِرَ لَكَ اللهُ ما تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَما تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعمَتَهُ عَلَيكَ وَيَهدِيَكَ صِراطًا مُستَقيمًا

(بیشک ہم نے تمھیں واضح فتح دی۔ تاکہ خدا تمھارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے اور تمھیں سیدھے رستے چلائے۔ 1۔2)۔

قرآن کی واضح اور غیر متنازعہ آیات سے جو ظاہر ہوتا ہے اس کی بنیاد پر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بعد میں آنے والوں نے حضور کی ذات سے جو معصومیت اور فوق البشر ہونے کی صفات منسوب کی ہیں، وہ اُن میں نہیں تھیں۔ اور نہ ہی اُنھوں نے خود کو خطا سے پاک کہا تھا۔ چنانچہ اس امر سے اہل فکر و تحقیق کی نظر میں اُن کی شان بڑھ جاتی ہے اور یہ امر اُن کی روحانی قدر و قوت میں کئی گنا اضافے کا باعث بنتا ہے۔

ریاضی کہ جس کے حقائق ثابت ہوتے ہیں اور سائنس کہ جس کے حقائق کا تقریباً مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ،ان کے علاوہ دوسرے امور جیسے مذہبی یا سیاسی اور سماجی عادات کے سلسلے میں انسان عقل اور شعور سے کام نہیں لیتے۔ پہلے وہ کسی امر پر عقیدہ قائم کرتے ہیں، اور پھر اُسے صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل و ثبوت ڈھونڈنے میں اپنا دماغ کھپاتے ہیں۔ علمائے اسلام بھی اسی رویے سے انحراف نہیں کرتے۔ وہ فرط عقیدت سے پہلے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول معصوم ہیں اور پھر اسے سچ ثابت کرنے کے لیے قرآن کی مختلف تاویلات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مفسرین جس قسم کے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اُس سے مجھے سہل تستری[84] کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اُن کا ایک مرید آ کر اُن سے کہتا ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ پانی پر چل سکتے ہیں۔

سہل نے اُسے کہا کہ اس کے متعلق جا کر مسجد کے مؤذن سے پوچھو کیونکہ وہ ایک سچا انسان ہے۔ مرید مؤذن کے پاس گیا اور اس مسئلے پر جواب چاہا۔ مؤذن نے کہا۔ ”مجھے یہ تو علم نہیں کہ وہ پانی پر چل سکتا

84: سہل تستری (شوشتری) خوزستان کے علاقے شوشتر کے ایک معروف صوفی تھے۔ اُن کی وفات 886ء میں ہوئی

ہے یا نہیں لیکن میں یہ ضرور جانتا ہے کہ ایک دن سہل طہارت کے لیے تالاب کے کنارے آیا اور پانی میں گر گیا۔ اگر میں وہاں موجود نہ ہوتا اور اسے باہر نہ لاتا تو وہ ڈوب جاتا"۔ اس امر سے غیر جانبدار محققین اور حقیقت کے متلاشی انکار نہیں کر سکتے کہ اس سلسلے میں بہت زیادہ دستاویزی شہادتیں موجود ہیں۔

ہنگری سے تعلق رکھنے والے اسلامی تاریخ کے محقق اِگناز گولڈ زیہر اس بات کے قائل ہیں کہ روایات، احادیث اور سیرت کی کتابیں محمد کی شخصیت کو جس قطعیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہیں اس کی مثال دوسرے مذاہب کے کسی شارع کے متعلق نہیں ملتی۔ اور ان دستاویزات میں ہمیں کہیں بھی ایسی صورت حال نظر نہیں آتی، جہاں محمد میں بشری رجحانات نہ ملیں۔ بلکہ وہ تو مسلمانوں اور اپنے ارد گرد کے لوگوں سے بالکل بھی مختلف نظر نہیں آتے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ غزوہ خندق کے موقع پر جب لوگ خندق کھود رہے تھے تو اُن سے خوشی کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا: "اَحبُّ مِن دُنیا کُمّ ثَلاث: اَلطَیب وَاَلنِساء وقُرہ عَینِی اَلصلاہ"۔ یعنی مجھے دنیا میں تین چیزوں سے محبت ہے، خوشبو عورت اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اور اسی قسم کی دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ محمد زہد یا ترک دنیا کے بالکل قائل نہیں تھے[85]۔

85: حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: "مجھے دنیا میں عورتوں اور خوشبو سے محبت دی گئی اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی"۔ حضرت حسن سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: "میں دنیا کی عیش میں سوائے عورتوں اور خوشبو کے کچھ نہیں چاہتا"۔ میموں سے روایت ہے کہ "رسول اللہ نے دنیا کی عیش میں سوائے عورتوں اور خوشبو کے کچھ حاصل نہیں کیا"۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ "نبی کریم کو دنیا کی تین چیزیں پسند تھیں، کھانا، عورتیں اور خوشبو۔ آپ نے دو چیزیں پائیں ایک نہیں پائی۔ عورتیں اور خوشبو پائی، کھانا نہیں پایا"۔ معقل بن یسار سے روایت ہے: "رسول اللہ کو گھوڑے سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں تھی، پھر کہا، اے اللہ معاف کرنا عورت سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں تھی"۔ (طبقات ابن سعد)۔

قرآن، احادیث، سیرت کی کتابوں اور دیگر روایات کی دستاویزی شہادتوں کے باوجود محمد کی وفات کے بعد اُن کے بشری خصائص سلب کر لیے گئے۔ محمد کی وفات کے دوسرے دن معتبر صحابی عمر بن خطاب نے تلوار نکال کر کہا کہ جو بھی یہ کہے گا کہ محمد مر چکے ہیں، میں اس تلوار سے اُس کی گردن مار دوں گا۔ خدا ابو بکر کے والد پر رحمت نازل فرمائے کہ اُنھوں نے کہا: " کیا یہ قرآن میں نہیں آیا: " إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ " (بے شک آپ کو بھی مرنا ہے اور اُن کو بھی مرنا ہے: الزُّمَر۔ 30)۔

جوں جوں مدینہ زمانی و مکانی انداز سے گیارہویں صدی سے آگے بڑھا، مسلمانوں کی اکثریت نے اپنی عقلی صلاحیتوں کا استعمال ترک کر دیا، اور مبالغے و غلو کو بڑھاوا دینے کا وتیرہ اپنا لیا۔ حضرت محمد کی دو صفات جس کے وہ خود بھی قائل تھے یعنی انسان اور پیغمبر ہونا جس کا ذکر نماز پنجگانہ اور قرآن میں بھی ہے، کو بھلا دیا گیا۔ اور "لولاك لما خلقتُ الأفلاك" یعنی اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو تخلیق نہ کرتا کے مصداق اُنھیں کائنات کی تخلیق کی علت غائی قرار دیا۔

تیرہویں صدی عیسوی کے شیخ نجم الدین دایہ اپنی "مرصاد العباد" نامی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "جب خدا نے "کُن: ہو جا" کہہ کر کائنات کو تخلیق کرنا چاہا، تو کائنات کی تخلیق کے لیے اولین مادے کی غیر موجودگی سے مجبور ہوا کہ پہلے نورِ محمدی کو پیدا کرے۔ اور جب اُس نور پر نظر ڈالی تو اُس نظر سے شرما کر نور سے پسینہ بہنے لگا، اور اس پسینے سے انبیاء کی ارواح اور فرشتوں کی تخلیق ہوئی۔ مصر سے تعلق رکھنے والے سیرت نگار محمد عبد اللہ السمان نے اپنی کتاب "محمد رسول بشر" میں لکھا ہے۔ "محمد دوسرے انبیا کی طرح انسان تھے۔ دوسرے انسانوں کی طرح اُن کی پیدائش ہوئی، زندگی بسر کی اور وفات پائی۔ امر نبوت کے باوجود وہ بشریت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے۔ وہ بھی دوسروں کی مانند غصے میں آتے

تھے، خوش، راضی اور مغموم ہوتے تھے۔ ایک بار اسود بن عبد المطلب بن اسد کو بد دعا دی ”خدا اُسے اندھا کر دے اور اس کے بیٹے کو یتیم کر دے“۔[86]

فلسطینی مصنف محمد عزت دروزہ نے سیرت رسول لکھی اور اپنے آراء اور بیانات کی بنیاد قرآنی عبارت پر رکھی۔ اس روشن خیال مسلمان نے دو جلدوں پر مشتمل کتاب میں حضور اور شریعت اسلامی پر اپنے ایمان اور خلوص سے اظہار خیال کیا ہے اور افسوس سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ قسطلانی[87] جیسے مسلمان کی اکثریت گمراہ ہو چکی ہے۔ وہ ایسی مبالغہ آمیزی کر رہے ہیں جو قرآنی نص کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا، حتیٰ کہ صحیح اور معتبر احادیث میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان لوگوں کے دعووں کے مطابق اللہ نے آدم کو اس لیے تخلیق کیا تاکہ اُن کی نسل سے محمد پیدا ہوں، اور اسی مقصد کی خاطر نسل انسانی پیدا کی گئی۔ حتیٰ کہ لوح و قلم، عرش و کرسی، تمام آسمان و زمین، جن و انس، بہشت و دوزخ، مختصراً تمام کائنات محمد کے نور کے پرتو سے وجود میں آئی ہے۔ اور ایسا دعویٰ کرتے وقت سورت الأنعام کی آیت 124 کو فراموش کر دیتے ہیں جہاں فرمایا گیا ہے: ”اللّٰہُ أَعلَمُ حَیثُ یَجعَلُ رِسالَتَہُ“ (اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس کو رسالت تفویض کرے)۔ اور اسلام کے اس بنیادی اصول کو بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ اس جہان کی واحد علّت خدا ہے۔

86:: معراج کے حوالے سے حضور کا مذاق اور تمسخر اڑانے والوں میں بنی اسد قبیلہ کے اسود بن مطلب، بنی زہرہ کے اسود بن عبد یغوث، بنی مخزوم کے ولید بن مغیرہ، بنی سہل سے عاص بن وائل اور بنی خزاعہ سے حارث بن طلالہ پیش پیش تھے۔ آپ نے بنی اسد کے اسود کے لیے بد دعا فرمائی۔ ”یا اللہ! اس کو اندھا کر دے اور اسے اس کے بیٹے کی موت پر لا“۔ (البدایہ والنہایہ)۔

87: احمد بن محمد قسطلانی اندلسی 1448 میں پیدا ہوئے اور 1518 میں انتقال ہوا۔ شافعی فقہ سے تعلق تھا۔ اُن کی اہم ترین کتاب ”لطایف الاشارات بفنون القرأت“ ہے۔

یہ روشن فکر مسلمان مصنف مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انبیاء قرآنی عبارت کے مطابق عام انسان تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ہدایت کے لیے برگزیدہ کیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِيَ إِلَيْهِمْ فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا إِلَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خَالِدِينَ۔

(اور ہم نے تم سے پہلے بھی تو آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا ان کی طرف ہم وحی بھیجا کرتے تھے اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لو۔ اور ہم نے اُن کے ایسے بدن بھی نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے: الانبیاء۔7،8)۔

محمد عزت دروزہ نے بہت زیادہ قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ نے وحی بھیج کر حضور کو برگزیدہ کیا، وگرنہ اس کے علاوہ اُن میں کوئی اور برگزیدگی نہیں تھی۔ جیسا کہ:

قُل سُبحانَ رَبِّي هَل كُنتُ إلاّ بَشَراً رَسُولاً۔ (کہہ دو میرا رب پاک ہے میں تو فقط ایک بھیجا ہوا انسان ہوں: الإسرَاء۔93)

وَما مَنَعَ ٱلناسُ أن يُؤمِنُوا إذا جاءَهُمُ الهُدىٰ إلاّ أن قالُوا أبَعَثَ اللهُ بَشَراً رَسُولاً

(اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آگئی تو اُن کو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر کر کے بھیجا ہے: الإسرَاء۔94)

وَما أرسَلنا قَبلكَ الاّ رِجالاً يُوحىٰ إلَيهِم ۔ (اور تم سے پہلے بھی تو ہم نے وحی کے لیے آدمیوں کو منتخب کیا تھا: الأنبيَاء۔7)

وَقالُو اما لِهٰذَا الرَّسُولِ يَأكُلُ الطَّعامَ وَيَمشي فِي الأسواقِ۔ (اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے: الفُرقان۔7)

نَحنُ نَقُصّ عَلیکَ اَحسَنَ القَصَصِ بِما اَوحینا اِلَیکَ ھذَا القُرآن وَاِن کُنتَ مِن قَبلِہٖ لَمِنَ الغافِلِینَ

(ہم تیرے پاس بہت اچھا قصہ بیان کرتے ہیں اس واسطے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن بھیجا ہے اور تو اس سے پہلے البتہ بے خبروں میں سے تھا: یُوسُف۔ 7)

وَ ما جَعَلنا لِبَشَرٍ مِن قَبلِکَ الخُلدَ اَفَاِن مِّتَ فَھُمُ الخالِدُونَ ۔ (اور ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کو بقائے دوام نہیں بخشا۔ بھلا اگر تم مر جاؤ تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے: الأنبیاء۔ 3)

وَ ما مُحَمَّدٌ اِلاّ رَسُولٌ قَد خَلَت مِن قَبلِہ الرّسُلُ ۔ (اور محمد تو ایک رسول ہے اس سے پہلے بہت رسول گزرے: آل عِمران۔ 144)

ما کُنتَ تَدرِی مَا الکِتابُ وَلَا الایمانُ ۔ (تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو: الشوریٰ۔ 52)

قُل ما کُنتُ بِدعاً مِنَ الرسُلِ وَما اَدرِی ما یُفعَلُ بِی وَلابِکُم اِن اَتَّبِعُ اِلا ما یُوحیٰ اِلَیَّ وَما اَنَا اِلا نَذِیرٌ مُبینٌ

(کہہ دو میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ تمھارے ساتھ۔ میں نہیں پیروی کرتا مگر اس کی جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ میں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں: الأحقاف۔ 9)

غزوہ بئر معونہ جس میں ستر مسلمان مارے گئے تھے، محمد نے کئی روز فجر کی نماز کا آغاز اس عبارت سے کیا: "اَللھُم اَشدُدَ و طأتَکَ عَلَی مُضِر"۔ (اللہ بنی مضر کو کچل دے)۔ پیغمبر کے بشر ہونے اور انسانی کمزوریوں کے آثار ہر جگہ پر نظر آتے ہیں:

غزوہ احد میں شکست اور حمزہ بن عبد المطلب کے قتل کے بعد جبیر بن مطعم کے غلام وحشی نے حمزہ کے کان اور ناک کاٹ دیئے اور ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے حمزہ کا سینہ چیرا اور کلیجہ نکال کر چبایا[88]۔ جب حضور نے اپنے چچا کی لاش کا مثلہ دیکھا تو اُنھیں بہت غصہ آیا اور اُنھوں نے انتقام جویانہ انداز میں کہا "خدا کی قسم، میں قریش کی پچاس لاشوں کا مثلہ کروں گا"۔ یہ واقعہ اور اس سے ملتے جلتے دیگر واقعات عربوں کے غصے اور کینہ پروری کو بہت واضح انداز میں آشکار کرتے ہیں۔ یہ انتہا تھی کہ ایک عورت نے ایک مرے ہوئے انسان کے سینے کو چیرا اور وہاں سے کلیجہ نکال کر کھانا شروع کر دیا اور چونکہ ذائقہ اچھا نہیں تھا لہٰذا تھوک دیا۔ ہند کی طرح دوسری ممتاز عورتیں بھی میدان جنگ میں جا کر جنگجوؤں کا حوصلہ بڑھاتی تھیں اور اپنی وعدوں اور نسوانی اداؤں سے لبھا کر اُنھیں لڑائی میں بہادری کے جوہر دکھانے پر آمادہ کرتی تھیں[89]۔

سیرت ابن ہشام میں درج ہے کہ قبیلہ عرینہ کے چند لوگ بیمار ہوئے اور حضور کے پاس مدد کے خواستگار ہوئے۔ اُنھیں مدینہ سے باہر شتر بانوں کے پاس بھیج دیا گیا تا کہ وہ وہاں اونٹنیوں کا دودھ پی کر

88: ہند نے جوں ہی حمزہ کے مرنے کا منظر دیکھا تو خوشی سے بے اختیار اپنا بازو بند، ہنسلی اور کان کی بالیاں اُتار کر وحشی کو دے ڈالیں اور ایک دم سے ایک چٹان پر چڑھ گئی اور رجز گانے شروع کر دیے: "جنگ بدر کا بدلہ ہم نے چُکا دیا اور جنگ کے بعد جنگ بھڑکتی ہے۔ میں شیبہ، ولید، عتبہ اور بکر کے قتل پر صبر نہ کر سکی۔ میں نے اپنے دل کی کدورت نکال لی ہے اور اپنے نذر پوری کر لی ہے۔ اے وحشی! تو نے میرے سینے کی سوزش کو شفا بخشی۔ وحشی کا شکر پوری زندگی مجھ پر واجب ہے، یہاں تک کہ قبر میں میری ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں۔ (البدایہ و النہایہ)۔

89: ہم رات کو آنے والوں (ستاروں) کی بیٹیاں ہیں۔ ہم گدیلوں پر اس طرح چلتی ہیں جیسے کہ جانور قطا صاف جنگل میں چلتا ہے۔ اگر آگے بڑھو گے تو ہم گلے لگائیں گی اور گدے بچھائیں گی۔ اگر منہ موڑو گے تو بغیر کسی خیال کے قطع تعلق کر لیں گی۔ اے بنو عبد الدار، اے پشت بچانے والو، شمشیر بر اں سے مارو"۔ غزوہ احد میں ہند بنت عتبہ کا رجزیہ گیت۔ (البدایہ والنہایہ)

شفایاب ہو جائیں[90]۔ اونٹنیوں کا دودھ پینے کے بعد جب وہ اپنی بیماری سے شفایاب ہوئے تو اُنھوں نے شتر بانوں کو قتل کرنے کے بعد اُن کی آنکھوں میں کانٹے چبھو دیئے اور اونٹ لے کر فرار ہو گئے۔ جب یہ خبر پیغمبر تک پہنچی تو اُنھیں بہت غصہ آیا اور اُنھوں نے فوراً کرز بن جابر کو اُن کا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا۔ جب وہ سب پکڑے گئے اور اُنھیں حضور کے سامنے پیش کیا گیا تو اُنھوں نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں اور اِنھیں اندھا کر دیا جائے۔ صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق پیغمبر نے فرمایا: "اِنما بَشَرِ اَغضَب وَ آسفِ کَما یَغضِبُ البَشّر"۔ (میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ایک انسان ہوں جسے غصہ بھی آتا ہے اور دُکھ بھی ہوتا ہوں)۔

بہت زیادہ واقعات اور روایات اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ ابو رہم غفاری ایک صحابی تھے۔ ایک غزوے پر محمد کے ہمراہ ایک ہی سواری پر اکٹھے بیٹھے جا رہے تھے، اتفاق سے ان کے جسم اس قدر قریب آگئے کہ ابو رہم کے جوتے کی نوک حضور کی پنڈلی میں چبھی جس سے آپ کو درد ہوا۔ آپ کو غصہ آ گیا اور آپ نے اپنا تازیانہ ابو رہم کے پاؤں پر دے مارا۔ ابو رہم خود روایت کرتے ہیں کہ میں بہت پریشان اور ڈرا ہوا رہا مبادا میری بدتمیزی کی وجہ سے کوئی آیت نازل نہ ہو جائے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں آپ نے شام پر حملہ کرنے کی خاطر ایک لشکر ترتیب دیا اور اسامہ بن زید کو اس کا امیر مقرر کیا۔ جس پر معتبر صحابہ کرام کی ناراضگی ایک فطری بات تھی کہ ایک 20 سالہ نوجوان کو ایسے لشکر کا امیر کیوں مقرر کیا گیا ہے جس میں ابو بکر سمیت کئی معزز اور معتبر صحابی شریک تھے؟۔ یہ خبر رسول اللہ کے کانوں تک پہنچی تو آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ بستر علالت سے اٹھے اور مسجد پہنچ

90: اس موضوع پر صحیح بخاری میں ایک سے زیادہ احادیث ہیں، کہ حضور نے اُن لوگوں کو اونٹنیوں کا دودھ اور پیشاب ملا کر پینے کی تجویز دی، جس سے یہ کچھ عرصہ بعد تندرست ہو گئے، اور پھر شتر بان کو قتل کر کے اونٹ لے کر فرار ہو گئے۔ حضور کے حکم پر اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے، اُنھیں اندھا کرنے کے بعد صحرا میں پھینک دیا گیا جہاں وہ پیاس کی وجہ سے مر گئے۔

گئے۔ اور نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر بولے: "میں یہ کیا باتیں سن رہا ہوں کہ لوگ اس بات پر اعتراض کر رہے ہیں کہ میں نے لشکر کی امارت اسامہ کو کیوں دی؟"۔ اسی طرح بیماری کے ایک روز جب آپ بے سدھ پڑے ہوئے تھے، تو ام المؤمنین میمونہ ایک دوا بنا کر لائیں، جس کا نسخہ اُنھوں نے حبشہ میں قیام کے دوران سیکھا تھا، اور اسے حضور کے منہ میں ڈالا۔ حضور اُٹھ بیٹھے اور غصے سے کہا "یہ حرکت کس کی ہے؟"۔ بتایا گیا کہ یہ دوا میمونہ نے تیار کی تھی اور آپ کے چچا عباس نے آپ کے منہ میں انڈیلی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ سوائے عباس کے جو بھی یہاں موجود ہے اس کے منہ میں یہ دوا ڈالی جائے۔ حتیٰ کہ میمونہ کو بھی وہ دوا پینا پڑی جب کہ وہ روزے سے تھیں[91]۔

حضور کے تیئس سالہ دور نبوت اور خصوصی طور پر مدینہ قیام کے دوران بہت زیادہ ایسے شواہد ملتے ہیں جو ان کے نفسیاتی رد عمل اور بشری خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جیسے افک کا واقعہ، ماریہ قبطیہ اور اُسے خود پر حرام قرار دینا، یا جوں ہی زینب اپنے ایام عدّت سے فارغ ہوئیں تو انہیں جلدی سے بیاہ کر گھر لانا۔

91: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوکھ کا درد ہو جاتا تھا۔ ایک دن بہت سخت درد ہوا، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری ہو گئی اور ہمیں یہ گمان ہونے لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر انتقال فرمانے والے ہیں۔ ہم نے آپ کی زبان ایک طرف کر کے دوسری طرف دوا ڈالی۔ جب آپ کو افاقہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچان لیا کہ ہم نے دوائی ڈالی تھی، پس فرمایا: "تمھارا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے نمونیا میں مبتلا کرے گا؟ اللہ تعالیٰ بیماری کو میرے خلاف راہ نہیں دے گا۔ اللہ کی قسم! گھر میں ہر فرد کی زبان ایک طرف کر کے دوسری طرف دوائی ڈالو، ماسوائے میرے چچا عباس کے"۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: گھر میں موجود ہر فرد کے منہ میں دوا ڈالی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی نے کہا: میں تو روزے دار ہوں۔ اُنھوں نے اسے کہا: "تیرا کیا خیال ہے کہ ہم تجھے چھوڑ دیں گے"، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "گھر میں کوئی نہ بچے مگر اسے دوا ڈالی جائے" پھر ہم نے اسے دوائی ڈالی، حالانکہ وہ روزے دار تھی۔ (البانی، سلسلہ احادیث صحیحہ۔ باب: الطب والعیادۃ)۔

اتنے شواہد کی موجودگی اور باوجود اس کے کہ قران میں پیغمبر کے معجزہ برپا کرنے کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے، حضور کی رحلت کے بعد مسلمانوں نے اُن کے حوالے سے معجزہ سازی کے کارخانے چالو کر دیے۔ اور اُن کی ذات کے ساتھ مافوق الفطرت کہانیاں منسوب ہونے لگیں۔ اور زمانی و مکانی طور سے فاصلہ جیسے جیسے آگے بڑھا اُسی تناسب سے معجزات کا حجم بڑھتا گیا۔ چنانچہ اسلامی علماء اور محققین کی اکثریت نے بھی اِنھیں نامناسب اور ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ ان معجزاتی دعووں کی تفصیل میں جانے کی بجائے ایک دو مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں قاضی عیاض اندلسی نامی شخص ہو گزرے ہیں، جو شاعر، محدث اور قاضی ہونے کے علاوہ عربوں کی نسب شناسی کے عالم تھے۔ اُنھوں نے "الشفاء بہ تعریف حقوق المصطفٰی" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔

انسان توقع کرتا ہے کہ اس کتاب میں پیغمبر کی عقلمندی و فضائل اور قوت تدبیر و سیاست کی تفصیل بیان ہو گی۔ لیکن بد قسمتی سے کتاب میں ایسی باتیں درج ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی انسان اس کتاب کو پڑھے جس میں پیغمبر کے بارے میں ایسی بے ہودہ باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً فضائل پیغمبر بیان کرتے ہوئے انس بن مالک[92] کے حوالے سے حضور کی غیر معمولی قوت باہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ آنحضرت ہر رات اپنی گیارہ بیویوں کے ساتھ جماع کرتے تھے اور اُن میں تیس مردوں جتنی قوت باہ تھی[93]۔ اور پھر انس بن مالک کے حوالے سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا:

92: انس بن مالک انصاری تھے۔ جب حضور نے مدینہ ہجرت کی تو انس کے والدہ نے اُنھیں حضور کی غلامی میں دے دیا۔ تمام عمر حضور کی خدمت کی۔ تمام غزوات میں شرکت کی۔ ابو بکر نے اُنھیں بحرین میں صدقات کا افسر بنا کر بھیجا۔ عمر فاروق کے زمانے میں بصرہ گئے اور تمام عمر وہیں مقیم رہے۔ حضور کی طویل صحبت کی وجہ سے بہت زیادہ احادیث کے راوی ہیں۔

93: حضرت قتادہ فرماتے ہیں۔ کہ مجھ سے انس نے کہا رسول کریم ایک ہی پھیرے میں ازواج سے فارغ ہو آئے۔ اور اُن کی تعداد گیارہ تھی۔ میں نے انس سے پوچھا کہ رسول اللہ میں اتنی طاقت تھی۔ حضرت انس نے جواب دیا۔ ہم کہا کرتے تھے نبی کریم کو تیس آدمیوں کی قوت دی گئی تھی۔ (صحیح بخاری، کتاب الغسل)۔

" مجھے چار چیزوں کے حوالے سے دوسرے مردوں پر فضیلت حاصل ہے سخاوت، شجاعت، کثرت جماع اور قتل "۔[94]

ہر عقل مند انسان اس روایت پر شک کرنے میں حق بجانب ہو گا۔ محمد نے کبھی خود ستائشی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی قرآن میں اُن کی سخاوت و شجاعت کا ذکر ہے۔ اور اُنھوں نے اپنی ذات کے متعلق اسی جملے پر ہی اکتفا کیا: "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ "۔ (بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو: القلم۔4)۔ اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ حضور نے اپنی شجاعت اور سخاوت کے حوالے سے شیخی بگھاری تھی۔ تو کثرت جماع اور کسی کو قتل کرنا تو پھر بھی کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ ایسی باتیں ہر گز حضور کے منہ سے ادا نہیں ہو سکتیں۔

قاضی عیاض نے ان چیزوں کو ہوتے نہیں دیکھا۔ بلکہ اُس نے اپنے دماغ میں چھپی ہوئی نفسانی خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ محمد کی غیر بشری صفات کا قائل ہونے کا اُس کا بخار اس درجہ تک جا پہنچتا ہے کہ پیغمبر کے بول و براز کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بعض علماء پیغمبر کے بول و براز کو پاک و صاف سمجھتے تھے۔ اور اپنی ہذیان گوئی میں یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ کہتا ہے کہ ایک روز محمد کی خدمتگار ام ایمن[95] نے پیاس کی وجہ حضور کا پیشاب پیا، تو حضور نے فرمایا کہ اب زندگی بھر تمہارے پیٹ میں درد نہیں ہو گا۔ اور ایک

94: یہاں "بطش" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی میں انسانی قتل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مستند روایت کے مطابق حضور نے جنگ میں سوائے ایک آدمی کے کسی کو قتل نہیں کیا۔

95: اصلی نام برکہ بنت ثعلبہ، عبد المطلب کی لونڈی تھیں۔ حضور کی ماں کی وفات کے بعد اِنھوں نے حضور کی خبر گیری اور خاطر داری کی۔ جب آپ بڑے ہوئے تو آپ نے برکہ کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ سے کر دی جس سے اُسامہ بن زید پیدا ہوئے۔ پہلے حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت کی۔ غزوۂ اُحد میں شرکت کی اس موقع پر وہ لوگوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی تیمارداری کرتی تھیں، غزوۂ خیبر میں بھی شریک ہوئی۔ ام ایمن حضور کے وصال کے بعد بھی زندہ رہیں۔ ابو بکر اور عمر اپنی خلافت کے دوران آپ سے ملنے جایا کرتے تھے اور آپ کی خبر گیری کرتے تھے۔

بار بھی عیاض کے ذہن میں یہ سوچ نہ آئی کہ کیا ایسا ہونا کسی صورت میں ممکن ہے؟۔ سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات جو لکھی گئی ہے کہ مکّہ قیام کے دوران جب حضور رفع حاجت کے لیے باہر جاتے تھے تو پتھر اور درخت حرکت میں آجاتے اور اُنھیں اپنے حصار میں لے لیتے تاکہ لوگ اُنھیں اس حالت میں دیکھ نہ سکیں۔

حضور کی ستائش کے پردے میں کی گئی اس یاوہ گوئی کے نتیجے میں انسان اپنے آپ سے سوال کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ شخص جو محمد کی بشری صفات و خصوصیات کو رد کرنے پر اس قدر مُصر ہے کہ اُن کی رفع حاجت کی تفصیلات تک بیان کر رہا ہے۔ کیا یہ بات زیادہ منطقی اور عقل کے قریب تر نہیں ہے کہ اس کی بجائے یہ دعویٰ کرتا کہ پیغمبر سرے سے کھانا ہی نہیں کھاتے تھے، اور نہ ہی اُسے خارج کرنے کی ضرورت تھی۔ تاکہ اس انسانی حاجت کو رفع کرنے کی خاطر پتھروں اور درختوں کو حرکت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ ویسے بھی پتھروں اور درختوں کی اپنی جگہ سے حرکت کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہتی۔ تمام اہل مکّہ اس سے باخبر ہوجاتے اور تمام مشرکین جو کسی معجزے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ ایمان لے آئیں، وہ مسلمان ہوجاتے۔

ہذیان گوئی کا یہ بخار صرف قاضی عیاض تک ہی محدود نہیں ہے۔ قسطلانی جیسے کئی سیرت نگاروں نے ایسے بے ہودہ واقعات نقل کیے ہیں۔ جس سے محمد کی بے نظیر شخصیت مذاق اور استہزا کا نشانہ بنتی ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اُنھوں نے فرمایا۔ کہ جس وقت خدا نے آدم کی تخلیق کی تو اُس کے صلب میں مجھے رکھا۔ اس کے بعد نوح کے صلب میں اور اس کے بعد ابراہیم کے صلب میں۔۔۔۔۔۔ اسی طرح صلب اور پاکیزہ بچہ دانیوں میں منتقل ہوتا ہوا میں اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے گویا دوسرے انسان صلب میں منتقل ہونے کی بجائے ایک دم سے جھاڑیوں کے نیچے سے برآمد ہوتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ہر کوئی جو موجود ہے یا کبھی موجود ہوگا وہ ماں کے رحم

سے ہی باہر آئے گا۔ قاضی عیاض کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ پیغمبر جہاں کہیں سے بھی گزرتے تھے تو پتھروں اور درختوں سے "السلام علیک یا رسول اللہ" کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ اگر جانور باتیں کرتے تو اور بات ہوتی، کیونکہ جانوروں کا کم از کم حلق، نرخرہ اور زبان ہوتی ہے جن کے استعمال سے آواز پیدا ہونا ممکن ہے۔ لیکن ایک جامد شے سے آواز کا آنا کیسے ممکن ہے؟۔ پتھروں اور درختوں میں روح و دماغ کے نہ ہونے کی وجہ سے سمجھنے اور ارادہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی جس سے اُنھیں کسی شخص کے نبی ہونے کا پتہ چلے اور وہ اسے سلام کرتے۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ میں یہ کہوں گا کہ مشرکین کے معجزہ دکھانے کے تقاضے کے جواب میں معجزہ کیوں نہ واقع ہوا تاکہ وہ سب ایمان لے آتے۔ جب کہ اُن کا تقاضا تو اس سے بہت کمتر تھا، مثلاً وہ چاہتے تھے کہ حضور پتھر سے پانی کا چشمہ جاری کر دیں یا پتھر کو سونے میں تبدیل کر دیں۔ اگر پتھر اُنھیں سلام کرتے تھے تو جنگ احد میں وہ پتھر آپ کے چہرہ مبارک پر کیوں لگے تھے؟۔ شائد مجبوراً جواب میں وہ یہ کہیں گے کہ وہ پتھر کافر تھے۔

سنیوں اور اہل تشیع کی درجنوں کتابوں میں درج ہے کہ حضور کا سایہ نہیں تھا اور آپ آگے اور پیچھے دیکھ سکتے تھے۔ حتیٰ کہ شعرانی[96] اپنی کتاب "کشف الغمہ" میں لکھتے ہیں: " پیغمبر چاروں طرف دیکھ سکتے تھے۔ اُنھیں اندھیرے میں بھی دن کی مانند ہر چیز صاف دکھائی دیتی تھی۔ جب وہ کسی لمبے آدمی کے ساتھ چل رہے ہوتے تھے تو وہ اُس آدمی سے لمبے نظر آتے تھے۔ جب وہ بیٹھتے تھے تو اُن کے شانے سب سے اونچے ہوا کرتے تھے"۔

96: عبد الوہاب الشعرانی عظیم صوفی بزرگ اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ صوفیا انہیں قطب ربانی کہتے ہیں۔ 1491ء مصر میں پیدا ہوئے اور 1565ء قاہرہ میں وفات پائی۔ بے شمار کتابوں کے مؤلف ہیں۔ ان کا شجرہ محمد بن الحنفیہ سے ملتا ہے۔

ان بے چارے سادہ لوح لوگوں کے نزدیک محمد جیسے انسان کی بلندی و برتری کا معیار ظاہری اور جسمانی معاملات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور یہ اس قدر کوتاہ بین ہیں کہ اس بات سے لاعلم ہیں کہ ایک انسان کی دوسروں پر برتری کی وجہ روحانی قوت، قوت ادراک اور اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان معجزہ سازوں کے ذہن میں یہ کبھی نہیں آیا کہ ایسا معجزہ کیوں واقع نہ ہوا جس کی حضور کو سخت ضرورت تھی۔ حضور لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔ اُن کا سایہ نہ ہونے یا اُن کے سر اور گردن کا دوسروں سے بلند ہونے کی بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوتا، کہ آپ اپنے ہاتھ سے خود قرآن کی کتابت کر پاتے اور آپ کو قرآن کی کتابت کے لیے کسی یہودی کو معاوضہ ادا نہ کرنا پڑتا؟۔

سب سے زیادہ حیران کن اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ معجزہ تراش لوگ مسلمان ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، عربی جانتے ہیں اور قرآن میں درج مطالب کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن کی واضح عبارت کے برعکس فضول افسانوں اور اوہام کو مسلمہ حقیقت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

قرآنی آیات اس سلسلے میں واضح ہیں اور اِنھیں کسی قسم کی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ پیغمبر انسان تھے اور جذبات وجبلتوں کے حوالے سے وہ دوسرے انسانوں جیسے تھے۔

مکّی سورت طٰہ کی آیت 131 میں یوں درج ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى

(اور تو اپنی نظر ان چیزوں کی طرف نہ دوڑا جو ہم نے مختلف جوڑوں کو دنیاوی زندگی کی رونق کے سامان دے رکھے ہیں تاکہ ہم اُنھیں اس میں آزمائیں اور تیرے رب کا رزق بہتر اور دیرپا ہے)۔

مکّی سورت الحِجر کی آیت 88 میں اسی مضمون کی تکرار ہوتی ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(اپنی آنکھ اٹھا کر اس چیز کو نہ دیکھو جس سے ہم نے ان جوڑوں کو متمتع کیا ہے اور ان کا کچھ غم نہ کھاؤ اور مسلمانوں سے انکساری سے پیش آؤ)۔

کیا اوپر بیان کی گئی دونوں آیات سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا کہ محمد کسی قسم کے رشک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اور وہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ بھی رؤسائے قریش کی مانند اولادِ نرینہ اور دولت سے بہرہ مند ہو جائیں۔ مخالفین کی اکثریت صاحب ثروت اور صاحب حیثیت لوگوں کی تھی، اور فطری طور وہ ہر قسم کی تبدیلی کے خلاف تھے اور ہر ایسی آواز کو خاموش کرنا چاہتے تھے جو اُن کی آسائش بھری زندگی میں خلل ڈالے۔ چنانچہ غیر مطمئن گروہ اور غریب لوگوں کا پیغمبر کے گرد جمع ہونا بھی ویسی ہی فطری بات تھی۔ اور پیغمبر اس سلسلہ میں غمگین اور پریشان رہتے تھے اور آرزو کرتے تھے کہ کوئی صاحب حیثیت، معتبر اور طاقتور شخص اسلام قبول کرے۔

سورت سَبَإٍ کی آیت 34 اور 35 اس صورت حال کو بخوبی بیان کرتی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ

(اور ہم نے جس کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو وہاں کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ تم جو لے کر آئے ہو ہم نہیں مانتے۔ اور یہ بھی کہا کہ ہم مال اور اولاد میں تم سے بڑھ کر ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں)۔

سورت الأنعام کی آیت 52 ہر صاحب نظر کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

(اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں، اُنھیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے۔ اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار اُن پر نہیں۔ اس پر بھی اگر تم اُنھیں دور پھینکو گے، تو ظالموں میں شمار ہو جاؤ گے)۔

یہ عتاب آمیز لہجہ خاصا بامعنی ہے جس میں حضور کی فطری اور بشری حالت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مشرکین کہتے تھے کہ ان بے سروپا لوگوں کا تمھارے گرد اکٹھے ہونا ہمیں تمھارے نزدیک لانے میں رکاوٹ ہے۔ شائد ان صاحب حیثیت لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے محمد کے ذہن میں وسوسے ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے چنانچہ ان میں اپنے گرد غریب لوگوں سے تحقیر سے پیش آنے والا رویہ پیدا ہو گیا تھا۔

اس مفروضے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ تفسیر جلالین کے مطابق سورت الکہف کی آیت 28 اور 29 کے نزول کی وجہ عیینہ بن حصن اور اس کے ساتھی تھے[97]۔ جنہوں نے پیغمبر سے مطالبہ کیا تھا کہ ان بے سروپا لوگوں کو اپنے ارد گرد سے ہٹاؤ تاکہ ہم تمھاری طرف آئیں۔ چنانچہ پیغمبر کو اللہ یہ حکم دیتا ہے۔

97: اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن فزاری آئے، اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صہیب، بلال، عمار، اور خباب جیسے کمزور حال مسلمانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا، جب اُنھوں نے ان لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف دیکھا تو ان کو حقیر جانا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر آپ سے تنہائی میں ملے، اور کہنے لگے: ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے ایک الگ مجلس مقرر کریں تاکہ عرب کو ہماری بزرگی اور بڑائی معلوم ہو، آپ کے پاس عرب کے وفود آتے رہتے ہیں، اگر وہ ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیں گے تو یہ ہمارے لیے باعث شرم ہے، جب ہم آپ کے پاس آئیں تو آپ ان مسکینوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیا کیجیے، جب ہم چلے جائیں تو آپ چاہیں تو پھر ان کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ٹھیک ہے" ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں اس سلسلے میں ایک تحریر لکھ دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کاغذ منگوایا اور علی رضی اللہ عنہ کو لکھنے کے لیے بلایا، ہم ایک طرف بیٹھے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد)۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا

(تو ان لوگوں کی صحبت میں رہ جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی رضا مندی چاہتے ہیں اور تو اپنی آنکھوں کو ان سے نہ ہٹا کہ دنیا کی زندگی کی زینت تلاش کرنے لگ جائے اور اس شخص کا کہنا نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور اپنی خواہش کے تابع ہو گیا ہے اور اسکا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔ اور کہہ دو سچی بات تمہارے رب کی طرف سے ہے پھر جو چاہے مان لے اور جو چاہے انکار کر دے بے شک ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے)۔

سورت الإسرَاء کی آیات 73 تا 75 جن کی شان نزول پر اختلاف ہیں، اُنھیں نقل کر رہا ہوں کیونکہ یہ بھی اُنھی مطالب کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔ کہ پیغمبر خطا اور لغزش سے مبراء نہیں بلکہ کلام الٰہی کے مطابق بشر تھے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا۔ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْــًٔا قَلِيْلًا۔ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا

(اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے اس چیز سے بہکا دیں جو ہم نے تجھ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے تا کہ تو اس کے سوا ہم پر بہتان باندھنے لگے اور پھر تجھے اپنا دوست بنا لیں۔ اور اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ تھوڑا سا ان کی طرف جھکنے کے قریب تھا۔ اس وقت ہم تجھے زندگی میں اور موت کے بعد دوہرا عذاب چکھاتے پھر تو اپنے واسطے ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتا)

بعض مفسرین ان آیات کی شان نزول سورت النّجم کا وہ واقعہ بتاتے ہیں جب آپ نے قریشی رؤسا کے سامنے دو جملے "تلک الغرانیق العلی و شفاعتھن سوف ترتجی" ادا کیے تھے، اور بعد میں آپ پشیمان ہوئے۔ اس واقعے کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

ابن جبیر اور قتادہ ان تین آیات کی شان نزول حضور اور رؤسائے قریش کے درمیان ہونے والی بات چیت بتاتے ہیں، جس میں اُن کا مطالبہ تھا کہ اوّل تو اُن کے خداؤں کو خدا تسلیم کیا جائے، بصورت دیگر اُن کی بے ادبی نہ کی جائے۔ اس کے بدلے وہ محمد سے صلح کر لیں گے اور دوستانہ تعلقات قائم کریں گے۔ اور غریب و لاچار مسلمانوں کو پیٹنا بند کر دیں گے اور تپتی دھوپ میں انہیں پتھروں پر بھی نہیں لٹائیں گے۔

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمد قائل ہو گئے تھے یا اُن میں نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ اور اُنھوں نے اس پیشکش کو قبولیت بخشی۔ لیکن جب اس پر عمل کرنے کا وقت آیا تو ارادہ تبدیل کر لیا۔ شائد اُن کا وہ روحانی تفکر اُن کے راستے میں حائل ہو گیا، جو اپنی ذات کی گہرائیوں میں غرق، ان مافوق الطبع معاملات پر سالوں کے اُن کے اُس غور و فکر کا نتیجہ تھا، جس نے بت پرستی اور شرک کو رد کیا تھا۔ کہیں یہ مصالحت اُن کی ذات اور دعوت دین کے اثر کو تار تار نہ کر دے۔ یا شائد عمر جیسے پکے ایمان اور مصالحت کے مخالف کسی مسلمان نے اُنھیں سمجھایا ہو، یا علی اور حمزہ جیسے کسی صحابی نے جو اپنی شجاعت اور لڑائی کے لیے دوسروں کو للکارنے کی صفت کے حامل ہونے کی وجہ سے ممتاز تھے، اس مصالحت کو شکست تسلیم کرنا سمجھا ہو یا مصلحت کے خلاف کہا ہو۔ ان میں جو بھی صورت ہو، یہ تینوں آیات محمد کے فطری میلانات اور بشری طبیعت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ممکن ہے وہ مصالحانہ دعوت کو قبول کر بھی لیتے جس کے بارے میں قرآن کی دوسری آیات گواہی دیتی ہیں۔

سورت یُونس سے آیات 94-95 اور سورت المائدۃ سے آیت 67۔

فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ

(سو اگر تمھیں اس بارے میں شک ہے جو ہم نے تم پر نازل کی تو اُن سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں بے شک تیرے پاس تیرے رب سے حق بات آئی ہے سو شک کرنے والوں میں ہر گز نہ ہو۔94)

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (اور نہ اُن لوگوں میں ہونا جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں نہیں تو نقصان اٹھاؤ گے۔95)

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

(اے رسول جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے سب لوگوں کو پہنچا دے اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔67)

اگر کوئی مسلمان ہے اور اللہ پر اُس کا ایمان ہے اور قرآن کو اللہ کا کلام سمجھتا ہے تو وہ ان آیات کی تفسیر کیا کرے گا۔ یہ تاکید اور درشت لہجے میں تنبیہ کس لیے؟۔

اس کے علاوہ اس کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے کہ بشری ضعف اور کمزوری اُن پر اس قدر چھا گئی تھی کہ وہ لوگوں سے اس قدر ڈرنے لگے تھے کہ خدا کو کہنا پڑا: مت ڈرو! اللہ لوگوں کے شر سے تمھیں محفوظ رکھے گا۔

ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عدی بن قیس، اسود بن عبد المطلب و اسود بن عبد یغوث نے جب معراج کا قصے اور محمد کا مذاق اڑایا تو وہ بہت غمگین اور متاسف ہوئے شائد اُنھیں اپنی دعوت کے حوالے سے اس قدر ندامت ہوئی کہ اُنھوں نے اپنے مشن کو ترک کرکے لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ وگرنہ خدا نے اُن سے ایسا کیوں فرمایا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَهْزِءِیْنَ۔ (سو تو کھول کر سنا دے جو تجھے حکم دیا گیا ہے اور مشرکوں کی پروانہ کر۔ بے شک ہم تیری طرف سے ٹھٹھا کرنے والوں کے لیے کافی ہیں: الحِجر۔94۔95)

جو بات ہمارے مفروضے کی تائید کرتی ہے وہ اسی سورت کی آیات 97، 98، 99 ہیں۔ جو اوپر دی گئی دونوں آیات کے فوراً بعد نازل ہوئی ہیں اور ان کی تفسیریوں کی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ کُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ۔ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ۔

(اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل ان باتوں سے تنگ ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ سو تو اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ کیے جا اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو۔ اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہو تاکہ تمھیں یقین آ جائے)

یہ تینوں آیات محمد کی مایوسی کی انتہا کو آشکار کرتی ہیں جن کو اپنی حقانیت پر اس قدر شک ہو گیا تھا کہ اُن پر پروردگار کی ستائش اور عبادت واجب ہو گئی تاکہ اُنھیں اپنی دعوت پر یقین، اعتماد اور اطمینان حاصل ہو سکے[98]۔ سورت الأحزَاب کی پہلی آیت میں واضح انداز میں محمد کو حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خدا سے ڈرو اور کفار و منافقین کی پیروی مت کرو۔

یا اَیُّھا النَّبِیُّ اتَّقِ اللهَ وَلاتُطِعِ الکافِرینَ وَ المُنافِقِینَ

98: بعض مفسرین کے مطابق "حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ" میں "یقین" کا لفظ موت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے اُن کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد کے معصوم ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ایسی تشریحات پیش کرتے ہیں جو قرآن کے پس منظر سے بالکل مختلف ہیں۔

تفسیر جلالین میں "اَتَّقِ اللّٰہَ" کا معنی خدا سے ڈر لکھا گیا ہے۔: یعنی خدا سے ڈرتے رہو۔

ایک اور تفسیر میں بھی اس لفظ کو اُنھی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، البتہ اضافہ یہ کیا گیا ہے، کہ اگرچہ یہ رسول کو کہا گیا ہے لیکن اس سے مراد اُمّت ہے۔ ایسی تفاسیر میں اس طرح پیالے کو شوربے سے زیادہ گرم بتایا جاتا ہے[99]۔ جب کہ اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ واضح انداز میں فرماتے ہیں: "وَّاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ"۔ یعنی (تمھارے رب کی طرف سے جو تم پر وحی ہوتا ہے اُس کی پیروی کرو)۔

اوپر دی گئی دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر کمزوری محسوس کر رہے تھے اور اپنی بشری فطرت کے ناطے مخالفین کے مطالبے کو ماننا چاہ رہے تھے۔ اور خدا نے سختی سے اُنھیں منع کیا۔ اگر ہم اس کی علمی اور عقلی تفسیر کرنا چاہیں تو ہمیں فرض کرنا ہوگا کہ حضور اپنی بشری فطرت کی وجہ سے تھک چکے تھے اور ناامیدی نے اُنھیں گھیر لیا تھا لیکن اُس توانا روح نے جو اُن کے اندر موجود تھی، اُنھیں ایسا کرنے سے روکا اور اُنھیں حکم دیا کہ اپنے راستے کو ترک نہ کرو۔ اگر ہم اس توجیہ کو دکھاوا کہتے ہوئے رد کریں اور یہ توجیہ کریں کہ حضور مخالفین کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ اُنھوں نے اپنے اندر نرمی پیدا کر لی ہے اور مصالحت چاہتے ہیں اور اُن کے تقاضے پر رعایت دینا چاہتے ہیں لیکن خدا نے اُنھیں ایسا کرنے سے منع کر دیا ہے۔ حضور کی سمجھداری، فراست اور سیاست کی سمجھ کی وجہ سے ایسا مفروضہ قائم کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن اُن کی صداقت، استقامت اور اخلاقی قوت کی وجہ سے یہ مفروضہ قابل

99: کھانا پک چکنے کے بعد جب پتیلے کو نیچے اتار لیا جائے تو جب تک کھانا گرم رہے گا تب تک پتیلہ گرم رہے گا۔ کیونکہ برتن کھانے سے گرمی کشید کرتا ہے۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا تو برتن بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔۔ لہٰذا ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ برتن کھانے سے زیادہ گرم ہو۔ یہاں فارسی کی اس مثل سے مراد اپنی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مفہوم کو تبدیل کرنا ہے۔ یعنی شوربے سے زیادہ برتن کو گرم بتانا ہے۔

قبول نہیں ہے۔ مزید بر آں حضور نے جو کچھ کہا تھا مسلمان اس پر ایمان رکھتے تھے اور اسے خدائی پیغام سمجھتے تھے۔

اس باب کو فارسی میں چھپی اولین تفاسیر میں سے ایک یعنی تفسیر کیمبرج کے ایک حوالے کے ساتھ ختم کرنا چاہوں گا۔ جو قرآن کے نزول کے زمانے سے بحث کرتی ہے اور ہجرت کے چند صدیوں بعد کے مسلمانوں کے طرز فکر پر کسی حد تک روشنی ڈالتی ہے۔ تہران میں چھپے ایڈیشن کی دوسری جلد کے صفحہ نمبر 295 پر درج ہے۔

"عتبہ بن ابو لہب نے سورت النّجم کے نزول کے بعد حضور کو قرآن میں درج "ستارے کی قسم ہے جب وہ ڈوبنے لگے" کے حوالے سے پیغام بھیج کر کہا: "میں کسی ڈوبتے ہوئے ستارے کو نہیں مانتا"۔ حضور غصے میں آئے اور نفرت سے کہا: "اللھم سلط علیہ سبعاً من سباعک"۔ (اللہ کرے تمھیں کوئی درندہ اسے کھا جائے)۔ جب عتبہ نے یہ سنا تو وہ بہت ڈرا اور کہیں بھی جانا چھوڑ دیا۔ لیکن روزی کے سلسلے میں ایک کاروان کے ساتھ کہیں گیا۔ حران میں کاروان نے پڑاؤ ڈالا اور عتبہ دوستوں کے درمیان سو گیا۔ خدا نے ایک شیر بھیجا جس نے اُسے دوستوں کے درمیان سے اٹھالیا۔ اُس کے جسم کو چیر ڈالا اور تکہ بوٹی کر ڈالی لیکن اس کا گوشت نہیں کھایا کیونکہ وہ ملعون اور ناپاک تھا۔ چنانچہ لوگوں کو پتہ چل گیا کہ شیر نے اُسے کھانے کے لیے نہیں بلکہ حضور کی بددعا کو پورا کرنے کے لیے اٹھایا تھا"۔

ایسی داستان گھڑنے والے جاہل کے ذہن میں یہ کیوں نہ آیا کہ رحمت العالمین بددعا دینے کی بجائے عتبہ کے لیے دعائے خیر کر دیتے تاکہ وہ ایمان لے آتا۔ لیکن مدینہ میں ایسا معاملہ نہ تھا۔ اسلام واحد نئی شریعت کے طور پر نہیں آیا تھا۔ تمام فرائض واحکامات آخری دس سالوں میں مقرر ہوئے۔ اور یہ نئی ریاست کی بنیاد بنے جن میں سب سے پہلا قدم قبلہ کا رخ مسجد اقصیٰ سے موڑ کر کعبہ کو مقرر کرنا تھا۔

اس تدبیر نے مسلمانوں کو یہودیوں سے جدا کر دیا، جس سے مدینہ میں موجود عربوں کے ہاں احساس کمتری زائل ہوا۔ اور سبھی عربوں جو کعبہ کو محترم گردانتے تھے، کے ہاں نسلی حمیت اجاگر ہوئی۔۔ کعبہ اگرچہ ایک بت خانہ اور بتوں کی ستائش کا مرکز تھا، لیکن عرب اسے ابراہیم و اسماعیل کا گھر گردانتے ہیں جن کو وہ خود کو اولاد سمجھتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے روزے کے سلسلے میں یہودیوں کی پیروی ترک کر دی۔ جو دس محرم کو رکھا جاتا تھا۔ پہلے اُنھوں نے ان کی تعداد میں اضافہ کیا اور بعد میں رمضان کا مہینہ اس کے لیے مختص کر دیا۔

نکاح و طلاق کے احکامات، محرمات کا تعین، وراثت، حیض، بیویوں کی تعداد، زنا اور چوری کی سزا، قصاص اور دیگر جرائم اور سماجی قوانین، نجاسات و ختنہ وغیرہ کا زیادہ حصہ یہودیوں کی شریعت یا زمانہ جاہلیت کے عربوں کی رسوم سے اخذ کر کے تھوڑی تبدیلی یا اصلاح کے ساتھ مدینہ میں رائج کر دیا گیا۔ سماجی و ذاتی معاملات کے احکامات گو یہودیوں کی شریعت یا زمانہ جاہلیت کے عربوں کی رسوم کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے معاشرے کی اجتماعی معاملہ سازی کی افادیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ہجرت

تاریخ مسلسل سفر میں ہے۔ جس کے دوران کچھ دن ایسے بھی آتے ہیں جو کسی ایسے حادثے یا واقعے کو جنم دیتے ہیں۔ جو تاریخ کے دھارے کو تبدیل کرنے کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتے ہیں۔

بارہ ربیع الاوّل (24 ستمبر 662ء)[100] جب محمد یثرب آئے، وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔

سادہ لوح مسلمان مذہبی عقیدت کی وجہ سے ہجرت کے دن کو تقویم کا آغاز قرار دیتے ہیں۔ اس سے پہلے قدیم عرب وقت کا حساب لگانے کیلئے عام الفیل یعنی ابرہہ کے کعبہ پر حملے کے دن کو وقت کی پیمائش کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے ہاں کسی تقویم کا کوئی تصور نہ تھا۔

اوس اور خزرج نامی دونوں بڑے قبیلے یہ شیخی بگھارنے کے لیے کہ اُنھوں نے محمد کو حمایت اور پناہ مہیا کرتے ہوئے اپنی شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے، ہجرت کے روز کو تاریخ کی ابتدا قرار دیا ہے۔ لیکن سال کے آغاز کو بارہ ربیع الاوّل کی بجائے یکم محرم قرار دیا گیا۔

اُن وقتوں کے عربوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ 12 ربیع الاوّل کا دن اُن کے زندگی میں ایسی تبدیلی لائے گا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ کہ مٹھی بھر صحرائی لوگ جن کی انسانی تمدن کی تاریخ میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، جن کے اہم قبائل نے ایران و روم کی سلطنتوں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے ہوئے

100: بیست و سہ سال کی جو پی ڈی ایف کاپی میرے پاس موجود ہے، اُس میں ہجرت کا سال 622ء کی بجائے 662ء ہے جو یقیناً کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔

تھے اور کسریٰ کے دربار اور رومی شاہنشاہ کے ساتھ قربت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے، وہ اُنھی دونوں بڑی حکومتوں کے وسیع علاقے پر اپنی حکومت قائم کریں گے۔

محمد اور اُن کے چند ساتھیوں کی مکہ سے یثرب ہجرت ایک معمولی اور غیر اہم واقعہ تھا۔ جس میں چند لوگ شامل تھے جو قریش سے مایوس ہو کر یہاں آئے تھے۔ بظاہر معمولی نظر آنے والی یہ ہجرت بعد میں ایک بہت بڑی تبدیلی کی باعث بنتی ہے، ایک تبدیلی جسے آنے میں دس سال کا عرصہ لگا۔

ایک چھوٹی سی جماعت جس کے کچھ لوگ چھپ کر، کچھ سب کے سامنے کھلم کھلا، کوئی فرار ہو کر، کوئی سیاحت کے بہانے مکہ چھوڑ کر محمد سے آملے، دس سال بعد مکّہ فتح کرتی ہے اور تمام مخالفین کو اپنے سامنے جھکاتی ہے، اُن کے بتوں کو توڑتی ہے، اور کعبہ کی تولیت جو قریشی سرداروں کی عزت و تشخص کی بنیاد تھی، کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اور انتہا یہ ہوتی ہے کہ موت کے ڈر سے مغرور و سرکش ابو سفیان، ابولہب اور ابوجہل کے جانشینوں کے پاس ہتھیار پھینکنے، تمام دشمنیاں ختم کرنے اور ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

کبھی چھوٹے چھوٹے واقعات کا ایک سلسلہ کسی بڑے واقعے کو جنم دیتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلی کے بے شمار نمونے ہمیں انسانی تاریخ میں ملتے ہیں جیسے انقلاب فرانس، انقلاب روس اور ایران پر منگولوں کا حملہ تھا۔

محمد نے جب قریش کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو اُنھیں قریشی سرداروں کی طرف سے مخالفت کا سامنا ہوا۔ شائد اُنھوں نے یہ تصور بھی نہیں کیا ہو گا کہ اُن کی دعوت جو دوسرے ابراہیمی ادیان کی مانند خرد پسندانہ اور اُنھی سے مماثل تھی، کو اس قدر نفرت و عناد کا سامنا ہو گا۔ شائد یہ اہم نکتہ اُن کی نظروں سے اوجھل رہ گیا تھا کہ جوں جوں اُن کی دعوت کو تقویت ملے گی، اُسی تناسب سے قریش کی برتری اور اُن کے رؤساء کی امارت اور طاقت خطرے میں پڑتی جائے گی۔ چنانچہ محمد اپنے مقصد میں

کامیابی کے حصول کے لیے دوسری راہیں سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ یثرب ہجرت کرنے سے پہلے وہ اسی سمت میں دو قدم اٹھا چکے تھے۔ اُن کا پہلا قدم حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت تھی۔ یہ ہجرت دو بار ہوئی۔ ظاہر ہے کہ کمزور اور طاقتور سرپرست کے بغیر مسلمانوں کو قریش آزار پہنچاتے تھے۔ پیغمبر نے اُنھیں مشورہ دیا کہ حبشہ چلے جائیں۔ مسلمانوں کی حبشہ کی جانب دوسری ہجرت کے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بار مسلمانوں کی خاصی تعداد نے ہجرت کی تھی جن میں جعفر بن ابو طالب جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ اُنھیں جو ہدایت دی گئی تھیں، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اس ہجرت کے پیچھے خاصی منصوبہ بندی اور سیاسی محرکات تھے۔ مدد کے متلاشی محمد کے زیرک دماغ میں نجاشی کے لیے خاصی کشش تھی۔ اُن کے ذہن میں صورت حال کچھ یوں موجود تھی۔

نجاشی مسیحی ہے اور اُس کا شرک اور بت پرستی کے خلاف ہونا فطری امر ہے۔ اگر اُسے پتہ چلے گا کہ مکہ کے اندر چند لوگ توحید کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور مسلسل تکالیف اور مصائب سے گزر رہے ہیں تو بعید نہیں کہ وہ مدد کے لیے اپنا لشکر مکّہ روانہ کر دے۔ چنانچہ جعفر بن ابو طالب جو قریش کے معززین میں سے تھے، کو ساتھ بھیجا گیا، تا کہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ مکّہ میں اذیت اور تکلیف جھیلنے کے حوالے سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ قریش نے عمرو بن العاص اور عبد اللہ ابن ابو ربیعہ کو تحائف کے ساتھ نجاشی کے ہاں حبشہ بھیجا تا کہ وہ مسلمانوں کی مدد نہ کرے اور اگر ممکن ہو سکے تو مسلمانوں کو اُن کے حوالے کر دے۔

محمد کا دوسرا اہم قدم 620ء میں طائف شہر کا سفر تھا۔ یہ واقعہ تب پیش آتا ہے جب حضور کے دو مضبوط ترین محافظ یعنی ابو طالب اور خدیجہ اُنھیں داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ چنانچہ اب وہ پہلے سے زیادہ قریش کی مخالفت اور عناد کا شکار ہو گئے تھے۔ قبیلہ بنو ثقیف محمد کیلئے امید کی ایک کرن تھی کیونکہ ماں کی طرف سے یہ قبیلہ اُن کا رشتہ دار تھا۔

بنو ثقیف نامی قبیلہ طائف میں مقیم تھا اور اُنھیں بہت معزز خیال کیا جاتا تھا۔ مکّہ میں کعبہ کی موجودگی سے قریش کو عربوں کی نظر میں جو ممتاز حیثیت حاصل تھی، طائف کے لوگ اسے رشک کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ فطری طور پر اُن کی خواہش تھی کہ اُن کے شہر کو قبلہ کی حیثیت حاصل ہو جائے، تاکہ وہ قریش کی برتری کو ختم کر سکیں۔ یہ صرف تصور یا مفروضہ نہیں ہے۔ کیونکہ محمد یہ نہیں بھولے تھے کہ بنو ثقیف کے چند لوگ ایک بار اُن سے ملنے آئے تھے اور اُنھیں کہا تھا کہ اگر حضور اپنے نئے مذہب میں طائف کو مکّہ کی مانند ایک مقدس شہر قرار دے دیں، تو اس بات کا قوی احتمال ہے کہ طائف کے لوگ اُن پر ایمان لا کر مسلمان ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے طائف کا بنو عامر نامی قبیلہ بھی اُنھیں ایسی پیشکش کرتے ہوئے کہہ چکا تھا کہ اگر اُن کی مدد سے حضور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور اُن کا نیا دین استوار ہو جائے تو وہ قریش کا مقام اُنھیں دیں گے اور اُنھیں طائف کے اشراف قرار دیں گے۔ چنانچہ طائف کا سفر منزل کے حصول میں ایک کامیاب وسیلہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر بنو ثقیف کے لوگ حضور کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو قریش کو مطیع کرنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ اُنھی سوچوں کو دماغ میں سمائے وہ اپنے منہ بولے بیٹے اور آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو ساتھ لے کر خفیہ طور پر طائف گئے۔ لیکن معاملہ اُن کی سوچوں کے برعکس ہوا، اور بنو ثقیف نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

مذہب کے معنوی یا روحانی پہلو سے عربوں کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ بعثت سے چودہ صدیوں بعد آج بھی اُن کی نظر میں مذہب دنیاوی فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

بنو ثقیف کی روزمرہ زندگی کا جو انداز تھا اُس کے مطابق وہ آخرت کے وعدے کی خاطر دنیاوی فوائد سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ مکّہ کے لوگوں کے لیے طائف گرمیاں گزارنے کی جگہ تھی۔ اہل مکّہ کی وہاں آمد اور تجارت سے طائف والوں کو خاصی کمائی ہوتی تھی۔ قریش محمد کے خلاف کھڑے تھے لہٰذا محمد کی حمایت کرنے کے نتیجے میں قریش طائف والوں سے ناراض ہو سکتے تھے۔ چنانچہ یہ فیصلہ عقل مندانہ تھا کہ محمد کے غیر ثابت شدہ دعوے کی خاطر طائف کے تحفظ اور مالی فوائد کے ایک باقاعدہ سلسلے

کو قربان نہ کیا جائے۔ نفع اور نقصان کی اس جمع تفریق کے نتیجے میں اُنھوں نے نہ صرف مدد کرنے سے انکار کر دیا بلکہ محمد پر حملہ کر دیا اور بہت زیادہ تضحیک کی۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے محمد کی اُس آخری درخواست کو بھی قبول نہ کیا کہ اِس خفیہ سفر کا راز فاش نہ کیا جائے تاکہ اس ناکامی کی خبر قریش تک نہ پہنچے وگرنہ وہ اور زیادہ شیر ہو جائیں گے۔ چنانچہ مکّہ واپسی کے بعد قریش کی دشمنی میں اور شدت آگئی۔ جو اس حد تک آ پہنچی کہ وہ دارالندوہ میں اکٹھے ہوئے اور دعوت اسلام کے اس مسئلے جو اُن کے وجود، شان و شوکت اور امارت کے لیے خطرہ تھا، کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی ٹھانی۔ مشاورت کے نتیجے میں تین تجاویز سامنے آئیں، محمد کو قید کر دیا جائے، مکّہ بدر کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے، آخری تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

مکّہ اور یثرب کے لوگوں کے درمیان تجارت اور سماجی مرتبے کے حوالے سے رقابت تھی۔ مکّہ میں خانہ کعبہ تھا اور خانہ کعبہ میں تمام مشہور بُت موجود تھے۔ اس وجہ سے اسے ایک مقدس شہر اور مختلف عربی قبائل کے قبلہ اور طواف گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کے لیے انتظام کرنے کی وجہ سے قریش کو خاصا مقام حاصل تھا، لہٰذا قدرتی طور وہ اپنے آپ کو عربوں کا معزز ترین قبیلہ کہتے تھے۔ یثرب تجارت اور زراعت کی وجہ سے مکّہ سے زیادہ خوشحال شہر تھا اور دوسرے بیشتر قبائل کے برعکس پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت کے حامل کئی لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ جس کی وجہ یہودیوں کے تین قبائل کی وہاں موجودگی تھی جو اہل کتاب تھے۔ معاشرے کی ثقافتی سطح مکّہ سے بہت بلند تھی لیکن اس کے باوجود اسے پورے حجاز میں مکّہ کے مقابلے میں دوسرا درجہ دیا جاتا تھا۔

یثرب میں عربوں کے اوس اور خزرج نامی دو بڑے قبیلے رہتے تھے جن کے درمیان اکثر اختلافات اور جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں قبیلوں کی کسی ایک یہودی قبیلے کے ساتھ دوستی تھی۔ اوس و خزرج یمن کے قحطانی عرب تھے اور قریش مکّہ کا تعلق عدنانی شاخ سے تھا، اور یہ نسلی فرق بھی اُن کے درمیان رقابت کی ایک وجہ تھی۔ لیکن اوس و خزرج اپنی سُستی اور امور زراعت و تجارت سے ناواقفیت کی وجہ

سے مالی طور پر بدحال تھے اور یہودیوں کے ہاں کام کرنے پر مجبور تھے۔ اگرچہ اُنھوں نے یہودیوں کے کسی ایک قبیلہ سے دوستی کا پیمان کیا ہوا تھا لیکن حلیف ہونے کے باوجود اُنھیں اپنے آجروں کی معاشی برتری بہت شدت سے کھٹکتی تھی۔

مکّہ میں محمد کے ظہور اور دعوت اسلام، نئے پیغمبر پر ایمان لانے والے چند لوگوں، قریش کی چند سالوں پر محیط مخالفت اور کشمکش کی خبر پورے حجاز میں پھیل چکی تھی۔ جب یہ خبر یثرب پہنچی تو چند یثربی مکہ آئے اور پیغمبر سے ملاقات کی۔ محمد کی مشکلات کو جان کر اوس و خزرج کے سرداروں میں سے چند ایک کو اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی سوجھی[101]۔

اگر محمد اور اُن کے ساتھی یثرب آجائیں اور اُن کے ساتھ اتحاد ہو جائے تو کئی مسائل حل ہو جائیں گے:

محمد اور اُن کے ساتھی قریشی ہیں چنانچہ قریش کی مستحکم دیوار میں دراڑ پڑ جائے گی۔

محمد اور اُن کے ساتھیوں سے اتحاد کے نتیجے میں ممکن ہے کہ وہ اپنے داخلی نفاق اور مخاصمت کے شرّ سے چھٹکارا پالیں جو ہمیشہ سے اُن کے درمیان جاری ہے۔ اس کے علاوہ محمد جو یہ نیا دین لے کر آیا ہے اگر یہ جڑ پکڑ لے تو یہودی جو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ قوم کہتے ہیں، اُن کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا اور محمد اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ اتحاد سے تینوں یہودی قبائل کے مقابلے پر وہ زیادہ طاقتور ہو جائیں گے۔

101: پانی میں مچھلی کو پکڑنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن جب پانی تقریباً سوکھ جائے اور وہاں کیچڑ آلودہ پانی رہ جائے تو مچھلی کو پکڑنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو فارسی میں یوں بیان کیا گیا ہے: "بعضی از سران اوس و خزرج را بدین فکر انداخت کہ از آب گل الود ماہی بگیرند" ۔ اوس اور خزرج کے چند سرداروں کو یہ خیال آیا کہ کیچڑ آلودہ پانی سے مچھلی پکڑی جائے۔ یعنی حضور اس وقت مصیبت کا شکار ہیں۔ اُنھیں اپنے حق میں استعمال کرنا آسان ہو گا۔

620ء کے حج کے دوران یثرب کے چھ لوگ محمد سے ملتے ہیں اور اُن کی باتیں سنتے ہیں۔ 621ء کے حج میں 12 لوگ ملتے ہیں اور محمد کی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں کہ اُن میں اچھی تعلیمات کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ جیسے زنا نہ کرو۔ سود نہ کھاؤ۔ جھوٹ مت بولو۔ بُتوں کی بجائے جنھیں انسان تخلیق کرتے ہیں خدائے واحد جو کائنات کے علاوہ اہل کتاب کا خالق ہے، کی عبادت کرو۔

یہ بارہ لوگ بیعت کرتے ہیں اور یثرب واپسی کے وقت مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اور محمد سے اتحاد کرنے کی تجویز اپنے لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس تجویز اور تدبیر کو اکثریت کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے اور اُسی سال یعنی 622ء میں بہتر لوگ (تہتر مرد اور دو عورتیں) مکّہ سے باہر عقبہ کے مقام پر محمد سے ملاقات کرتے ہیں اور معاہدہ عقبہ دوم طے پاتا ہے۔

ہجرت کی سوچ محمد کے لیے کوئی اچھوتی بات نہیں تھی، مسلمانوں کی حبشہ ہجرت کے سلسلے میں سورت الزُّمَر کی آیت نمبر دس میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ

(کہہ دو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے پروردگار سے ڈرو۔ جنھوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے۔ اور خدا کی زمین کشادہ ہے)۔

یعنی اگر مکّہ میں مصائب کا سامنا ہے تو مہاجرت اختیار کریں۔

معاہدہ عقبہ محمد کی پوشیدہ آرزوؤں کی تکمیل تھی۔ تیرہ سال کی دعوت کوئی خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکی تھی۔ کبھی کبھار کسی مسلمان کے مرتد ہو جانے کی وجہ سے بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو مسلمان ہو چکے تھے لیکن جب اُنھیں محمد کی دعوت میں پیش رفت نظر نہ آئی تو وہ اپنی ناپائیدار طبیعت کے باعث مایوس ہو کر اسلام سے برگشتہ ہو گئے۔ خاص طور پر جب اُنھیں مسلمان ہونے کی وجہ سے مصائب اور تحقیر کا سامنا ہوتا تھا، اور مشرکین جو صاحب حیثیت اور امیر تھے وہ اِنھیں

اسلام چھوڑنے پر مجبور کرتے تھے۔ طائف جا کر بنو ثقیف سے حمایت حاصل کرنے کے لیے کیا گیا سفر نہ صرف ناکام رہا، بلکہ اس کا الٹا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کی مخالفت میں اور شدت آگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بنو ہاشم آپ کی مدد کرتے تھے لیکن اُن کی مدد یہاں تک ہی محدود تھی کہ کوئی آپ کو نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ بنو ہاشم اسلام کی خاطر محمد کے ساتھ مل کر قریش کے ساتھ لڑائی کا خطرہ مول لیں گے۔ لیکن اوس و خزرج کے ساتھ پیمان سے صورت بدل چکی تھی۔ اُن کے ساتھ مل کر قریش سے جنگ کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ اگر اسلام مکّہ میں جڑیں نہیں پکڑ سکا تو مدینہ میں ایسا ہونا ممکن تھا۔ اوس و خزرج کی قریش سے رقابت کی وجہ سے اس سنہرے خواب کی تعبیر ممکن تھی اور وہاں اسلام جڑ پکڑ سکتا تھا۔ خاص طور پر یثرب میں تجارت اور زراعت کثرت سے ہوتی تھی، یوں مسلمانوں کو وہاں روزگار کا حصول بھی آسان تھا۔

عقبہ کے مقام پر جو معاہدہ حضرت محمد اور اوس و خزرج کے سرداروں کے درمیان طے پایا، اُس میں عباس بن عبد المطلب موجود تھے، جو بظاہر ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن اپنے بھتیجے کے حامی تھے، اُنھوں نے اہالیان یثرب سے کہا کہ اُن کے دل میں جو ہے اور جس پر وہ قائم رہ سکتے ہیں، اُس کا کھل کا اظہار کریں۔ اُنہوں نے اُن لوگوں کو صاف لفظوں میں کہا کہ محمد کی مخالفت کی وجہ سے قریش تمہارے بھی مخالف ہو جائیں گے۔ اگر مردوں کی طرح قول دیتے ہو کہ اُس کی حفاظت ویسے ہی کرو گے جیسے جنگ کی صورت میں اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہو تو بات کرو وگرنہ فضول وعدوں سے میرے بھتیجے کو گمراہ مت کرو۔

براء بن معرور نے جذبات سے بھرپور رزمیہ انداز میں جواب دیا: ”ہم جنگجو لوگ ہیں اور کسی جنگ سے نہیں ڈرتے اور تمام مشکلات میں ساتھ رہیں گے“۔

ابوالہیثم تیہان نامی ایک دور اندیش شخص نے محتاط لیکن نفاست سے کہا: " ہمارے اور یہودیوں کے درمیان اچھے تعلقات ہیں، تمھارے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد وہ تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ اور بعد میں اپنے لوگوں سے سمجھوتہ کر لو، پھر ہم کیا کریں گے؟"۔

سیرت ابن ہشام کے مطابق حضرت محمد نے مسکراتے ہوئے فرمایا:"بل الدم الدم، الھدم، الھدم۔ انا منکم وانتم منی۔ احارب من حاربتم و اسلم من سالمتم "۔(خون، خون، ویرانی، ویرانی، میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ تم جس سے جنگ کرو گے میں اس سے جنگ کروں گے، تم جس کے خلاف سازش کرو گے میں اس کے خلاف سازش کروں گا)۔

"خون " اور "تباہی" کے الفاظ کی تکرار مجھے مشہور فرانسیسی انقلابی ژاں پول مارا کی یاد دلاتے ہیں جس نے لکھا تھا:"مجھے خون چاہیے "۔

ایک اور جملہ جو ابوالہیثم کو جواب دینے کے حوالے سے مشہور ہے وہ یوں ہے:"حرب الاحمر و الاسود من الناس"۔(سرخ اور سفید لوگوں کے ساتھ جنگ، یعنی ہر کسی کے ساتھ جنگ۔ سیاہ و سفید لوگوں کے ساتھ، عرب و عجم کے ساتھ)۔

یہ جملہ محمد کے رجحانات یا دوسرے لفظوں میں اُن کے اندر چھپی ہوئی آرزوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ جملہ محمد کی واضح فریاد ہے جو ظاہر نظر آنے والے محمد کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ محمد کی روح کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی آرزوئیں اس عبارت کے قالب میں باہر آتی ہیں۔ اوس و خزرج کا ساتھ ان کی طرف فروغ کا دریچہ کھول دیتا ہے۔ اُنھیں دعوت اسلام میں پیش رفت کی نوید ملتی ہے۔ قریشی دشمن زیر ہوتے ہیں اور محمد کو اپنی پوشیدہ شخصیت کو آشکار کرنے کا موقع ملتا ہے۔ محمد جنھوں نے تیرہ سال تک تبلیغ کی اور کامیابی نصیب نہ ہوئی وہ محمد دس سال بعد پورے جزیرہ عرب کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے سامنے آتے ہیں۔

محمد: ایک نیا روپ

تاریخ نے زیادہ تر اپنے دھارے کا رخ چھوٹے اور بظاہر معمولی نظر آنے والے واقعات کی وجہ سے تبدیل کیا ہے۔ نپولین کا ظہور و زوال اور ہٹلر کی فتوحات و شکست اس کی واضح مثالیں ہیں۔

حضرت محمد کی یثرب ہجرت بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا جس نے عربوں کی قسمت میں اتنی بڑی تبدیلی برپا کی، اور بعد میں اپنے وقتوں کی دنیا کو ڈرامائی طور پر تبدیل کر دیا۔

بظاہر یہ ایک معمولی سا مقامی واقعہ تھا۔ لیکن واقعات اور حادثات کے ایک سلسلے کا باعث بنا، اور تاریخ کے محققین کے سامنے ایک وسیع سیاق و سباق آشکار کرتا ہے۔ تاکہ وہ واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ان واقعات کی وجوہات کو بیان کر سکیں، اور اُس دور کے معاشرے میں تبدیلی کی مخفی وجوہات کا خلاصہ پیش کر سکیں۔

اس معاملے میں جو چیز سب سے اہم، قابل توجہ اور باعث حیرت ہے، وہ انسانی تاریخ کے اس تاریخ ساز انسان کی شخصیت میں تبدیلی کا واقع ہونا ہے۔ شائد اس تبدیلی کو شخصیت میں تبدیلی کہنا مناسب نہیں ہو گا، بلکہ اگر ہم یوں کہیں کہ ایک نئی شخصیت کا ظہور ہوتا ہے جو محمد کے اندر چھپی ہوئی تھی تو یہ حقیقت کے زیادہ قریب ہو گا۔

ہجرت نبوی ایک نئی تاریخ کا آغاز اور بڑی تبدیلیوں کا باعث ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا واقعہ وہ ڈرامائی تبدیلی ہے جو محمد کی شخصیت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ اس بات کی متقاضی ہے کہ ماہرین نفسیات اور روحانی اسرار کو سمجھنے کے خواہشمند اور دانشور اس کا باریک بینی سے جائزہ لیں۔

اپنے وقتوں کی برائیوں سے دور ایک زاہد انسان، جس کا خیال تھا کہ قیامت کا دن نزدیک آ چکا ہے، ایک آدمی جو آخرت کے اندیشوں میں گھرا رہتا تھا، اپنی قوم کے لوگوں کو خالق کائنات کی عبادت کرنے کی

دعوت دیتا تھا، ظلم وجبر پر تنقید کرتا تھا، عیش وعشرت میں مشغول ہونے اور ضرورت مندوں کے حال سے غفلت برتنے پر ملامت کرتا تھا۔ یہ انسان جو عیسیٰ کی مانند سراپا شفقت تھا، ایک دم سے ایک ایسے جنگجو میں تبدیل ہو جاتا ہے جو سخت گیر اور متشدد ہے اور تلوار کے زور پر اپنا دین دوسروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ایک ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے جس کی خاطر کسی بھی وسیلے کو استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ ایک مسیحا داؤد کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مطمئن آدمی جو اپنی زندگی کے بیس سال ایک ایسی عورت کے ساتھ گزارتا ہے جو عمر میں اُس سے پندرہ سال بڑی تھی، مبالغانہ حد تک عورتوں کا رسیا بن جاتا ہے

ویلز[102] کا کہنا ہے کہ انسانوں کی شخصیت مسلسل تبدیلی وارتقاء کے مراحل طے کر رہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی یا تغیر اس آہستگی سے انجام پاتا ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کر پاتے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پچاس سالہ آدمی وہی ہے جو وہ بیس سال کی عمر میں تھا۔ لیکن درحقیقت وہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ اور جو بات اس بیس سالہ جوان میں تھی وہ اب نہیں رہی اور یہ تبدیلی بتدریج ہوئی ہے۔

یہ مفروضہ اس حوالے سے سچ ہے کہ انسان کی جسمانی توانائیاں وقت کے ساتھ کمزوری اور ضعف کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن دوسری جانب اُس کی فکری توانائیاں مطالعے، تفکر اور زندگی کے تجربات کی وجہ سے کمال حاصل کرتی ہیں۔ پچاس یا ساٹھ سالہ اور بیس سالہ مرد میں یہ فرق ہے کہ ایک کے نزدیک جسمانی

102: ایچ جی ویلز (Herbert George Wells) برطانوی مصنف تھے۔ اُنھوں نے درجنوں ناول، افسانے، سوانح حیات، طنزیہ، تاریخ اور سماجی موضوع پر لکھا۔ لیکن اُن کی وجہ شہرت سائنسی فکشن ہے، اس لیے اُنھیں سائنسی فکشن کا باپ بھی کہا جاتا ہے۔ سماجی نقاد ہونے کے علاوہ ایک پیش بین انسان تھے۔ متعدد تصوراتی کام لکھے اور خلائی سفر، سیٹلائٹ ٹیلی ویژن اور ورلڈ وائڈ ویب سے ملتی جلتی کسی چیز کی پیش بینی کی تھی۔ اس کے علاوہ سائنس فکشن میں وقتی سفر (Time Travel) فضا سے آنے والی اجنبی مخلوق کا حملہ، پوشیدہ اور حیاتیاتی انجینئرنگ کے تصور دیے۔۔ برائن الڈیس (Brian Aldiss) نے ویلز کو "سائنس فکشن کا شیکسپیئر" کہا ہے۔ 1866ء سے 1946ء کے دوران زندگی بسر کی۔

اور شہوانی اور دوسرے کے نزدیک روحانی ضروریات کی شدت ہوتی ہیں۔ تجربے اور مطالعے کے نتیجے میں فکر بتدریج پختہ ہوتی ہے اور علم و عقل کی شکل اختیار کرتی ہے اور بتدریج روحانی انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ مفروضہ جو اپنے طور پر صحیح ہے لیکن یہ محمد کے سلسلے میں مکمل طور پر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ترپن سال کی عمر میں مدینہ داخل ہوتے ہیں، یعنی یہ وہ عمر ہے جس میں انسان کی جسمانی و روحانی توانائیوں کی حالت درمیانے درجے کی ہوتی ہے، وہ کمزور ہو چکی ہوتی ہیں۔ لیکن مدینہ آمد کے آغاز میں محمد کے گریبان سے ایک اور محمد سر نکالتا ہے، جس آدمی نے مکّہ کے لوگوں کو دعوت دی تھی، دس سالوں کے دوران وہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو پیغمبری کے لباس میں "وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" (اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو: الشُّعَرَاء۔ 214) کے پیغام سے اپنے رشتہ داروں اور غیروں کو جاہلیت کی گندی رسوم اور عادات سے منع کرتا تھا، اُس کے اندر سے ایک نئے انسان کا ظہور ہوتا ہے جو سب سے پہلے اُنھی رشتہ داروں کو زیر کرتا ہے اور تمام وہ لوگ جنھوں نے تیرہ سال اُس کی تضحیک کی اور تنگ کیا، اُنھیں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

وہ آدمی "لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا" (تم اُمّ القُریٰ (مکہ) اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو آگاہ کر دو: الأنعَام۔ 92) کا چولا ایک طرف اُتار پھینکتا ہے اور جنگی لباس پہن لیتا ہے اور وہ مقام حاصل کرتا ہے کہ یمن سے لے کر شام تک کے تمام جزیرۃ العرب کو اپنے جھنڈے تلے لے آتا ہے۔

مکہ کی خوش آہنگ سورتیں جو اشعیا اور ارمیا کی باتوں کو دل میں دوبارہ زندہ کر دیتی تھیں، جہاں جذبات سے دہکتی روح والا ایک انسان یوں بولتا تھا گویا وہ اپنے خوابوں کی سوچوں سے مسحور ہو چکا تھا، ایسی سورتیں مدینہ میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ وہ شاعرانہ آہنگ اور مترنم لہجہ خاموش ہو جاتا ہے، اور فیصلہ کن احکام اور سختی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

مدینہ میں احکامات صادر ہوتے ہیں۔ ایک سردار کا حکم جس سے انحراف یا نافرمانی کی معافی نہیں ہے، اور اُن کے انجام دینے میں غفلت اور سُستی کی سخت سزا ملے گی۔

گولڈ زیہر کے الفاظ میں تدریجی مراحل طے کیے بغیر آنے والی تبدیلی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ جسے ایڈولف فون ہارنک[103] ایک خاص قسم کی بیماری کا نام دیتا ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل افراد کو لاحق ہوتی ہے اور اُن کی حیران کن قوت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ یہ روحانی قوت اُن کی ہمت و عزم کا سرچشمہ اور کبھی تھکاوٹ کا شکار نہ ہونے والی کوششوں اور عمل کا منبع ہوتی ہے۔ اس قوت کی وجہ سے اُن کی زندگی میں سُستی اور ناامیدی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور وہ بڑی بڑی رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور وہ ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں جو عام لوگوں کے بس سے باہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یثرب ہجرت کے بعد تاریخ کے آئینے میں محمد کی نئی شبیہ ابھرتی ہے۔ مکّی اور مدنی آیات میں فرق اس شبیہ کی واضح نشاندہی کرتا ہے، مکّہ میں اللہ تعالیٰ اُن کو یوں فرماتے ہیں:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ وَذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا۔ اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِیْمًا۔

(اور جو باتیں یہ لوگ کہتے ہیں ان کو سہتے رہو اور اچھے طریق سے ان سے کنارہ کش رہو اور مجھے ان جھٹلانے والوں سے جو دولت مند ہیں سمجھ لینے دو اور ان کو تھوڑی سی مہلت دے دو کچھ شک نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے: المُزمّل۔ 10 تا 12)۔

103: اڈولف فون ہارناک ایک مذہبی گھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک پروٹسٹنٹ چرچ میں پادری تھے۔ اُن کا زیادہ کام مسیحیت کے بارے میں ہے۔ ان کی کتاب "تبلیغ و اشاعت مسیحیت" اِگناز گولڈ زیہر کی توجہ کا باعث بنی۔ چنانچہ گولڈ زیہر نے اپنی کتاب "اسلام میں عقیدہ اور شریعت" نامی کتاب میں ہارناک کی کتاب سے چند فقرے نقل کیے ہیں۔ ہارناک کا انتقال 1930ء میں ہائیڈل برگ میں ہوا۔

تفسیر جلالین میں اس جملے "وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا" (اُن سے اچھے طریقے سے کنارہ کش ہو جاؤ) کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ آیت جہاد اور جنگ کے حکم سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ دعویٰ حقیقت کے زیادہ نزدیک ہے کہ ایسی روش اور رویہ تب اپنایا گیا جب اوس و خزرج کے قبائل کی حمایت سے طاقت حاصل کر لی گئی تھی۔ جب محمد اپنے شمشیر زنوں کی قوت بازو سے مطمئن ہو جاتے ہیں تو جنگ اور کفار کے قتل کے احکامات نازل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے مدینہ میں یہ آیت نازل ہوتی ہے:

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔

(اور اُنھیں قتل کرو جہاں پاؤ اور اُنھیں نکال دو جہاں سے اُنھوں نے تمھیں نکالا ہے اور غلبہ شرک قتل سے زیادہ سخت ہے: البَقَرَة۔ 191)۔

مکّی سورت الأنعام کی آیت 108 میں ہمیں یہ پڑھنے کو ملتا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(اور اُنھیں گالی نہ دو وہ جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے یوں ہی ہم نے ہر اُمّت کی نگاہ میں اس کے عمل بھلے کر دیے ہیں پھر اُنھیں اپنے رب کی طرف پھرنا ہے اور وہ اُنھیں بتادے گا جو کرتے تھے)۔

اس آیت میں واضح نہیں ہے کہ یہاں اللہ فرما رہے ہیں یا پیغمبر۔ یہاں عمر اور حمزہ جیسے سرکش اور تند خو ساتھیوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ قریش کے خداؤں کو گالی مت دو کیونکہ اپنی نادانی کی وجہ سے بدلے میں وہ تمھارے خدا کو گالی دیں گے۔ ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ ہر گروہ اپنے اعمال کا بھلا جانے لیکن آخر میں اُنھوں نے خدا کے پاس ہی آنا ہے جو اُنھیں کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ لیکن مدینہ میں خصوصاً جب

مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے تو نہ صرف قریش کے خداؤں کو گالی دینے یا برا بھلا کہنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ کافروں سے پُر امن اور خوشگوار تعلقات رکھنے سے منع فرمایا جاتا ہے۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

(پس تم سست نہ ہو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہر گز تمہارے اعمال میں نقصان نہیں دے گا: محمّد۔ آیت 35)۔

کئی بار ایک ہی سورت میں متضاد احکامات جاری ہوتے ہیں۔ سورت البقرۃ وہ پہلی سورت ہے جو مدینہ ہجرت کے بعد نازل ہوتی ہے اور چونکہ یہ ایک طویل سورت ہے لہذا اس بات کا احتمال ہے کہ اس کا نزول ایک یا دو سال پر محیط ہو۔ ذیل میں درج آیت اُن میں سے ایک ہے جس میں اولین احکامات جاری ہوئے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

(دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے بے شک ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے پھر جو شخص شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا: البقرۃ۔ 256)۔

لیکن اسی سورت کا آیت 193 جب مسلمانوں کی جمعیت قوت پکڑ چکی تھی یا کوئی خاص حالات پیدا ہو چکے تھے تو غالباً تب نازل ہوئی جہاں سخت رویہ اپنانے کا حکم جاری ہوتا ہے۔

وَقَاتِلُوهُم حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ فَاِنِ انتَهَوا فَلَا عُدوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰالِمِينَ۔

(تم اُن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں)۔

لیکن سورت التّوبۃ جو قرآن کی آخری سورت ہے۔ اس میں لہجہ زیادہ قاطع اور عملی اقدامات کرنے کے احکامات زیادہ صریح ہو جاتے ہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (جنگ کرو اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے:29)۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ۔ (نبی کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں:113)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (اے نبی! کافروں اور منافقوں سے لڑائی کر اور اُن پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے:73)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً۔ (اے ایمان والو اپنے نزدیک کے کافروں سے جنگ کرو اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔123)۔

ہجرت کے آخری سالوں میں نازل ہونے والی سورت التّحریم میں بھی عمل میں شدت لانے کا حکم دیکھا جا سکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ (اے نبی، کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔9)۔

ابتدا میں اِن احکام میں اس قدر شدت اور سختی نظر نہیں آتی۔ حتیٰ کہ سورت الحجّ کی آیت 39 میں پہلی بار جہاد کا حکم جاری ہوتا ہے وہاں کفار سے جنگ کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اجازت دی گئی ہے۔ ''اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا''۔ اس آیت میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ اُن پر ظلم ہوا ہے۔ مسلمانوں پر کیا ظلم ہوا ہے وہ اس سے بعد والی آیت میں یوں بیان ہوا ہے۔

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ (وہ لوگ جنھیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا ہے صرف اس کہنے پر کہ ہمارا رب اللہ ہے)۔

زمخشری کا کہنا ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں مشرکین سے جنگ کو جائز ٹھہرایا گیا ہے، اس سے پہلے قرآن کی ستر سے زائد آیات جنگ کے خلاف آچکی تھیں۔

جنگ کی اجازت دیتے ہوئے محمد نے اپنی فطری سمجھ داری سے کام لیا ہے اور مسلمانوں کو مکّہ سے نکالا جانا یاد آجاتا ہے۔ اس باتدبیر بیان سے مہاجرین کی قریش سے نفرت کو بڑھاوا ہے۔ اور دوسری جگہ بھی اسی سمجھ داری سے خطاب کیا گیا ہے۔ لیکن اسے بنی اسرائیل کے لوگوں کے منہ سے یوں کہلوایا گیا ہے۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا۔ (ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑیں گے حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بیٹوں سے نکال دیا گیا ہے: البقرۃ۔246)۔

جنگ خدا کی راہ میں ہے لیکن مؤمنوں کو اُن کے ذاتی نقصانات یاد دلا کر اُن کی انتقامی حس کو بیدار کیا گیا ہے تاکہ وہ جنگ کرنے کے لیے اُتاولے ہو جائیں۔ مکّہ میں قیام کے دوران جنگ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سورت الأنعام کی آیت 68 میں درج ہے کہ محمد مشرکین سے ملا کرتے تھے اور اُن کے ساتھ نشست وبرخاست ہوتی تھی، وہ بعض اوقات بے ادبی بھی کرتے تھے اور کبھی مذاق بھی اڑاتے تھے۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ

(جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینی اور استہزا کر رہے ہیں تو اُن کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمھیں بھلا دے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔

مکّہ میں خدا پیغمبر سے یا مومنین کو فرماتا ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔

(اور اہل کتاب سے نہ جھگڑو مگر ایسے طریقے سے جو عمدہ ہو مگر جو ان میں بے انصاف ہیں اور کہہ دو ہم اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور تمھاری طرف نازل کیا گیا اور ہمارا اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہونے والے ہیں: العنکبوت۔46)۔

متعدد دوسری آیات حتیٰ کہ ہجرت کے شروع کے دنوں کی مدنی آیات بھی موجود ہیں جہاں اہل کتاب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ

(پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو: اسلام لاتے ہو؟ اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بے شک ہدایت پالیں اور اگر نہ مانیں تو تمھارا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے: آل عمران۔20)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا۔۔۔وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

(جو کوئی مسلمان اور یہودی اور نصرانی اور صابی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام بھی کرے اور ان پر نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے: البقرۃ۔62)۔

اِنھی مطالب کی سورت المائدۃ کی آیت 69 میں تکرار ہوتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیات ہجرت کے پہلے دو سالوں کے دوران نازل ہوئیں۔ لیکن دسویں ہجری میں مکّہ فتح ہو جانے کے نتیجے میں صورت

حال بدل جاتی ہے اور بجلی کی مانند کڑکتی سورت التّوبَة اہل کتاب کے سروں پر گرتی ہے۔ یہ وہ اہل کتاب ہیں جن کے متعلق اللہ نے مکّہ میں حکم دیا تھا کہ ان کے ساتھ بحث ومباحثہ کرتے وقت نرم زبان استعمال کیا کرو اور اگر یہ اہل کتاب ایک ان پڑھ پر ایمان نہ لائیں تو اُن کو سزا نہیں ہو گی۔ کیونکہ پیغمبر کا مقصد صرف اللہ کے پیغام اور احکام کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اِنھیں دسویں ہجری میں اسلام قبول کرنے یا ذلیل و محکوم ہو کر جزیہ ادا کرنے کی خبر سنائی جاتی ہے۔

قاتِلُوا الَّذِينَ لا يُؤمِنونَ بِاللّٰهِ وَلا بِاليومِ الآخِرِ وَلا يُحَرِّمونَ ما حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسولُهُ وَلا يَدينونَ دينَ الحَقِّ مِنَ الَّذينَ أوتُوا الكِتابَ حَتّٰى يُعطُوا الجِزيَةَ عَن يَدٍ وَهُم صاغِرونَ

(ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اسے حرام جانتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور سچا دین قبول نہیں کرتے ان لوگوں میں سے جو اہلِ کتاب ہیں یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں: التّوبَة۔ 29)۔

یوں وقت گزرنے کے ساتھ یہ اہل کتاب سورت البَیّنَة کی آیت چھ میں شَرُّ الْبَرِيَّةِ (بدترین مخلوقات) ٹھہرائے جاتے ہیں۔ یہ حکم یہودیوں کے قلع قمع کرنے، فتح خیبر، فدک پر قبضہ اور فتح مکّہ کے بعد جاری ہوتا ہے جب اسلام طاقت کی معراج حاصل کر چکا ہے۔ اب نرم زبان یا منطقی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، اب غیر مسلموں سے تلوار کی زبان میں بات کی جائے گی۔

مستحکم معیشت کا بندوبست

ہجرت شروع ہوتی ہے جس کے نتیجے میں محمد کے ساتھی مدینہ آتے ہیں۔ محمد نے انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارے کا معاہدہ کرا دیا، اور جس مہاجر کو کسی انصاری کا بھائی ٹھہرایا گیا، اسے وہ انصاری اپنے گھر لے آیا۔ اگرچہ مہاجرین نے کام کرنا شروع کر دیا تھا جو کہ کھیتوں اور دوکانوں پر مزدوری کرنا تھا لیکن معاشی مسئلے کا یہ کوئی مناسب اور دیرپا حل نہ تھا۔ جب کہ قریش سے مقابلہ کرنے کیلئے اُنھیں کوئی ایسا حل درکار تھا جو معاشی میدان کے علاوہ زندگی کی دوسرے شعبوں میں بھی اُنھیں اپنے پاؤں پر کھڑا کر سکے۔ حضور اپنے طور پر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ انصار اور مہاجرین سے ملے ہوئے تحائف کے علاوہ اُن کے پاس روزی کا کوئی اور وسیلہ نہیں تھا۔ معاشی تنگی کا عالم یہ تھا کہ اکثر اوقات رات کا کھانا کھائے بغیر ہی سو جاتے تھے یا چند کھجوروں سے بھوک مٹاتے تھے۔ اس صورت حال کا حل کیا ہے؟۔ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور معیشت کو مستقل بنیادوں پر استوار ہونے والے اہم اور بنیادی مقصد کے حصول کا راستہ کہاں ہے؟۔

سریہ نخلہ و غزوہ بدر

عرب قبائل میں پرانے زمانے سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ مال و دولت کے حصول کی خاطر کمزور قبائل پر حملہ کر کے اُن کا مال و دولت لوٹ لیا جاتا تھا۔ اُن وقتوں میں یثربی مسلمانوں کے پاس سوائے اِس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی یہی راستہ اختیار کریں۔ یوں اسلامی غزوات کا آغاز ہوتا ہے۔ غزوہ کے معنی کسی قافلے یا قبیلے پر اچانک حملہ کر کے اُن کے مال اور عورتوں پر قبضہ کر لینا ہے۔ عربوں کے ہاں اپنی بقاء کی جنگ کی یہ سادہ ترین شکل تھی۔

جب حضور تک خبر پہنچی کہ عمرو بن الحضرمی کی قیادت میں قریش کا ایک قافلہ شام سے مکّہ واپس جا رہا ہے۔ جو مال سے لدا پھندا ہوا ہے۔ تو عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں مہاجرین کی ایک ٹولی کو اُس طرف روانہ کیا جاتا ہے۔ یہ ٹولی نخلہ کے مقام پر گھات لگا کر بیٹھ گئی۔ اور جوں ہی وہ قافلہ وہاں پہنچا تو اس پر حملہ کر دیا۔ قافلے کے سربراہ کو قتل کرنے کے علاوہ دو لوگوں کو قیدی بنا لیا گیا، اور تمام سامان کے ساتھ مسلمان مدینہ واپس آ جاتے ہیں۔ اس غزوہ کو اسلامی تاریخ میں سریہ نخلہ کا نام دیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے اس پہلے سریہ پر بہت زیادہ لعن طعن ہوئی جس سے مسلمانوں کے لیے خاصی بڑی مشکل پیدا ہو گئی۔ زمانہ قبل از اسلام کے رواج کے مطابق رجب، ذیقعدہ، ذوالحج اور محرم کے چار مہینوں میں جنگ حرام تھی۔ چونکہ کاروان پر حملہ رجب کی پہلی تاریخ کو ہوا تھا، لہٰذا قریش نے مقدس مہینوں کی حرمت کو پامال کرنے پر بہت زیادہ اعتراضات اور غصے کا اظہار کیا۔ اس احتجاج اور اعتراضات کی خبر جب دوسرے قبائل کے لوگوں تک پہنچی تو قدرتی طور پر اُنھوں نے بھی اس احتجاج میں قریش کا ساتھ دیا۔ جس سے محمد بہت پریشان ہوئے اور عبداللہ بن جحش اور اُن کے ساتھیوں سے سرد مہری کا رویہ اختیار کیا۔ اُنھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس مسئلے کے سلسلے میں کون سا راستہ اختیار کریں۔

عبداللہ کا دعویٰ تھا کہ یہ حملہ یکم رجب کو نہیں بلکہ جمادی الثانی کی آخری تاریخ کو کیا گیا تھا، اور یوں اُنھوں نے اس مشکل مسئلے کو خود ہی حل کر دیا۔ علاوہ ازیں مال غنیمت بہت زیادہ تھا اور اس مال غنیمت نے محمد کے ساتھیوں کی زندگی کو سہارا دیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے قریش کے اعتراضات کی پروا نہ کی۔

بالکل بعید نہیں ہے کہ کچھ صحابیوں نے اس جانب اشارہ کیا ہو کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب مال کی واپسی کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ ہم اپنے جرم اور مخالفین کے حق پر ہونے کا اعتراف کر رہے ہیں۔ ویسے بھی معاشی زبوں حالی کے شکار مسلمانوں کو اس مال غنیمت کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس ساری مشکل کو سورت البَقَرَة کی آیت نمبر 217 نے بہت ہی فیصلہ کُن انداز میں یوں حل کر دیا۔

يَسئَلُونَکَ عَنِ الشَّھرِ الحَرامِ قِتالٍ فیهِ قُل قِتالٌ فیهِ کَبیرٌ وَصَدٌ عَن سَبیلِ اللّٰہِ وَ کُفرٌ بِهِ وَالمَسجِدِ الحَرامِ وَاِخراجُ اَھلِهٖ مِنهُ اَکبَرُ عِندَ اللّٰہِ وَالفِتنَةُ اَکبَرُ مِنَ القَتلِ وَلَا یَزالُونَ یُقاتِلُونَکُم حَتّٰی یَرُدُّوکُم عَن دِینِکُم اِنِ استَطاعُوا۔

(پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اِس میں لڑنا بہت برا ہے، مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ تو قتل سے بھی بڑا جرم ہے اور وہ تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمھیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے)۔

سریہ نخلہ کے بعد قریش کے مزید قافلوں اور دیگر قبائل کو لوٹنا ہی مسلمانوں کی معاشی مسائل کا واحد حل ثابت ہوا۔ سریہ نخلہ دوسرے غزوات کا آغاز تھا جن سے محمد اور اُن کے ساتھیوں کی معاشی اور سیاسی صورت بہت بہتر ہو گئی۔ یوں جزیرہ نما عرب پر قبضے اور تسلط حاصل کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔ لیکن جو چیز مسلمانوں کی مالی تقویت اور اُن کا مرتبہ بڑھانے کی براہ راست سبب بنی، وہ یثرب کے یہودیوں کے مال واموال پر قبضہ کرنا تھا۔

یثرب کے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ

یثرب میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ نامی تین یہودی قبائل آباد تھے، جو زراعت و تجارت اور دست کارانہ پیشے کی وجہ سے بہت خوشحال تھے۔ دینی تعلیم سے آراستہ ہونے کے علاوہ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے اوس اور خزرج نامی دونوں قبائل کے مقابلے میں خود کو افضل قرار دیتے تھے۔

ان دونوں قبیلوں کی اکثریت یہودیوں کی زمینوں پر مزارع اور دوکانوں پر چوکیداری سے روزی کماتی تھی۔ اس حیثیت کی وجہ سے اوس و خزرج ان تین قبیلوں کے خلاف حسد، نفرت اور حقارت کے

جذبات رکھتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اوس و خزرج کے محمد کے پاس آنے اور بیعت عقبہ کی بنیادی وجہ یہودیوں کے تسلط اور حقارت سے چھٹکارا پانا تھا۔ لیکن حضرت محمد نے مدینہ آمد کے آغاز میں ان سے نمٹنے کے لیے انتہائی دانش مندی سے کام لیا، اور کسی کے ساتھ بھی چپقلش اور ناراضگی پیدا کرنے سے اجتناب کیا کیونکہ یہودی طاقتور ہونے کے علاوہ صاحب حیثیت بھی تھے۔ چنانچہ اُن کے ساتھ عدم جارحیت اور تعاون کا معاہدہ ہوا۔ عهد موادعہ جو طے پایا تھا، کی رُو سے ہر کوئی اپنے مذہب پر قائم رہ سکتا تھا۔ قریش مکہ یا کسی اور دشمن قبیلے کے شہر پر حملے کی صورت میں مسلمان اور یہودی مل کر یثرب کا دفاع کریں گے اور فریقین کسی دشمن قبیلے سے جنگ کی صورت میں اخراجات خود برداشت کریں گے۔

اس کے علاوہ بھی مسلمانوں اور یہودیوں میں ایک اور مشترک وجہ تھی۔ دونوں شرک اور بت پرستی سے متنفر تھے اور دونوں ایک ہی قبلہ کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے تھے۔ جب تک مسلمان کمزور تھے تب تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ لیکن ہجرت کے صرف ڈیڑھ سال بعد محمد نے قبلہ تبدیل کر دیا اور مسجد اقصیٰ کی بجائے کعبہ کی طرف رخ کر لیا۔ تو یہودی اس مسئلے پر معترض ہوئے جس کا جواب سورت البَقَرَة کی آیت 177 میں یوں نازل ہوا۔

لَيسَ البِرَّ أَن تُوَلّوا وُجوهَكُم قِبَلَ المَشرِقِ وَالمَغرِبِ وَلٰكِنَّ البِرَّ مَن آمَنَ بِاللَّهِ وَاليَومِ الآخِرِ

(نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان لائیں)۔

یہودیوں کے نزدیک قبلہ کی تبدیلی خطرے کی علامت تھی۔ لگاتار کئی چھوٹے غزوات اور اہل مکّہ کے تجارتی قافلوں پر حملے جس کا نتیجہ بدر کی جنگ اور مسلمانوں کی فتح کی صورت میں نکلا، اس صورت حال نے اُن کی بے چینی میں مزید اضافہ کر دیا۔ کبھی بے حیثیت اور مفلس اوس و خزرج اُن کے ہاں مزدوری

کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن اب یہودیوں کا سامنا اُس اوس و خزرج سے تھا، جو اب محمد کے علم کے نیچے آ گئے تھے اور اسلام کے نام پر اپنی محکم صفوں کے ترتیب پا جانے کی وجہ سے اُنھیں برابری کی سطح سے آنکھیں دکھا رہے تھے۔ اِنھی پریشانیوں کے نتیجے میں یہودیوں کے بعض سردار جیسے کعب بن اشرف مکّہ گئے اور جنگ بدر میں شکست خوردہ اہل قریش سے ہمدردی کا اظہار کیا اور اُنھیں محمد اور اُن کے ساتھیوں سے جنگ کرنے پر اُکسایا۔ سورت النِّسَاء کی آیت 51 میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ وَيَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَاۤءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا

(کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا وہ بتوں اور شیطانوں کو مانتے ہیں اور کافروں سے یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے زیادہ راہِ راست پر ہیں)۔

یہاں بہت واضح انداز میں سرزنش کی گئی کہ وہ لوگ جو خود کو اہل کتاب گردانتے ہیں اور جن کی کتاب شرک اور بُت پرستی کی مخالفت کرتی ہے، یہ مشرکوں کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے ہیں اور اُنھیں محمد کے ساتھیوں جو خدا کی پرستش کرتے ہیں، سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں۔

اسی دوران مدینہ کے بازار میں ایک چھوٹا سا معمولی حادثہ پیش آتا ہے جو بنو قینقاع کے ساتھ جنگ اور اُن کے محلے کے محاصرے پر منتج ہوتا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ ایک انصاری مسلمان عورت بنو قینقاع سے تعلق رکھنے والے ایک سنار کی دوکان پر گئی۔ یہودی سنار اُس کے ساتھ عشقیہ باتیں شروع کر دیتا ہے جس پر وہ عورت غصے سے اُسے جھڑک دیتی ہے۔ یہودی اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے اور عورت کو ذلیل کرنے کے لیے پیچھے سے اُس کے لباس میں چپکے سے یوں ایک کانٹا چبھوتا ہے کہ جب عورت اٹھے تو اُس کے جسم کا نچلا حصہ ننگا ہو جائے اور لوگ قہقہے لگائیں۔ مسلمان عورت اس ناشائستہ حرکت پر غصے میں آ جاتی ہے اور اُس کی فریاد سے ایک مسلمان مرد اُس کی مدد کو آتا ہے۔

مسلمان مرد اُس یہودی سنار کو قتل کر دیتا ہے۔ یہودی اپنے ہم مذہب کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اُس مسلمان کو قتل کر دیتے ہیں۔ شور و شرابا برپا ہو گیا جس کے شکایت مسلمان محمد کے پاس لے گئے۔ اُن کے حکم پر بنو قینقاع کی گلیوں میں ہجوم اکٹھا ہو گیا، اور محاصرہ کر لیا گیا اور اُن کی خوراک کی سپلائی منقطع کر دی گئی۔ پندرہ دنوں بعد بنو قینقاع نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اُنھیں اس شرط پر جان کی امان دی گئی کہ وہ یثرب سے چلے جائیں گے اور سوائے اُن چیزوں کے جو اُن کے جانور اٹھا کر لے جا سکتے ہیں، باقی چیزیں ایک جگہ جمع کر دیں گے تاکہ اُنھیں بے گھر اور لوازمات زندگی سے محروم مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس حادثے سے مہاجرین کو معاشی طور پر بہت تقویت ملی اور یہودیوں کے دلوں میں خوف بیٹھ گیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور واقعے کی وجہ سے بنو نضیر بھی اس نوبت کو پہنچ گئے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ محمد اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ بنو نضیر کے ہاں گئے تاکہ کسی قتل کی دیت کے حوالے سے تصفیہ کرا سکیں۔ یہودی جو کعب بن اشرف نامی اپنے سردار کے قتل کی وجہ سے غصے میں تھے[104]۔ اُنھوں نے حضور کو قتل کرنے کا ارادہ کیا جس کا علم حضور کو بذریعہ وحی ہوا۔ حضرت محمد نے جنگ کا حکم دے دیا اور مسلمانوں نے بنو نضیر کی گلیوں کا محاصرہ کر لیا۔ اور کھانے پینے کی چیزوں کو اندر جانے سے روک دیا۔

بنو نضیر کے لوگ بنو قینقاع سے زیادہ مسلح تھے، شائد اُنھوں نے بنو قینقاع کے واقعے سے عبرت حاصل کر کے بہتر تیاری کر لی تھی۔ لہٰذا وہ مردانہ وار لڑے اور محاصرہ اس قدر طول پکڑ گیا کہ پیغمبر کو فکر لاحق ہوئی کہ مسلمان اپنی ناپائیدار طبع اور قومی غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے اس محاصرے سے تھک جائیں

104: کعب بن اشرف کے قتل کی تفصیل اگلے باب میں دی گئی ہے

گے اور اپنے گھروں کا رخ کر لیں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے بنو نضیر کے باغات کو نذر آتش کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

بھیڑوں اور اونٹوں کے مانند کھجوروں کے درخت بھی عربوں کی روزی اور امارت کا وسیلہ ہوا کرتا تھا، لہذا بنو نضیر کی طرف سے احتجاج کی آواز بلند ہوئی اور اُنھوں نے چلا کر محمد سے کہا: "تم جو خود کو ایک مصلح انسان سمجھتے ہو اور لوگوں کو ویرانی، تباہی اور فساد سے منع کرتے ہو اس غیر انسانی کام میں کیوں ہاتھ ڈالا ہے اور ان پھل دار درختوں کو کیوں تباہ کرتے ہو؟"۔[105]

لیکن محمد نے اس سے ہاتھ نہ کھینچا اور اُسی وقت اُس واقعہ کے متعلق جواب میں سورت الحشر کی آیات 3-4-5 نازل ہوئیں جو یہودیوں کو جواب کے طور پر پڑھی گئیں تاکہ اپنے فعل کو جائز اور درست ٹھہرایا جاسکے۔

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ

(اور اگر اللہ نے اُن کے لیے جلاوطن کرنا نہ لکھ دیا ہوتا تو اُنھیں میں بھی عذاب دے دیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرے تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ مسلمانوں تم نے جو کھجور کا پیڑ

105: پھر آپ نے اُنھیں جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور سب کو لے کر اُن کے مقابلے پر لے آئے اور محاصرہ کر لیا۔ یہودی آپ کے مقابلے پر کئی قلعوں میں قلعہ بند ہو گئے۔ رسول اللہ نے حکم دیا کہ ان کے تمام نخلستان کاٹ کر جلا دیئے جائیں، یہودیوں نے قلعوں سے پکار کر کہا اے محمد! تم تو اس بربادی سے منع کرتے تھے اور جو ایسا کرتا تھا اُسے بُرا کہتے تھے۔ اب کیا ہوا کہ تم خود ہمارے نخلستانوں کو قطع کروا کر اِنھیں جلا رہے ہو۔ (تاریخ الرسل والملوک)۔

کاٹ ڈالا یا اُس کو اُس کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا یہ سب اللہ کے حکم سے ہوا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے)۔

یعنی اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر حربہ جائز اور درست ہے۔ مقصد کے حصول کے لیے ہر حربے کو جائز سمجھنے کا رویہ گو غیر انسانی ہے لیکن عرب قبائل کے ہاں یہ ایک عام رائج رویہ تھا۔ چنانچہ بنو ثقیف کے ساتھ جنگ اور طائف کے محاصرہ میں بھی یہی طریقہ استعمال ہوا، اور پیغمبر نے حکم جاری کیا کہ ان کے انگوروں کے باغات جلا دیئے جائیں۔

لہذا یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ 61 ہجری میں کوفہ کے لشکریوں نے کربلا کے صحرا میں اُن کے خانوادے حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کے لیے پانی کی فراہمی بند کر دی تاکہ حسین بن علی بیعت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

بیس دنوں کے بعد بنو نضیر نے ہار تسلیم کر لی اور قبیلہ خزرج کے چند سرداروں کی سفارش پر اُنھیں مدینہ سے باحفاظت نکلنے دیا گیا اور اُنھوں نے تمام مال ایک جگہ پر رکھ دیا تاکہ اسے محمد کے ساتھی آپس میں بانٹ لیں۔

اب یہودیوں کا واحد معتبر قبیلہ جو یثرب میں موجود تھا وہ بنو قریظہ تھا، جن کا جنگ خندق کے بعد کام تمام ہوا۔ اُن پر الزام تھا کہ اُنھوں نے مدینہ کے اندر سے قریش جنھوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، کی مدد کرنے کی حامی بھری تھی۔ لیکن محمد نے بہت ہوشیاری سے اُن کے درمیان پھوٹ ڈلوا دی اور یوں ابو سفیان کو اُن سے کوئی مدد نہ ملی۔ اس سے ابو سفیان مدینہ کو فتح کرنے سے مایوس ہو گیا اور اُس نے محاصرہ اٹھا لیا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے جو پہلا کام کیا وہ بنو قریظہ پر حملہ اور اُن کا محاصرہ کرنا تھا۔ محاصرہ پچیس دن تک جاری رہا۔ اس قبیلے کے سردار بھی یہ سوچ کر حاضر ہوئے کہ وہ بھی دوسرے دونوں یہودی قبائل کی

مانند اپنا مال و اموال لے کر مدینہ چھوڑ پائیں گے لیکن محمد ایسا نہیں چاہتے تھے۔ شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ بنو قریظہ کے ابو سفیان کے ساتھ تعلق کی وجہ سے وہ اپنے دل میں اُن کے خلاف کینہ رکھتے ہوں۔ اور اُنھوں نے سوچا ہو کہ بنو قریظہ کو تباہی سے دوسرے قبائل مسلمانوں کی شان و شوکت سے مرعوب ہوں گے۔ قتل کیے جانے کے ڈر سے بنو قریظہ نے قبیلہ بنو اوس سے رابطہ کیا[106] تا کہ اُن کے ساتھ بھی وہی رویہ اختیار کیا جائے جو بنو خزرج کے سرداروں کی وجہ سے دوسرے دونوں قبائل کے ساتھ اختیار کیا گیا۔

قبیلہ اوس کے لوگوں کی سفارش کے جواب میں پیغمبر نے فرمایا: "میں اوس کے رؤسا میں ایک کو اس سلسلے میں مقرر کرتا ہوں، وہ جو بھی فیصلہ کرے گا اُس پر عمل کیا جائے گا"۔ چنانچہ سعد بن معاذ کو حکم دیا گیا جس کے متعلق اُنھیں علم تھا کہ اُس کی بنو قریظہ کے ساتھ دشمنی ہے[107]۔

106: اس کے بعد بنو قریظہ نے رسول اللہ سے کہلا بھیجا کہ عمرو بن عوف کے ابولبابہ بن المنذر کو ہمارے پاس بھیج دیجیے تا کہ ہم اُن سے اپنے معاملے میں مشورہ کرلیں۔ رسول اللہ نے اُن کو بنو قریظہ کے پاس بھیج دیا۔ جب اُن کی نظر ابولبابہ پر پڑی، وہ سب اُن کے استقبال کے لیے اُٹھے، اُن کی عورتیں اور بچے روتے ہوئے اُن کے پاس آئے۔ اس منظر سے ابولبابہ کو اُن پر ترس آ گیا۔ بنو قریظہ نے اُن سے کہا کہ کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم محمد کے فیصلے پر ہتھیار رکھ دیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں مگر اپنے حلق پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم سب ذبح کر دیے جاؤ گے۔ ابولبابہ کہتے ہیں کہ کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی مگر فوراً ہی میرے دل نے محسوس کیا کہ یہ تو میں نے اللہ اور اُس کے رسول سے خیانت کی ہے۔ ابولبابہ وہاں سے بغیر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے سیدھے مدینہ آکر مسجد نبوی میں آئے اور اُنھوں نے اپنی خطا کی پاداش میں خود کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھا اور اللہ سے عہد کیا کہ جب تک اس خیانت کو اللہ معاف نہ کر دے گا میں اس جگہ سے نہیں ہٹوں گا اور اب کبھی بنو قریظہ کی زمین پر قدم نہیں رکھوں گا اور اللہ مجھے کبھی بھی اس علاقے میں نہ دیکھے جس میں میں نے اللہ اور اُس کے رسول سے خیانت کی ہے۔ (تاریخ الرسل والملوک)۔

107: سعد بن معاذ غزوہ احزاب میں زخمی ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے زخمی ہونے کے بعد دعا مانگی: "اللہ، جب تک میری آنکھیں بنو قریظہ کی تباہی دیکھ کر ٹھنڈی نہ ہو لیں، تو مجھے موت نہ دے۔ یہ لوگ جاہلیت میں سعد کے موالی اور حلیف تھے" (تاریخ الرسل والملوک، محمد بن جریر الطبری)۔ "اے خدا، ابھی اگر قریش کی جنگ باقی ہے، تو مجھ کو زندہ رکھیو۔ کیونکہ مجھے قریش سے زیادہ کسی سے جنگ کرنے کی

سعد آپ کی امیدوں اور خواہش پر پورے اترے اور اُنھوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور اُن کی تمام جائیداد اور اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے[108]۔ فیصلہ اگرچہ ظالمانہ تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا کہ فریقین نے سعد بن معاذ کو منصف تسلیم کیا تھا۔ اس کے علاوہ اگرچہ یہ عمل بہت متشدد اور انسانی زندگی کی شرط کے خلاف تھا لیکن ایک ریاست کے قیام کے لیے شائد ضروری تھا۔ مدینہ کے بازار میں کئی کھڈے کھودے گئے۔ سات سو یہودی جنھوں نے ہتھیار پھینکے تھے اور امن کی درخواست کی تھی، یکے بعد دیگرے قتل کر دیئے گئے۔

خواہش نہیں ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے تیرے رسول کو تکلیفیں پہنچائیں، اور اُن کو اُن کے گھر سے نکالا ہے۔ اور اگر تو نے قریش کی جنگ کا خاتمہ کر دیا ہے، تو مجھے اُس وقت تک زندہ رکھ کہ میں اپنی آنکھوں سے بنو قریظہ کی تباہی دیکھ لوں"۔ (سیرت رسول اللہ، ابن اسحاق)

108: حدیث کی تمام کتابوں میں درج ہے کہ مردوں اور بچوں کا فرق جاننے کے لیے بچوں کو ننگا کیا گیا۔ جس کے زیر ناف بال اُگ آئے تھے یا جسے احتلام ہو چکا تھا، اُسے مرد سمجھ کر قتل کر دیا گیا۔ بنو قریظہ کے عطی جو بعد میں صحابیت کے مرتبے پر فائز ہوئے، وہ اس لیے بچ گئے کہ اُن کے زیر ناف بال نہیں آگے تھے لیکن اُن کا ساتھی نہیں بچ سکا۔ عطی قرضی سے روایت ہے "میں اُس وقت لڑکا تھا جس وقت سعد نے بنو قریظہ کے قتل کا حکم فرمایا۔ پھر مجھ کو دیکھا اور میرے قتل میں اُنھوں نے شک کیا جس وقت اُنھوں نے مجھ کو زیر ناف بالوں والا نہیں پایا۔ میں وہی ہوں جو تمہارے درمیان موجود ہوں" (سنن نسائی، کتاب الطلاق)

"آپ نے حضرت سعد بن عبادہ کو یہ قیدی دے کر ملک شام بھیجا تا کہ اُن کو فروخت کر کے اُن کی قیمت سے ہتھیار اور گھوڑے خرید لائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ان غلاموں کے بدلے میں کثیر تعداد میں گھوڑے خریدے۔ آنحضرت نے اُن گھوڑوں کو مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا۔ اُن میں جو باندیاں بنی تھیں اُن کو حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے خرید لیا تھا۔ پہلے ان باندیوں کی دو قسمیں کی گئیں کہ جوان لڑکیوں کو علیحدہ کر لیا گیا اور بوڑھی عورتوں کو علیحدہ کر لیا گیا (خریدار دو ہی آدمی تھے ایک عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے عثمان غنی)۔ اب حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان کو اختیار دے دیا کہ ان دو قسموں سے جسے چاہیں پہلے خرید لیں۔ حضرت عثمان نے بوڑھی عورتوں کو خرید لیا اور حضرت عبدالرحمٰن نے جوان لڑکیوں کو خرید لیا۔ اور پھر حضرت عثمان نے اپنی خرید کردہ بوڑھیوں میں سے ہر ایک کو اختیار دیا کہ اگر وہ اتنا مال اُن کو ادا کر دے تو وہ آزاد ہو گی۔ اب مال جو کچھ تھا وہ بوڑھیوں کے ہی پاس تھا جوان لڑکیوں کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس لیے حضرت عثمان کو بہت منافع ہوا"۔ (سیرت حلبیہ، علی بن بُرہان الدین حلبی)۔

کچھ لوگوں نے مقتول قیدیوں کی تعداد ایک ہزار بتائی ہے۔ سعد بن معاذ کے فیصلے کے بر عکس کہ اُنھوں نے عورتوں کو قیدی بنانے کا فیصلہ سنایا تھا، ایک عورت کی گردن بھی ماری گئی وہ حسن قرضی کی بیوی تھی اور اُس وقت وہ عائشہ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ جب اُس کا نام پکارا گیا تو وہ اُٹھی اور ہنستی ہوئی قتل گاہ کی جانب چل پڑی۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ جب بنو قریظہ کے محلے کا محاصرہ جاری تھی تو اُس نے ایک پتھر پھینکا تھا۔ عائشہ کہتی ہے کہ ایسی خوب صورت، خوش مزاج اور نیک دل عورت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جب قتل گاہ کی طرف جانے کے لیے اٹھی تو میں نے اُسے کہا: "تمھیں قتل کرنا چاہ رہے ہیں!"۔ تو اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "میرے لیے زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی[109]"۔

109: ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ بنی قریظہ کی عورتوں میں سے کوئی بھی عورت نہیں قتل کی گئی سوائے ایک عورت کے جو میرے پاس بیٹھ کر اس طرح باتیں کر رہی تھی اور ہنس رہی تھی کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ میں بل پڑ جا رہے تھے، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مردوں کو تلوار سے قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ ایک پکارنے والے نے اس کا نام لے کر پکارا: فلاں عورت کہاں ہے؟ وہ بولی: میں ہوں، میں نے پوچھا: تجھ کو کیا ہوا کہ تیرا نام پکارا جا رہا ہے، وہ بولی: میں نے ایک نیا کام کیا ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: پھر وہ پکارنے والا اس عورت کو لے گیا اور اس کی گردن مار دی گئی، اور میں اس تعجب کو اب تک نہیں بھولی جو مجھے اس کے اس طرح ہنسنے پر ہو رہا تھا کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ میں بل پڑ پڑ جا رہے تھے، حالانکہ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ قتل کر دی جائے گی۔ (سنن ابن داؤد، کتاب الجہاد)۔ نوٹ: اس عورت نے حضور کو گالیاں دی تھیں۔

اقتدار کی جانب قدم

ریاستی تشکیل کی تیاری

ہجرت کے دس سالہ واقعات کے مطالعے سے بخوبی یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک ریاست تشکیل کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ مکّہ میں نبوت کا تیرہ سالہ عرصہ لوگوں کو وعظ و نصیحت، روز محشر کا خوف دلانے اور نیک کاموں کی تلقین کرنے میں گزرا تھا۔ لیکن حالات اب ایسی صورت اختیار کر چکے تھے کہ لوگوں پر حکومت قائم کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ اور وہ لوگ پسند کریں یا نہ کریں اُن پر نئے ضابطے لاگو کیے جائیں۔ اس ہدف کے حصول کے لیے ہر وہ وسیلہ اور تدبیر جائز سمجھی گئی جو روحانیت کے مقام کے منافی ہونے کے علاوہ کسی ایسے انسان کے شایان شان نہیں تھی جو کبھی رشد و ہدایت کا دعوے دار تھا۔

سیاسی قتل جو اُن دنوں میں ہوئے اور وہ غزوات جن کا بظاہر کوئی جواز نہیں تھا، ایسے قبائل پر حملے کرنا جنھوں نے ابھی تک کسی قسم کی جارحیت کا ارتکاب نہیں کیا تھا لیکن جاسوسوں نے اُن کے متعلق خبر دی تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بے چین ہیں یا اُن کے متعلق اچھے جذبات نہیں رکھتے، یہ سب کاروائیاں اُسی ہدف کے حصول کی خاطر جائز ٹھہریں۔ اس کے علاوہ قریش کے تجارتی قافلوں پر حملے ہوتے ہیں جن سے اُنھیں کمزور کرنا، مال غنیمت سے مسلمانوں کی مالی حالت بہتر بنانا، دوسرے قبائل کو مرعوب کرنے کے علاوہ اُن پر مسلمانوں کی شان و شوکت کی دھاک بٹھانا بھی مقصود تھا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں اسلامی شریعت کے اکثر احکام نازل ہوتے ہیں اور مالی، معاشرتی اور سیاسی نظام کا قیام عمل میں آتا ہے۔

مکہ کے قیام کے دوران احکام اور ضوابط جاری نہیں ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے گولڈ زیہر دعویٰ کرتا ہے:
”مکّی آیات کسی نئے مذہب کا اعلان نہیں کرتیں۔ مکّی قرآن کی بیشتر آیات پرہیز گاری، نماز کی صورت میں ایک خدا کی عبادت، دوسروں کے ساتھ اچھائی سے پیش آنا، اور کھانے پینے میں اسراف سے اجتناب کی ترغیب دیتی ہیں“۔

مکّہ میں فقط یہ پانچ اصول مقرر ہوتے ہیں۔

- توحید اور رسالت کا اقرار کرنا
- نماز
- رضاکارانہ طور پر زکات دینا
- یہودیوں کی پیروی پر ایک دن کا روزہ رکھنا
- عربوں کے قومی معبد کی زیارت یعنی حج

علامہ جلال الدین السیوطی کا کہنا ہے کہ مکّہ میں ”حد“ یعنی شرعی سزاؤں کا وجود نہیں تھا، جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ابھی تک ایسے احکامات صادر نہیں ہوئے تھے۔

جعبری[110] کے بقول جس سورت میں بھی کوئی فریضہ عائد ہوا ہے وہ سورت حتمی طور پر مدنی ہے۔

110: جَعبَری کا پورا نام ابراہیم بن عمر اور کنیت ابو اسحاق تھی۔ شام کے شہر رقہ کے پاس قلعہ جعبر نامی جگہ پر پیدا ہونے کی وجہ سے جعبری کہلائے۔ مشہور قرأت شناس، اور شافعی فرقہ کے عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ 1821ء اور 1932ء کے درمیان زندہ رہے۔ دمشق اور بغداد سے تعلیم حاصل کی۔ وفات تک فلسطینی شہر الخلیل (Hebron) میں مقیم رہنے کی وجہ سے شیخ الخلیل کہلائے۔ اُنھیں ابن سراج بھی کہا جاتا تھا۔ بغداد میں تقی الدین کی کنیت کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ برہان الدین کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ کتابیں تالیف کیں۔

عائشہ کہتی ہیں: ” مکّہ کے قرآن میں صرف جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ حلال و حرام اسلام کے فروغ کے بعد داخل ہوئے “۔

لیکن مدینہ میں حالات ایسے نہیں تھے۔ تمام احکام اور فرائض آخری دس سالوں میں صادر اور لاگو ہوتے ہیں۔ اور اسلام صرف ایک نئ شریعت کے طور پر ہی سامنے نہیں آتا، بلکہ ایک عربی ریاست کی تشکیل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا قدم قبلہ کو مسجد اقصیٰ کی بجائے کعبہ کی طرف موڑنا تھا۔

یہ ایک ایسی تدبیر تھی جس نے ٹیکس کی ادائیگی کے حوالے سے مسلمانوں کو یہودیوں سے علیحدہ کر دیا اور مدینہ میں مقیم عرب جس احساس کمتری کا شکار تھے اس کا خاتمہ کرتے ہوئے تمام عربوں میں قومی حمیت کے جذبات کو بیدار کیا گیا۔ یہ تمام عرب قبائل کعبہ کو قابل احترام سمجھنے کی وجہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ کعبہ بتوں کا مرکز اور عبادت گاہ ہونے کے علاوہ ابراہیم و اسماعیل کا گھر بھی تھا، جن کی اولاد ہونے کا ہر عرب دعوے دار تھا۔

اس طرح پیغمبر اسلام نے روزوں کے سلسلے میں بھی یہودیوں کی پیروی ترک کر دی۔ اُن کی پیروی میں دس محرم کو جو روزہ رکھا جاتا تھا، پہلے تو اُن کی تعداد میں تبدیلی لائی گئی، اور بعد میں اس کے لیے رمضان کا پورا مہینہ مختص کر دیا گیا۔

نکاح و طلاق، بیویوں کی تعداد کا تعین، وراثت، حیض، زنا اور چوری کی سزا، قصاص اور دیت، جرائم کی سزا، سماجی تعلیمات، نجاسات، محرمات و ختنہ وغیرہ کے متعلق احکام کی اکثریت یا تو یہودی شریعت سے اخذ کی گئی یا وہ قبل از اسلام کے عربی رسوم و رواج تھے، جن میں کچھ تبدیلیاں یا اصلاح کر کے مدینہ میں انہیں نافذ کر دیا جاتا ہے۔

اگرچہ انفرادی امور اور معاشرے سے متعلقہ ضابطے اور احکام یہودیوں کے مذہب اور دور جاہلیت کے رسم ورواج کا رنگ لیے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی نظم اور اراکین کے باہمی تعلقات میں بہتری آنے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یوں دوسری اقوام بھی تمدن کے سلسلے میں ایک دوسرے سے رنگ قبول کرتی ہیں۔ عبادات تمام ادیان میں موجود ہیں۔ جنھیں کسی حد تک اصلاح اور تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان کی طرز یا کیفیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی بھی سمجھدار انسان حج کے فلسفے، اس کے دوران انجام دی گئی رسوم میں کسی قسم کا فائدہ یا عقلی جواز تلاش نہیں کرپاتا۔

ہجرت کے آٹھویں سال محمد کا کعبہ کی زیارت کا عزم جس حد تک جا پہنچتا ہے، وہ ایک ناقابل فہم معمہ کی مانند ہے۔ کیا واقعی وہ یہ سمجھتے تھے کہ کعبہ خدا کا گھر ہے یا اُنھوں نے اپنے ساتھیوں کی خواہش پر جنھیں اپنے اسلاف کی پیروی میں کعبہ کی زیارت کی پرانی عادت تھی، اس کام میں ہاتھ ڈالا تھا؟۔ کیا یہ جلدی میں کیا گیا فیصلہ تھا جسے قریش کی مخالفت کا سامنا ہوا، مسلمانوں کو مکّہ داخل نہ ہونے دیا گیا اور حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں کو شکست نما صلح نامے کو قبول کرنے کا باعث بنا؟ یا یہ کسی قسم کا ڈرامہ اور سیاسی چال تھی جس سے مسلمانوں کی تعداد اور طاقت سے قریش کو مرعوب کرنا تھا اور مکّہ میں موجود نچلے اور متوسط طبقے کے غیر جانبدار لوگوں کو ایک نئے مذہب کو قبول کرنے کی تحریک دینا تھی؟۔

ایک آدمی جو ایک تازہ دین اور جدید شریعت لے کر آیا تھا جس نے اپنی قوم کے عقائد و خرافات سے منہ موڑا تھا، اُنھی کی ایک پرانی رسم کا نئے انداز میں احیا کرتا ہے؟۔

دین اسلام کے مبلغ اور خدا پرست محمد جنھوں نے اپنا بنیادی ہدف خدائے واحد کی ثنا قرار دیا تھا اور اپنی قوم پر زور دے کر کہا تھا: "قولو الا إلهَ إلّا اللهُ تُفلِحوا" (کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے) اور اللہ کا قرب حاصل کی بنیاد فضیلت و تقویٰ پر رکھتے ہوئے واضح انداز میں فرمایا تھا: "اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ"

(تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے: الحُجرَات۔ 13) کیا وہ آدمی قومی حمیت اور نسلی تعصب سے مغلوب ہو گیا تھا جو اسماعیل کے گھر کی ستائش کو عربوں کی قومی شناخت قرار دیا؟۔

صورت جو بھی تھی بہر حال یہ حیران کُن فیصلہ اسلامی تعلیمات سے اس قدر متصادم تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے کی بُت پرستانہ رسم سے کراہت کا اظہار کیا۔ اور اُنھیں اس رسم کو قبول کروانے کی خاطر قرآنی آیت سے مدد کی ضرورت پیش آئی[111]۔

ایک مستند حدیث کے مطابق عمر جو ایک معتبر ترین صحابی اور ذہین ترین ساتھیوں میں سے ایک تھے، نے کہا تھا۔ اگر میں نے خود نہ دیکھا ہوتا کہ حضور نے حجر اسود کو بوسہ دیا تھا تو میں اس پتھر کو کبھی نہ چومتا[112]۔

حجت اسلام امام محمد غزالی[113] نے واضح لفظوں میں لکھا ہے۔: "مجھے حج کے مناسک و رسوم ادا کرنے کا بالکل بھی کوئی معقول جواز نہیں ملتا لیکن چونکہ ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہذا میں اِن کے اطاعت کرنے

111: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ :البقرة-158 (بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جو کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان کے درمیان طواف کرے اور جو کوئی اپنی خوشی سے نیکی کرے تو بے شک اللہ قدردان جاننے والا ہے)

112: عابس بن ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو حجر اسود کا بوسہ لیتے دیکھا، وہ کہہ رہے تھے: میں تیرا بوسہ لے رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے، اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرا بوسہ لیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ لیتا۔ (سنن ترمذی، کتاب الحج)۔

113: ابو حامد غزالی طوس میں پیدا ہوئے۔ طوس و نیشاپور کے مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے بغداد چلے گئے۔ سلجوقی سلطان کے وزیر نظام الملک کے دربار سے وابستہ رہے۔ اپنے وقتوں کے عظیم اسلامی فلسفی، صوفی اور متکلم تھے۔ عربی اور فارسی

پر مجبور ہوں"۔ قرآن میں ایک آیت موجود ہے جو اس سوچ کی سمت دریچہ کھولتی ہے اور شائد اس سوال کا جواب دیتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ

(اے ایمان والو! مشرک تو پلید ہیں تو اِس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کا پاس نہ جانے پائیں اور اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو تو خدا چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا: التّوبۃ۔28)۔

جلالین کی تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ فتوحات اور جزیہ کے ذریعے عربوں کو بے نیاز کر دے گا۔ سورت التّوبۃ قرآن کی آخری سورت ہے اور دسویں ہجری میں فتح مکّہ کے بعد نازل ہوتی ہے۔ پیغمبر اس آیت کے ذریعے غیر مسلم قبائل کو کعبہ کی زیارت سے روک دیتے ہیں۔

عرب قبائل اور طائفوں کی آمد و رفت اہل مکّہ کی خوشحالی اور روزی کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اہالیان مکّہ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ پیغمبر کے قبیلے سے ہی تعلق رکھنے والے لوگ تھے اور غالباً ڈر کی وجہ سے مسلمان ہوئے تھے۔ چنانچہ اگر مکّہ اپنی رونق کھو دے تو ارتداد کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اِس خطرے سے نمٹنے کے لیے ہر مسلمان کے لیے حج کی ادائیگی واجب ٹھہری۔

بیشک یہ ایک مفروضہ ہے اور ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس حد تک حقیقت پر منطبق ہوتا ہے۔ تاہم حج کے تمام مناسک یعنی تمام وہ رسوم جو جاہلیت کے دنوں میں کبھی بُت پرست ادا کرتے تھے،

میں بے شمار کتابیں تالیف کیں۔ جن میں کیمیائے سعادت اور احیائے علوم الدین بہت مشہور ہیں۔ اپنے دینی تبحر کی وجہ سے حجت اسلام کہلاتے تھے۔ کچھ لوگ انہیں مجدد کا درجہ دیتے ہیں۔

عقلیت پسند آدمی تو در کنار مذہبی آدمی بھی ان کی توجیہ دریافت نہیں کر پاتا۔ اسی وجہ سے عظیم عرب شاعر اور روشن خیال فلسفی ابو العلاء معرّی نے کہا تھا:

وقوم اتوا من اقاصی البلاد۔ لزمی الجمار ولثم الحجر

فوا عجبا من مقالا تهم ۔ ایعمی عن الحق کل تا بشر

(لوگ دور دراز علاقوں سے آتے ہیں تاکہ ایک پتھر (شیطان) کو کنکریاں ماریں اور ایک کالے پتھر (حجر اسود) کو بوسہ دیں۔ کیا عجیب قسم کے کلمات ادا کرتے ہیں، کیا تمام انسان سچ دیکھنے کے سلسلے میں نابینا ہیں)۔

شراب اور جوئے کی حرمت خالص اسلامی حکم ہے جو مدینہ میں صادر ہوا، اور اسے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اجتماعی ضرورت کی وجہ سے اسے جاری کیا گیا۔ مدینہ میں زکات کا نفاذ کارِ ثواب اور رضاکارانہ طور پر ادا کیے گئے صدقے کی صورت میں معیشت کا حصہ بنا تاکہ ایک نئی ریاست کے اخراجات پورے کیے جا سکیں۔

لیکن جس حکم کی نظیر کسی آسمانی یا انسانی ضابطے میں نہیں ملتی وہ جہاد کا حکم ہے جو پہلے اجازت کی صورت میں صادر ہوا: "اذن للمؤمنین القتال" لیکن بعد میں البقَرَة، الأنفَال، التّوبَة وغیرہ جیسی مدنی سورتوں کے ذریعے اس پر عمل کرنے کے لیے مختلف انداز میں زور دیا گیا۔

یہ امر قابل توجہ اور خاصا اہم ہے کہ مکّی سورتوں میں جہاد یا کفار سے جنگ کرنے کے متعلق بالکل بھی ذکر نہیں ہے۔ لیکن مدنی سورتوں میں جہاد اور جنگ سے متعلقہ آیات اس قدر فراوانی سے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ اس قدر احکام اور تاکید دوسرے کسی بھی امر کے متعلق نہیں ہے، جس سے ذہن میں دو باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی کہ ہمیں یہاں محمد کی بصیرت نظر آتی ہے کہ اُنھوں نے عربی ذہن اور

طور طریقوں کو مد نظر رکھا کہ ایک اسلامی ریاست کا قیام تلوار کو استعمال کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ رویہ عربوں کی فطرت اور عادات کا حصہ تھا اور اسی کے نتیجے میں ایک اجتماعی معاشرہ تشکیل پایا۔ دوسری بات ذہن میں آتی ہے کہ اس ہدف کے حصول کے لیے لوگوں کے سوچنے اور عقیدے کی آزادی کا حق جو انسان کا سب سے اہم حق ہے، اُسے پائمال کیا گیا۔ جس کے متعلق کئی مفکرین نے اعتراض کیے ہیں جن کی توجیہ میں دلیل لانا آسان نہیں ہے۔

کیا تلوار کے زور پر لوگوں کو عقیدہ یا دین قبول کرنے پر مجبور کرنے کو ایک پسندیدہ فعل اور انسانیت و عدل کے اصولوں سے ہم آہنگ قرار دیا جا سکتا ہے؟۔ گو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مختلف انسانی معاشروں میں کم و بیش ہر زمانے اور ہر جگہ ظلم و ناانصافی موجود رہی ہے۔ لیکن اہل فکر کی نظر میں کوئی بھی جبر اس سے زیادہ مہلک، غیر منطقی اور غیر انسانی نہیں ہے کہ حاکم یا نظام حکومت لوگوں کی فکری اور عقیدہ رکھنے کی آزادی کے حق کا قائل نہ ہو۔ بادشاہ یا فرمانروا یا حکومت اپنے مخالفین کو ختم کر سکتی ہے کہ یہ اُن کے نزدیک جہد البقاء کی ایک صورت ہے۔ اگرچہ یہ رویہ انسانیت کے اصولوں کے منافی ہے۔ لیکن پھر بھی لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ جیسے اُن کی سوچیں ہیں دوسرے بھی اُنھی کے ذوق و مشرب کی تقلید کریں، اس عمل کو نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی جواز پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاہم پوری تاریخ میں اور ہر قوم کے ہاں انسانی حقوق پر ایسا ہی ڈاکہ ڈالا گیا ہے۔ انسانی حقوق کی ایسی بے حرمتی ایک عام سی بات ہے۔ حتیٰ کہ عام لوگ بھی ایسے ہی رویوں کے حامل ہیں۔ اُن کے ہاں بھی وہی استبدادی رویہ، وہی خود غرضی اور بدی پر اڑ جانے کے ویسے ہی رویے پائے جاتے ہیں اور وہ اپنے عقائد سے متصادم عقائد و فکر سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ یوں اس امر سے انسانی تاریخ کے اندر سیاہ اور تاریک صفحات کھلے ہیں کہ انسانوں کو قتل کیا گیا، جلایا گیا اور تاریک زندان خانوں میں پھینکا گیا، اُن کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے، اُنھیں پھانسی پر لٹکایا گیا اور قتل عام ہوا۔ اسی قسم کے واقعات ہمیں اپنے زمانے

اور بیسویں صدی میں بھی ملتے ہیں۔ نازی، فاشسٹ اور کمیونسٹ معاشروں کے خونیں واقعات اس کی واضح مثالیں ہیں۔

آزادی فکر و عقیدہ کی بے حرمتی پوری دنیا اور تمام اقوام کے ہاں واقع ہوئی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ایک ایسا انسان جس نے کندھوں پر ہدایت کا پرچم اٹھایا ہوا تھا اور ایک جگہ اُس نے فرمایا تھا: "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" (دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے: البقرۃ۔256) اور ایک اور جگہ پر کافروں سے کہا تھا: "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (تمھارا دین تمھارے لئے اور میرا دین میرے لئے ہے: الکافِرون۔6) اور یہ بھی فرمایا تھا: "لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ" (جو ہلاک ہو ثبوت سے ہلاک ہو اور جو جیے ثبوت سے: الأنفَال۔42) جسے خدا نے "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (الأنبیاء۔107) کا لقب دیا اور وہ "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو: القَلَم۔4) قرار پایا، کیا ایسی روش ایسے انسان کے لیے جائز تھی؟۔ یہ وہی آدمی ہے جو مکّہ میں اپنی ایمان کی حرارت سے گرم آواز میں ابو الاشد[114] کے دکھاوے کو رد کرتے ہوئے سورت البَلَد کی آیات 4 تا 18 میں فرماتا تھا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ۔ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ۔ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ۔ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ۔ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ۔ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ۔

114: کہتے ہیں ابو الاشد ایک جسیم، طاقتور اور امیر آدمی تھا۔ عکاظ کے میلے میں آتا اور ایک قالین پر کھڑا ہو کر کہتا کہ جو کوئی میرے پاؤں کے نیچے سے قالین کھینچ نکالے میں اسے بہت زیادہ انعام دوں گا۔ بہت زیادہ جوان آتے اور قالین کو کھینچے۔ قالین ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا مگر ابو الاشد اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا

یہ خوش آہنگ آیات جو محمد کی قوت خطابت کا نمونہ ہیں، ان کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک طاقتور اور جسیم آدمی جو اپنی طاقت اور دولت کو محمد، اسلام اور اُن کی روحانیت سے برتر سمجھتا تھا، کے متعلق فرمایا گیا ہے:

(بے شک ہم نے انسان کو مصیبت میں پیدا کیا ہے کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی بھی ہر گز قابو نہ پا سکے گا کہتا ہے کہ میں نے مال برباد کر ڈالا کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور زبان اور دو ہونٹ اور ہم نے اسے دونوں راستے دکھائے پس وہ (دین کی) گھاٹی میں سے نہ ہو کر نکلا اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے کسی بندے کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں کھلانا کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک نشین مسکین کو پھر وہ ان میں سے ہو جو ایمان لائے اور اُنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور رحم کرنے کی وصیت کی یہی لوگ دائیں والے ہیں)۔

وہ آدمی جو مکّہ میں پُرجوش لہجے اور روحانیت سے سرشار انداز میں باتیں کیا کرتا تھا، مدینہ آمد کے بعد اُس نے بتدریج اپنی روش تبدیل کی:

”کُتِبَ عَلَیکُمُ القِتالُ“ (تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے: البَقَرَۃ۔216)۔

”قاتِلُوا الّذینَ لایُؤمِنُونَ“ (لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے: التّوبَۃ۔29)۔

وَمَن یَبتَغِ غَیرَ الاِسلامِ دیناً فَلَن یُقبَلَ مِنہُ

(اور جو کوئی اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے تو وہ اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا: آل عِمرَان 85۔)

فَإِذا لَقیتُمُ الّذینَ کَفَروا فَضَربَ الرِّقابِ حَتّیٰ إِذا أَثخَنتُموھُم فَشُدُّوا الوَثاقَ

(پس جب اِن کافروں سے تمہاری مڈ بھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم اُن کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو کہ فرار نہ ہونے پائیں: محمّد۔4)۔

اس قبیل کی درجنوں بلکہ اس سے بھی زیادہ متشدد آیات مدینہ میں نازل ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ لوہا جس کے خواص ابھی تک معلوم نہیں تھے، کے متعلق مدینہ میں یوں فرمایا جاتا ہے:

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ

(اور ہم نے لوہا بھی اتارا جس میں سخت جنگ کے سامان اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے: الحدید۔25)۔

گویا مکّہ میں لوہا موجود نہ تھا۔ یا ازلی شان والے علیم و حکیم خدا کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی تھی کہ اپنے اور رسول کے دشمنوں کو پہچانے۔ چنانچہ وہاں مکّہ میں پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا تھا:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

(لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ۔ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔ بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے اور ہدایت یافتہ کو بھی خوب جانتا ہے: النّحل۔125)

یوں اسلام آہستہ آہستہ ایک روحانی دعوت سے جنگجویانہ اور انتقام گیری کی شکل اختیار کر گیا جس کی نشوو نما دوسرے قبائل پر ناگہانی حملوں اور مالی امور مال غنیمت اور زکات پر استوار ہوئے۔

ہجرت کے دس سالہ دور میں قیدیوں کا قتل یا سیاسی وجوہات کی وجہ سے کیے گئے زیادہ تر قتل حضرت محمد کے حکم پر ہوئے، جس پر غیر لوگ کافی اعتراض کرتے ہیں، اُنھی سے ہی ایک دینی ریاست تشکیل اور

استوار ہوئی۔ بدر کی جنگ کے نتیجے میں جب مسلمانوں کے ہاتھ قیدی لگے تو پیغمبر فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کیا ان سے فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے اور وہ پیسہ مجاہدین میں بانٹ دیا جائے یا انہیں غلام بنالیا جائے اور قید خانے میں ڈال دیا جائے؟۔

عمر جنھیں اسلام اور اسلامی ریاست کے بانیوں میں سے ایک کہا جا سکتا ہے، ایک حقیقت پسند اور زیرک انسان تھے، انہوں نے دور اندیشی اور بصیرت سے صورت حال کا جائزہ لیا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ نیز قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دینا مصلحت کے خلاف ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ واپس جا کر پھر دشمنوں سے مل جائیں گے اور اگلی بار پہلے سے زیادہ بغض کے ساتھ جنگ میں حصہ لیں گے۔ اور اگر انہیں غلام بنایا گیا یا قید میں ڈالا گیا تو اس سے ایک تو خرچہ زیادہ آئے گا اور دوسرا اِن کے فرار اور دشمنوں سے مل جانے کا خدشہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ اور اگر اِنھیں قتل کر دیا جائے تو اس سے دوسرے قبائل پر رعب پڑنے کے علاوہ اسلام کی شان و شوکت میں اضافہ ہو گا۔ اسی مناسبت سے سورت الأنفال کی آیت 67 نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ

(پیغمبر کو شایان نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک زمین میں کثرت سے ان کا خون نہ بہائے تم لوگ دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے)۔

دو قیدیوں کا قتل

بدر کے قیدیوں میں عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث بھی شامل تھے۔ اُن کو دیکھتے ہی پیغمبر کو اُن کی مکّہ میں شرارتیں اور مخالفت یاد آئی اور آپ نے حکم دیا کہ ان کی گردن مار دی جائے۔ نضر مقداد کا قیدی تھا اور مقداد کو اس سے فدیہ حاصل کرنے کا لالچ تھا۔ اُس نے پیغمبر سے کہا: "یہ میرا قیدی ہے

اس لیے مال غنیمت کے حصے کے طور پر اس پر میرا حق ہے"۔ تو پیغمبر نے فرمایا، تم بھول چکے ہو کہ اس پلید انسان نے قرآن کے متعلق کہا تھا:

قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ

(ہاں سُن لیا ہم نے، ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں، یہ تو وہی پُرانی کہانیاں ہیں جو پہلے سے لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں: الأنفَال۔ 31)

اس معمولی جملے کے نتیجے میں اُس کا قتل جائز ٹھہرا اور وہ موت کے حوالے ہوا۔ مقداد نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا اور نضر کی گردن مار دی گئی۔ اگلے پڑاؤ پر عقبہ کو حاضر کیا گیا اور عاصم بن ثابت کو اُسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو عقبہ وحشت سے چلایا: "میرے بچوں کا کیا بنے گا"۔ حضور نے فرمایا: "النار، یعنی آگ"۔

فتح مکّہ کے موقع پر عام معافی کا حکم صادر ہوا تھا لیکن پیغمبر نے چند لوگوں کو اس معافی سے مستثنیٰ قرار دیا اور حکم فرمایا کہ وہ جہاں بھی ملیں قتل کر دیئے جائیں خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ چمٹے ہوئے کیوں نہ ہوں (یعنی کعبہ میں عبادت کر رہے ہیں)۔

صفوان بنی امیہ، عبد اللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، عکرمہ بن ابو جہل، حویرث بن نقید بن وہب اور چھٹے کا نام عبد اللہ بن سعد بن السرح تھا جو مدینہ میں کچھ عرصہ کاتب وحی رہ چکا تھا اور پیغمبر کی اجازت سے وحی کے آخری الفاظ کو تبدیل کر دیتا تھا۔ مثلاً پیغمبر نے کہا تھا: "وَاللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ"، اُس نے کہا کہ اگر میں یوں لکھوں تو کیسا ہے: "وَاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ"۔ پیغمبر نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اسی قسم کی تبدیلیاں کئی بار ہوئیں جس کے نتیجے میں عبد اللہ اسلام سے برگشتہ ہو گیا۔ اس کے لیے اُس کے پاس دلیل تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کی وحی میری تجویز کی وجہ سے تبدیل ہو جائے۔ وہ مدینہ چھوڑ کر قریش کے پاس واپس پلٹ گیا اور اسلام ترک کر دیا۔

عبد اللہ بن خطل کے پاس دو لونڈیاں تھیں، فرتنا اور قریبہ۔ یہ دونوں پیغمبر کی ہجو لکھتی اور گاتی تھیں۔ چنانچہ اپنے مالک سمیت قتل ہوئیں۔ اسی طرح دو اور عورتوں، ہند بنت عتبہ اور بنو عبد المطلب کے عمرو بن ہاشم کی آزاد کردہ لونڈی سارہ جو حضور کے مکّہ کے قیام کے دوران اُنھیں بہت زیادہ اشتعال دلاتی تھیں، کے قتل کا بھی حکم صادر ہوا۔ لیکن ہند بنت عتبہ نے جو ابو سفیان کی بیوی تھی، بیعت کر لی اور معاف کر دی گئی۔

عبد اللہ بن سعد بن السرح عثمان بن عفان کا رضاعی بھائی تھا، لہٰذا اُن کے ہاں پناہ لی۔ عثمان نے اُسے چند روز تک چھپائے رکھا اور جب جوش و خروش میں کچھ کمی ہوئی تو اُسے لے کر پیغمبر کے پاس لائے اور عبد اللہ کو معاف کرنے کی استدعا کی۔ پیغمبر نے کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا "نَعَم" یعنی بہت ناگواری سے عثمان کی سفارش قبول کی۔ عبد اللہ نے اسلام قبول کیا اور عثمان کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ اُن کے چلے جانے کے بعد حضور سے اُن کے کافی دیر تک خاموش رہنے کی وجہ پوچھی گئی تو اُنھوں نے جواب دیا: اُس کا اسلام مجبوری اور ڈر کی وجہ سے تھا، اسی لیے میں اُسے قبول کرنے سے بے اعتنائی برت رہا تھا۔ اور انتظار کر رہا تھا کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور اُس کی گردن مار دے۔ کیوں کہ اسے پہلے ہی "مھدورالدّم" قرار دیتے ہوئے حکم دیا گیا تھا، کہ وہ جہاں بھی ملے اُسے قتل کر دیا جائے، خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ چمٹا ہوا کیوں نہ ہو۔

ایک انصاری نے کہا: آپ نے ہمیں آنکھ سے اشارہ کیوں نہیں کیا؟۔ حضور نے فرمایا کہ ایک نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اُس کی آنکھ خیانت کی مرتکب ہو۔ یعنی بظاہر خاموشی اختیار کرے اور آنکھ سے قتل کا حکم دے[115]۔ یہی شخص خلیفہ عثمان کے زمانے میں شمالی افریقہ کو فتح کرنے والے لشکر کا سپہ سالار مقرر

115: سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے سوا سب کو امان دے دی، اُنھوں نے ان کا اور ابن سرح کا نام لیا، ابن سرح عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس چھپ گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ہوا، اور اس خوبی سے اپنی ذمہ داری نبھائی کہ اس وجہ سے عثمان نے عمرو بن العاص کو مصر گورنری سے معزول کر کے عبد اللہ کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔

سیاسی قتل

کعب بن اشرف[116] کا تعلق بنو نضیر نامی یہودی قبیلے سے تھا۔ جنگ بدر کے بعد پیغمبر کی طاقت اور اثر و نفوذ بڑھنے سے بہت فکر مند ہوا۔ چنانچہ مکّہ گیا اور قریش سے ہمدردی کرنے کے علاوہ اُنھیں جنگ کرنے پر اکسایا، اور مدینہ واپس آنے کے بعد مسلمان عورتوں کے متعلق عشقیہ گانے لکھنے لگا۔ اس سے پیغمبر کو جواز مل گیا اور اُنھوں نے فرمایا: کعب بن اشرف کا کام کون تمام کرے گا؟۔ محمد بن مسلمہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا: اُس کا کام میں تمام کروں گا۔ حضور نے فرمایا کہ اگر کر سکتے ہو تو کرو۔ قبیلہ اوس کے پانچ لوگ اُس کے ہمراہ کر دیئے گئے جن میں ابو نائلہ بھی شامل تھا جو کعب کا رضاعی بھائی تھا۔ یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ گھر سے باہر نکلتے وقت کعب کو شک نہ گزرے۔ اس کے بعد محمد اُن کو دور تک چھوڑنے آئے اور اُنھیں رخصت کرتے وقت اُن کی کامیابی کی دعا بھی کی۔

جب لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا تو عثمان نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کھڑا کیا، اور کہا: اللہ کے نبی! عبد اللہ سے بیعت لیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر اٹھایا اور اس کی جانب دیکھا، تین بار ایسا ہی کیا، ہر بار آپ انکار کرتے رہے، تین بار کے بعد پھر اس سے بیعت لے لی، پھر صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”کیا تم میں کوئی بھی عقلمند آدمی نہیں تھا کہ جس وقت میں نے اپنا ہاتھ اس کی بیعت سے روک رکھا تھا، اٹھتا اور اسے قتل کر دیتا؟“ لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہمیں آپ کے دل کا حال نہیں معلوم تھا، آپ نے ہمیں آنکھ سے اشارہ کیوں نہیں کر دیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی نبی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ کنکھیوں سے اشارے کرے۔ (سنن نسائی، کتاب الجہا)د۔

116: کعب بن اشرف کا باپ بنو طے اور ماں بنو نضیر سے تھی۔ بنو نضیر کے شرفا میں شمار ہوتا تھا۔ دولت مند ہونے کے علاوہ باکمال شاعر بھی تھا۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کی فتح سے بہت فکر مند ہوا۔ مکّہ گیا اور بدر میں مرنے والے مشرکین کا بہت دردناک مرثیہ لکھا۔ اہل مکّہ کو شکست کا بدلہ لینے پر اکسایا۔

پانچوں لوگ رات کے وقت کعب کے گھر کی طرف چل پڑے۔ فطری بات ہے کہ ابونائلہ کی وجہ سے کعب کسی بدگمانی کا شکار نہ ہوا، اور گھر سے باہر آ گیا۔ اور ان کی چکنی چپڑی باتوں میں مصروف جب گھر سے کافی دور نکل آیا، تو سب نے مل کر اُسے قتل کر دیا۔ جب وہ یہ سب کچھ کر کے واپس آئے، تو حضور خوشخبری سننے کے انتظار میں ابھی تک بیدار تھے۔

سلام بن ابی الحقیق (ابو رافع) قبیلہ اوس کا دوست اور خیبر میں مقیم تھا۔ قبیلہ خزرج کے چند لوگوں نے پیغمبر سے اجازت چاہی کہ سلام بن ابی الحقیق جو یہودی سرداروں میں سے تھا اور قبیلہ اوس سے دوستی کا معاہدہ کر رکھا تھا، کو قتل کر دیں۔ پیغمبر نے اجازت دے دی اور عبد اللہ بن عتیک کو اُن کی راہنمائی کے لیے مامور کیا۔ عبد اللہ بن عتیک نے اُن کی راہنمائی کرنے کے علاوہ سلام بن ابی الحقیق کو قتل کر دیا اور جب وہ واپس آئے کہ پیغمبر کو خبر دیں تو خوشی سے نعرہ لگایا ''اللہ أکبر''۔

کعب اور سلام کے قتل کے بعد عبد اللہ بن رواحہ کو یسیر بن زرام کے قتل پر مامور کیا گیا۔ یسیر بن زرام خیبر میں مقیم تھا اور قبیلہ بنو غطفان کو محمد سے جنگ کرنے پر آمادہ کرتا تھا۔

قبیلہ ہذیل کا سردار خالد بن سفیان ہذلی اپنے لوگوں کو نخلہ کے مقام پر محمد کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ اُس کا کام تمام کرنے کے لیے عبد اللہ بن اُنَیس کو حکم جاری ہوا، جس کو اُس نے کامیابی سے نبھایا۔

قبیلہ قیس کا رفاعہ بن قیس اپنے لوگوں کو محمد کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ حضور نے اُس کا سر لانے کے لیے عبد اللہ بن حدرد کو مأمور کیا اور اُس نے ایسے ہی کیا۔ وہ پہلے گھات لگا کر بیٹھا رہا اور ایک کلہاڑے سے اُسے مار گرایا۔ پھر اُس کا سر کاٹا اور حضور کے پاس لے آیا۔

عمرو بن امیہ ضمری[117] ابو سفیان کے قتل پر مأمور ہوا، لیکن ابو سفیان کو بھنک پڑ گئی اور وہ بچ نکلا۔ ناکام ہو جانے کے بعد عمرو جب مدینہ کی جانب واپس لوٹا تو راستے میں ایک بے گناہ قریشی اور ایک دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔

جب حضور نے حارث بن سوید بن صامت کو قتل کروایا، تو ایک سو بیس سالہ ابو عفک[118] نامی یہودی شاعر نے اس فعل کی مذمت میں حضور کی ہجو لکھی۔ حضور نے صحابیوں سے پوچھا: " کون ہے جو اس خبیث کی خبر لے گا؟"۔

117: عمرو بن امیہ ضمری سے روایت ہے کہ خبیب اور اُس کے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے حضور نے مجھے اور ایک انصاری کو مکہ بھیجا کہ تم جا کر ابو سفیان کو قتل کرو۔ ہم خانہ کعبہ آئے، سات بار طواف کیا اور نماز پڑھی۔ کسی نے پہچان لیا اور چلا کر کہا۔ یہ عمرو بن امیہ ہے۔ عمرو بن امیہ زمانہ جاہلیت میں شیطان اور قاتل تھا۔ سب لوگ پکڑنے دوڑے کہ یہ کسی بری نیت سے آیا ہے۔ چنانچہ جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ عمرو اور اُس کا ساتھ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور پہاڑ کی غار میں چھپ گئے۔ دونوں غار میں تھے کہ وہاں عثمان بن مالک التیمی غار کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ عمرو نے ساتھی سے کہا کہ اگر عثمان نے ہمیں دیکھ لیا تو مکّہ والوں کو خبر کر دے گا۔ چنانچہ غار سے باہر نکل کر عثمان کو قتل کر دیا۔ دونوں پھر غار میں چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں بنو الدیل بن بکر کا ایک آدمی بکریاں چراتے آیا۔ اُس آدمی کے سوال پر عمرو نے بتایا کہ ان دونوں کا تعلق بھی بنو الدیل سے ہے۔ چرواہا وہیں لیٹ کر گانے لگا۔ ولست مادمت حیا۔ ولست ادین دین اسلام (جب تک زندگی ہے میں مسلمان نہیں ہوں گا اور نہ اب مسلمان ہوں)۔ "میں نے دل میں کہا، ابھی پتہ چل جائے گا۔ تھوڑی دیر میں وہ اعرابی سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ میں نے اس قدر بے دردی اور بے رحمی سے اُسے قتل کیا کہ اس سے قبل کبھی کسی کو ایسے قتل نہیں کیا تھا"۔ (تاریخ الرسل والملوک)۔

118: ابو عفک عمرو بن عوف کی شاخ بنو عبید سے تعلق رکھتا تھا۔ جب حضور نے اُس کے قتل کا حکم صادر فرمایا تو سالم بن عمیر نے کہا: "مجھ پر نذر ہے کہ یا تو میں عفک کو قتل کروں گا، یا اُس کے سامنے مر جاؤں گا"۔ سالم اس انتظار میں تھا کہ کب ابو عفک غافل ہو۔ گرمیوں کی ایک رات ابو عفک صحن میں سویا ہوا تھا۔ سالم کو خبر ہوئی تو اُس نے آ کر ابو عفک کے پیٹ پر تلوار رکھ کر اس زور سے دبائی کہ تلوار ابو عفک کے پیٹ سے اُس کے بستر میں گھس گئی۔

سالم بن عمیر بن عدی نے حضور کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اُس کو قتل کر دیا۔ اسی بوڑھے شاعر کے قتل سے متاثر ہو کر عصماء بنت مروان نے حضور کے خلاف اشعار لکھے اور قتل کی حقدار ٹھہری۔[119]

ابو عزہ الجمحی اور معاویہ بن مغیرہ جنگ بدر کے قیدیوں میں سے تھے لیکن اُنھیں امان مل گئی تھی اور وہ مدینہ میں رہنے لگے۔ جنگ احد کے بعد معاویہ کہیں غائب ہو گیا، تو ابو عزہ نے حضور سے درخواست کی کہ مجھے بخش دیا جائے یا آزاد کر دیا جائے۔ محمد نے ایک دم سے زبیر بن العوام کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دی جائے اور کسی کو معاویہ بن مغیرہ کا پیچھا کرنے بھیجا تاکہ اُسے واپس پکڑ کر لایا جائے اور اُسے قتل کیا جائے، چنانچہ دونوں احکام پر عمل ہوا۔

عبد اللہ بن ابی بن سلول خزرج کے سرداروں میں سے تھا جو ایمان لایا۔ حالات کی تبدیلی اور پیغمبر کے بڑھتے ہوئے معاشرتی و سیاسی اثر و رسوخ کو دیکھ کر بہت متفکر ہوا۔ حد یہ ہوئی کہ اُس میں ایمان اور خلوص نہ رہا۔ اسی وجہ سے منافقین کا سردار قرار پایا۔ اُس کی منافقت اور دوغلے پن سے حضور بھی واقف تھے۔ حتیٰ کہ عمر نے اُس کے قتل کا ارادہ کیا۔ لیکن سعد بن عبادہ نے پیغمبر سے کہا: "اُس کے سلسلے

119: ابو عفک کے قتل پر عصما بنت مروان نے اشعار لکھے۔ "مجھے گھن آتی ہے بنی مالک اور النابت سے۔ اور عوف و بنو خزرج سے۔ تم ایک اجنبی کی پیروی کرتے ہو جو تم میں سے نہیں ہے۔ جو مراد اور مذحج (دو یمنی قبائل) سے بھی نہیں۔ کیا تمہیں اُس سے اچھائی کی امید ہے؟ تمہارے سرداروں کے قتل کے بعد بھی؟۔ جو کسی ازلی بھوکے کی مانند کھانے پر ٹوٹ پڑنے کو ابھی تیار ہے۔ کیا کوئی غیرت مند نہیں بچا تم میں جو کسی غیر محفوظ لمحے کا فائدہ اٹھائے۔ اور گُل کر دے چراغ اُن کی امیدوں کا جو بیٹھے ہیں اُس سے فائدے کی توقع میں؟"۔ جب یہ اشعار حضور کے کانوں تک پہنچے تو حضور نے پوچھا: "کون ہے جو مروان کی بیٹی سے میرا پیچھا چھڑائے؟"۔ عمیر بن عدی نامی صحابی جن کی نظر بہت کمزور تھے اُنھوں نے اس کام کو سرانجام دینے کی حامی بھری۔ رات کے وقت عصماء کے گھر داخل ہوئے۔ وہ ایک ہی بستر پر اپنے بچوں کے درمیان سو رہی تھی۔ ایک بچہ اُس کے پستان سے دودھ چوس رہا تھا۔ عمر نے ٹٹولا اور بچے کو علیحدہ کیا اور اپنی تلوار عصماء کے پیٹ پر رکھ کر دبائی جو عصماء کے پیٹ سے پار ہو گئی۔ دوسری صبح نماز کے لیے آیا اور خبر دی تو حضور نے سب کو فرمایا: "تم ایسے شخص کو دیکھنا پسند کرتے ہو، جس نے اللہ اور اُس کے رسول کی غیبی مدد کی تو عمر بن عدی کو دیکھ لو"۔ عمر بن خطاب نے کہا: "اس اندھے کو دیکھو جس نے رات عبادت میں گزاری"۔ حضور نے فرمایا: "اسے نابینا نہ کہو یہ بینا ہے"۔ عصماء کے قتل سے اُس کے قبیلے والے سب لوگ ڈر گئے اور انہوں نے اسلام قبول کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ابن ہشام کے بقول "یہ پہلا دن تھا کہ بنو خطمہ میں اسلام کا ظہور ہوا کیونکہ انہوں نے اسلام کا غلبہ دیکھا"۔ بحوالہ طبقات ابن سعد۔ سیرت النبی ابن ہشام۔ الصارم المسلول علی شاتم الرسول۔

میں صبر سے کام لیں۔ خدا نے آپ کو اس لیے ہمارے پاس بھیجا ہے کہ ہم اُس کی حکم ران بننے کی خواہش سے نجات پائیں وگرنہ ہم اسے اپنا حکم ران تسلیم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے"۔

محمد حسین ہیکل اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "حضور ایک دن عمر سے کہہ رہے تھے کہ تمہاری رائے مانتے ہوئے اگر میں عبد اللہ کو قتل کروا دیتا تو اُس کا کوئی رشتہ دار اُس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کھڑا ہو جاتا لیکن اُس کے اطوار اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ اگر میں اب حکم دوں تو اُنھی رشتہ داروں میں سے کوئی اُسے قتل کر دے گا"۔ اور پھر اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں: "عبد اللہ کے اپنے بیٹے نے پیغمبر سے کہا، اگر آپ چاہتے ہیں تو میں اپنے باپ کو قتل کر دیتا ہوں، مجھے اس کا حکم دیں۔ کیونکہ اگر کسی دوسرے نے ایسا کیا تو عرب رسم و رواج کی وجہ سے میں مجبور ہوں گا کہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھوں"۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ

(پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقوں کے معاملہ میں دو گروہ ہو رہے ہیں اور اللہ نے ان کے کرتوتوں کے سبب اوندھا کر دیا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے اس کو رستے پر لے آؤ: النِّسَاء۔88)۔

سورت النِّسَاء کی آیت 88 کی شان نزول بیان کرتے ہوئے امام جلال الدین السیوطی کہتے ہیں: کہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر نے تنگ آ کر فرمایا۔ کون ہے جو مجھے اُس شخص کے شرّ سے نجات دلائے جو ہر وقت مجھے آزار دیتا ہے اور میرے مخالفین کو اپنے گھر جمع کرتا ہے؟ لیکن اس سلسلے میں اوس و خزرج دو حصوں میں بٹ گئے چنانچہ اسی وجہ سے عبد اللہ بن ابی قتل ہونے سے بچ گیا۔

ایسا ہی واقعہ ایک یہودی دوکاندار ابن سُنینہ کے ساتھ پیش آیا جس کا مسلمانوں کے ہاں آنا جانا تھا اور اُس کے مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایک روز پیغمبر نے حکم دیا کہ جو یہودی بھی تمہارے

ہاتھ لگے اسے قتل کر دو۔ محیصہ ابن مسعود اپنی جگہ سے اُٹھا اور جا کر بے گناہ ابن سُنینہ کو قتل کر دیا۔ اُس کا بھائی جو ابھی تک غیر مسلم تھا، اُس کے سوا کسی نے بھی اُسے اس فعل پر ملامت نہ کی۔[120]۔

جب رومیوں کے ساتھ جنگ (غزوہ تبوک) کرنے کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی تو حضور تک خبر پہنچی کہ کچھ لوگ شویلم نامی یہودی کے گھر جمع ہوئے ہیں اور جنگ کے خلاف مشورہ کر رہے ہیں۔ حضور نے طلحہ بن عبید اللہ کی سربراہی میں کچھ لوگوں کو وہاں بھیجا جنہوں نے اس گھر کا محاصرہ کرنے کے بعد اسے آگ لگا دی۔ ایک آدمی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوا لیکن اس کوشش میں اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی[121]۔ سورت التّوبَۃ کی آیت 81 اُنھی لوگوں کے بارے میں ہے جو گرمی کی وجہ سے اسی جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے۔

وَقَالُوا لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا

(اور کہا گرمی میں مت نکلو کہہ دو کہ دوزخ کی آگ کہیں زیادہ گرم ہے)۔

120: رسول اللہ نے حکم دیا کہ جس یہودی پر قابو پاؤ قتل کر دو۔ محیصہ بن مسعود نے یہودی سوداگر ابن سنینہ کو اچانک حملہ کر کے قتل کر دیا۔ حویصہ بن مسعود محیصہ سے عمر میں بڑا تھا۔ اور اب تک اسلام نہیں لایا تھا ابن سنینہ کے قتل کے بعد یہ محیصہ کو مارنے لگا اور کہنے لگا اے دشمن خدا تو نے اُسے قتل کر دیا۔ حالانکہ تو نے اُس کی بہت سی چربی کھائی ہے۔ محیصہ نے کہا: ”بخدا جس نے مجھے اُس کے قتل کا حکم دیا ہے اگر وہ مجھے تیرے قتل کا حکم دیں تو میں ابھی تمہاری گردن مار دوں گا۔ حویصہ نے کہا: ”واللہ، جس دین نے تجھے اس حالت کو پہنچایا ہے وہ یقیناً ایک عجیب چیز ہے“۔ پس حویصہ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ حوالہ سیرت النبی ابن ہشام، تاریخ الرسل والملوک محمد بن جریر الطبری

121: ابن ہشام روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ کو معلوم ہوا کہ چند منافق ”سویلم یہودی“ کے مقام پر جو جاسوم کے مقام پر واقع ہے، اجتماع کرتے ہیں اور غزوہ تبوک میں لوگوں کو شامل ہونے سے روکتے ہیں، چنانچہ رسول اللہ نے حضرت طلحہ کو چند صحابہ کے ساتھ اُن کی جانب بھیجا اور حکم دیا کہ سویلم کی رہائش گاہ کو رہائشیوں سمیت جلا دیں۔ چنانچہ طلحہ نے یہ کام انجام دیا اور ضحاک بن خلیفہ گھر کی پشت سے کود پڑا اور اُس کا پاؤں ٹوٹ گیا اور اُس کے ساتھی بھی کود کر بھاگ گئے۔ (البدایہ والنہایہ۔ حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر)۔

نبوت اور امارت

اگر کوئی محمد کو ایک پیغمبرانہ روپ میں دیکھنا چاہتا ہے تو اُسے لازم ہے کہ مّکی سورتیں خصوصی طور پر سورت المؤمنون اور سورت النّجْم وغیرہ کا مطالعہ کرے۔ جن کی آیات سے عیسیٰ جیسی روحانیت بھری شعاعیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

اس کے برعکس اگر کوئی محمد کو کسی ریاست یا حکومت کی مسند پر بیٹھے قانون ساز کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے تو اُسے مدنی سورتوں جیسے البقَرَة، النِّسَاء، محَمَّد اور خصوصی طور پر التّوبَة سے رجوع کرنا ہو گا۔

ہجرت کے تین چار سالوں بعد، جب یثرب سے یہودیوں کا صفایا کر دیا گیا اور قبیلہ بنو مصطلق کو بھی مغلوب کر لیا گیا تو محمد کے احکام اور انداز سے حاکمیت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

ابن ہشام کی سیرت النبی میں درج ہے کہ حیی بن اخطب کی بیٹی نے خواب دیکھا کہ اُس کی گود میں چاند اُتر آیا ہے جو اُس نے اپنے شوہر کو سنایا۔ شوہر کو سخت غصہ آیا اور اس نے بیوی کو اس زور سے تھپڑ مارا کہ بیوی کی آنکھ کو نقصان پہنچا۔ شوہر نے ڈانٹ کر کہا: ”تو حجاز کے بادشاہ کی بیوی بننا چاہتی ہے؟“۔ خیبر کی فتح کے بعد یہ عورت پیغمبر کے حرم کا حصہ بنی۔

ایک روایت ہے بنو قینقاع سے تعلق رکھنے والے عبداللہ بن سلام نامی ایک معتبر یہودی نے جب اسلام قبول کیا تو یہودیوں نے اُسے کہا۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ نبوت بنی اسرائیل میں ہے، عربوں میں نہیں۔ تمھارا نیا آقا پیغمبر نہیں بلکہ بادشاہ ہے۔

جب ابوسفیان کو مجبوری کے عالم میں اسلام قبول کرنا پڑا تھا تو اُس نے عباس بن عبدالمطلب سے کہا: تمہارے بھتیجے کے پاس بہت بڑی مملکت ہے۔ عباس نے اُسے جواب دیا: یہ نبوت کی قلمرو ہے۔

عمر بن خطاب اسلام کی معزز اور معتبر شخصیات میں سے ہونے کے علاوہ حضور کے لیے بہت قابل اعتماد اور محترم تھے۔ یہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق اسلام کے ابتدائی سالوں میں پیغمبر کی یہ آرزو تھی کہ یہ اسلام قبول کریں۔ اور اس کی وجہ اُن کا خلوص، شجاعت اور معاملہ فہمی کی قوت تھی۔ عمر صلح حدیبیہ کے معاہدے سے بہت مایوس ہوئے اور اسے مسلمانوں کی شکست سے تعبیر کیا کیونکہ قریش نے اپنی تمام شرائط محمد سے منوائی تھیں۔ عمر نے اس بحث میں اس قدر درشتی کا مظاہرہ کیا تھا کہ پیغمبر ناراض ہوئے اور اُنھوں نے غصے سے کہا: ”ثکلتک امک“ (تمھاری ماں تمھارے ماتم پر بیٹھے)۔ پیغمبر کا غصہ دیکھ کر عمر ایک دم سے خاموش ہو گئے۔

محمد جنھوں نے صلح حدیبیہ کے لیے دستخط کیے تھے یہ وہ محمد نہیں تھے جو بارہ سال پہلے عمر اور حمزہ جیسے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کا آرزومند تھے۔

اس محمد نے مکّہ سے اپنی ناکام واپسی اور قریش کی تمام شرائط قبول کر لینے کو سورت الفتح کی پہلی آیت ” اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا “ (بے شک ہم نے تمھیں واضح فتح دی) کے نزول سے ایک شاندار فتح قرار دیا ۔ اور اس دعوے کو سب نے تسلیم کر لیا، حتیٰ کہ ابو بکر نے وقار اور سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عمر کو قائل کیا، اور اُن کے غصے اور مایوسی کو ختم کیا۔

صلح حدیبیہ ایک قسم کی پسپائی تھی، جس سے عمر ناراض ہوئے تھے۔ لیکن وہیں یہ صلح حضور کے سیاسی تدبّر کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے یہ شرائط اس لیے قبول کی ہوں گی کہ اُنھیں اس بات کے متعلق یقین نہیں تھا کہ اگر جنگ شروع ہو گئی تو مسلمان قریش کو شکست دے پائیں گے۔ اُن کے نزدیک ایک مشکوک جنگ سے امن اور خطرے سے پاک مصالحت بہتر تھی۔ کیونکہ اگر مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو دوسرے عرب قبائل جو مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے رسوخ سے خائف تھے، قریش کے غالب آجانے کی صورت میں اُن کے ساتھ دوستی کر لیتے۔ زخم خوردہ یہودی بھی قریش

کے ساتھ الحاق کر لیتے۔ یوں محمد کے مشن اور اُن کے ساتھیوں کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ شائد یہ تمام خرد مندانہ سوچیں ایک ایسے شخص کے ذہن میں ضرور پیدا ہوئی ہوں گی جو جنگ کی بجائے ایک ریاست کی تشکیل کو وقت کی ضرورت سمجھ رہا تھا۔ اُس نے اِس امید پر قریش کے تمام شرائط منظور کر لیں کہ اگلے سال تک اُس کی شان و شوکت میں اور اضافہ ہو چکا ہو گا اور کسی قسم کے سر درد یا شکست کے خوف کے بغیر وہ اور اس کے ساتھی حج کریں گے۔

صلح حدیبیہ کے بعد کے شجاعانہ اقدامات شائد میری اس رائے اور مفروضے اور محمد کے سیاسی تدبّر کی تائید کرتے ہیں۔ اگر قریش کے ساتھ تنازعہ ایک مشکوک امر تھا، تو خیبر پر حملے کی صورت مختلف تھی۔ قریش کے ساتھ جنگ کے سلسلے میں مہاجرین اپنی رشتہ داریوں یا تعلقات کی وجہ سے شائد تساہل یا کوتاہی سے کام لیتے لیکن یہودیوں کے آخری ٹھکانے پر حملے میں ایسا کچھ نہیں تھا، خصوصاً جب وہاں سے بہت زیادہ مال غنیمت ملنے کا بھی وعدہ کیا جا چکا ہو:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔۔۔ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا۔ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ

(بے شک اللہ مسلمانوں سے راضی ہوا جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے پھر اس نے جان لیا جو کچھ اُن کے دلوں میں تھا۔۔۔ اور اُنھیں جلد ہی فتح دے دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی دے گا جنھیں وہ لیں گے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جنھیں تم حاصل کرو گے پھر تمھیں اس نے یہ جلدی دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے: الفتح۔ 18 تا 20)۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد وہ تیزی سے مدینہ لوٹے اور خیبر پر حملے کی تیاری کی خاطر مدینہ میں پندرہ دن سے زیادہ نہیں رہے۔ کیونکہ اُنھیں ڈر تھا کہ صلح حدیبیہ کے بارے میں مسلمانوں کا اختلاف رائے کسی تنازعے کو جنم دینے کا باعث نہ بن جائے۔ اُنھیں پتہ تھا کہ خیبر میں مسلمان مالِ غنیمت کے حصول میں اس قدر مشغول رہیں گے کہ اُنھیں حدیبیہ کے مقام کی پسپائی کا دُکھ نہیں ستائے گا۔

سورت الفتح کی آیت پندرہ میں واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ خیبر کے مال و دولت کے حصول کی امید اور لالچ نے بدوؤں کے دل میں اس قدر شوق اور ہیجان برپا کر دیا کہ وہ جو قریش سے جنگ کرنے میں لیت و لعل سے کام لے رہے تھے وہ بھی مسلمانوں کے خیبر پر حملے میں ساتھ دینا چاہ رہے تھے:

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ۔ (جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلو گے تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ آپ کے ساتھ چلیں)۔

اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ پیغمبر سے فرماتے ہیں:

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا

(ان پیچھے رہ جانے والے بدوؤں سے کہہ دو کہ بہت جلد تمھیں ایک سخت جنگجو قوم سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا کہ ان سے لڑو یا وہ اطاعت قبول کر لے گیں پھر اگر تم نے حکم مان لیا تو اللہ تمھیں بہت ہی اچھا انعام دے گا اور اگر تم پھر گئے جیسا کہ پہلے پھر گئے تھے تو تمھیں سخت عذاب دے گا)

خیبر چند قلعوں پر مشتمل تھا۔ مسلمانوں نے پہلے سلام بن مشکم کے قلعے پر حملہ کیا جس پر قبضہ کرنے میں اُن کے پچاس لوگ مارے گئے۔ ابو بکر نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قلعہ ناعم پر حملہ کیا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اس کے بعد عمر نے حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ آخر میں علی بن ابو طالب اس دروازے کو کھولنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد زبیر کے قلعے میں پانی کی سپلائی روک دی گئی، جس

سے مجبور ہو کر اہل قلعہ باہر نکل آئے لیکن شکست کھائی۔ اس کے بعد چند قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہوئے۔ تا آنکہ مسلمان السلالم اور الوطیح نامی قلعے میں پہنچے جہاں بچے اور عورتیں جمع تھیں۔

یہودیوں نے مجبور ہو کر امان کی درخواست کی جو حضور نے منظور کرلی۔ اُن کی جان اس شرط پر بخش دی گئی کہ ان کی زمینیں اور مزارع مسلمانوں کی ملکیت ہوں گے۔ اگرچہ یہ یہودیوں کے تصرف میں رہیں گے لیکن ان کی آمدن کا نصف مسلمانوں کو ادا کرنا ہوگا۔

جو مال غنیمت حضور کے حصے میں آیا اُس میں حیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی تھی (وہی جس نے خواب دیکھا تھا کہ چاند اُس کے دامن میں اتر آیا تھا اور اُس نے اپنے شوہر کنانہ بن ربیعہ کو سنانے کے بعد اُس سے تھپڑ کھایا تھا) جس سے مدینہ واپسی کے سفر میں آپ نے صحبت کی تھی[122]۔

فدک والوں نے خیبر سے درس عبرت حاصل کیا، اور بغیر لڑے ہی شکست قبول کرلی۔ اور اپنی آدھی جائیداد رسول اللہ کے نام کردی کیونکہ جو مال غنیمت بغیر لڑے ہاتھ لگے، وہ رسول اللہ کی ملکیت ٹھہرایا گیا تھا۔

اسی طرح وادی القریٰ اور تیماء میں مقیم یہودی قبائل نے بھی لڑے بغیر شکست قبول کی، اور جزیہ ادا کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ یوں شمالی حجاز پر محمد کا اقتدار قائم ہوگیا۔

122: اُس رات حضرت انس بن مالک کی والدہ اُم سلیم نے حضرت صفیہ کو سنوارا۔ وہ رات اُنھوں نے حضور کے خیمے میں بسر کی۔ ابو ایوب خالد بن زید نے پوری رات ہاتھ میں تلوار لے کر گزاری اور صبح تک حضور کے خیمے کے گرد چکر لگاتے ہوئے پہرہ دیا۔ صبح جب حضور جاگے تو اس حرکت کی وجہ دریافت کی۔ اُنھوں نے جواب دیا: "مجھے آپ کی سلامتی کا ڈر تھا کیونکہ آپ نے اُس کا باپ، خاوند اور دوسرے عزیز و اقارب کو قتل کروایا ہے اور ابھی تک اُس نے اسلام بھی قبول نہیں کیا، مجھے آپ کی جان کا خطرہ تھا۔ حضور نے دعا کی، اے اللہ! جس طرح رات بھر ابو ایوب نے میری حفاظت کی ہے اُسی طرح تو بھی اُس کی حفاظت فرما۔ (سیرت النبی، ابن ہشام)۔

یہاں اس بات کا اضافہ کرنا ضروری ہے کہ خیبر پر حملے سے پہلے محمد نے انتہائی تدبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنو غطفان کو اس شرط پر اپنے ساتھ ملا لیا تھا کہ خیبر سے حاصل شدہ مال غنیمت کا نصف بنو غطفان کو دیا جائے گا۔ اگر ایسے نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ بنو غطفان یہودیوں کی مدد کو آ پہنچتے اور یوں مسلمانوں کو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا۔ اس واقعے اور اس جیسے دیگر واقعات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد محمد نے تبلیغ نہیں کی بلکہ تدبیر وسیاست پر کمر بند رہے۔

غزوات کا عمومی انداز کسی کو غفلت کی حالت میں پا کر ناگہانی حملہ ہوا کرتا تھا۔ اس قدم کو اٹھانے سے پہلے اکثر اوقات کسی جاسوس کو خبر لانے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اسی انداز سے قریش کے کئی قافلوں کا پتہ چلا کر اُن پر حملے کیے گئے۔ ان اقدام کو اٹھانے سے دو مقاصد کا حصول ہوتا تھا۔ جہاں اس سے مخالف کو مالی نقصان پہنچتا تھا، وہیں اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بہت زیادہ مال غنیمت حاصل ہوتا تھا۔ اگر جنگ احد کی حکمت عملی پر صحیح طور سے عمل کیا جاتا، اگر چڑھائی پر موجود محافظین مال غنیمت کے لالچ میں اپنی جگہ نہ چھوڑتے اور مال غنیمت کو لوٹنے میں مصروف نہ ہو جاتے تو مسلمانوں کو اس قدر بری شکست کا سامنا نہ ہوتا۔ جنگ خندق کے وقت جب مدینہ کا محاصرہ کر لیا گیا تھا، تو مسلمانوں پر بہت مشکل وقت آن پڑا تھا۔ کیونکہ ہر لمحے یہ خدشہ موجود تھا کہ بنو قریظہ کہیں مکّہ کے حملہ آوروں کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو بلاشبہ مسلمانوں کی شکست یقینی تھی۔ اور اس بات کا قوی احتمال تھا کہ محمد کی محنت تباہ ہو جاتی اور اسلامی تحریک کا خاتمہ ہو جاتا، لیکن پیغمبر کی تدبیر اور سیاست کی وجہ سے مصیبت سر سے ٹل گئی اور اہل مکّہ واپس لوٹ گئے۔

محمد نے اُس تنازعے کے دوران بنو غطفان کے ایک شخص جو خفیہ طور پر اسلام لا چکا تھا، کو بنو قریظہ اور مکّی لشکر کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کے لیے مأمور کیا۔ چونکہ اس شخص (نعیم بن مسعود) کی یہودیوں کے ساتھ دوستی تھی اور اہل مکّہ کے ساتھ بھی اچھے مراسم تھے، اور دونوں طرف کے لوگ اسے محمد کا

مخالف سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ ان کے درمیان نفاق کا بیج بونے میں کامیاب ہو گیا اور دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے بدگمان ہو گئے۔

اتفاق سے ہوا کے بہت زیادہ تیز چلنے سے بھی مدد مل گئی جو محاصرہ کرنے والوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنی۔ اور چونکہ اہلِ مکّہ بنو قریظہ سے امداد ملنے سے بھی مایوس ہو چکے تھے، لہٰذا وہ مکّہ لوٹ گئے۔

مدینہ کا محاصرہ اٹھائے جانے اور قریش کا خطرہ ٹل جانے کے بعد حضور نے مسلح جنگجوؤں کو بنو قریظہ کی جانب بھیجا۔ بنی قریظہ نے ابو سفیان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور اس وجہ سے جنگ کا پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ گیا تھا۔ چنانچہ اس مناسبت سے بنو قریظہ کو معاف کر دیا جانا چاہیے تھا، یا کم از کم وہ محمد سے نرم رویئے کے حقدار تھے۔ لیکن اس کے باوجود پیغمبر نے اُنھیں تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اُن کی مدینہ میں موجودگی مسلسل ایک خطرہ تھی۔ اس کے علاوہ اُن کی تباہی لوگوں کے دلوں میں اسلام کا رعب طاری کر دے گی۔ مسلمانوں کو بہت زیادہ مال غنیمت ملے گا، اور اوس و خزرج کے لوگ اُس کے جھنڈے کے نیچے متحد رہیں گے۔

بنو نضیر کے نخلستانوں کو جلائے جانے کے فعل کو ذرہ بھر بھی قابل مذمت فعل نہیں گردانا گیا کیونکہ یہ حریف کو گھٹنوں کے بل جھکانے کے لیے ضروری تھا۔ اس کے متعلق اُن کے اعتراض اور واویلے کو بھی رد کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ اس فعل کو جائز قرار دینے اور پیغمبر کے اس فعل کی تائید اور صفائی میں آیات نازل ہوئی[123]۔

123: وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو ان کے گھروں سے پہلا لشکر جمع کرنے کے وقت نکال دیا حالانکہ تمھیں ان کے نکلنے کا گمان بھی نہ تھا اور وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کے قلعے اُنھیں اللہ سے بچالیں گے پھر اللہ کا عذاب اُن پر وہاں سے آیا کہ جہاں کا اُن کو گمان بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں ہیبت ڈال دی کہ اپنے گھروں کو اپنے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے آپ اجاڑنے لگے پس اے آنکھوں والو

ہجرت کے دسویں سال مسلمانوں نے بنی ثقیف کے انگور کے باغات کا محاصرہ کر لیا تھا تو تب بھی اسی قسم کی شدت عمل استعمال ہوئی۔ پہلے اُن تک کھانے کی ترسیل روک دی گئی۔ لیکن جب بعد میں خبر ہوئی کہ محصورین کے پاس اناج کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور ممکن ہے کہ محاصرہ طوالت اختیار کر جائے اور

عبرت حاصل کرو۔ اور اگر اللہ نے اُن کے لیے دیس نکالا نہ لکھ دیا ہوتا تو اُنھیں دنیا ہی میں سزا دیتا اور آخرت میں تو اُن کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرے تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ مسلمانوں تم نے جو کھجور کا پیڑ کاٹ ڈالا یا اس کو اس کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا یہ سب اللہ کے حکم سے ہوا اور تا کہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے۔ اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے مفت دلا دیا سو تم نے اس پر گھوڑے نہیں دوڑائے اور نہ اونٹ لیکن اللہ اپنے رسولوں کو غالب کر دیتا ہے جس پر چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو مال اللہ نے اپنے رسول کو دیہات والوں سے مفت دلا یا سو وہ اللہ اور رسول اور قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تا کہ وہ تمھارے دولت مندوں میں نہ پھرتا رہے اور جو کچھ تمھیں رسول دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ مال وطن چھوڑنے والے مفلسوں کے لیے بھی ہے جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے اللہ کا فضل اس کی رضامندی چاہتے ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی سچے (مسلمان) ہیں۔ اور وہ (مال) اُن کے لیے بھی ہے کہ جنھوں نے ان سے پہلے (مدینہ میں) گھر اور ایمان حاصل کر رکھا ہے جو ان کے پاس وطن چھوڑ کر آتا ہے اس سے محبت کرتے ہیں اور اپنے سینوں میں اس کی نسبت کوئی خلش نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جائے اور وہ اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہو اور جو اپنے نفس کے لالچ سے بچایا جائے پس وہی لوگ کامیاب ہیں۔ اور ان کے لیے بھی جو مہاجرین کے بعد آئے (اور) دعا مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمانداروں کی طرف سے کینہ قائم نہ ہونے پائے اے ہمارے رب بے شک تو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ کیا آپ نے منافقوں کو نہیں دیکھا جو اپنے اہل کتاب کے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم نکالے گئے تو ضرور ہم بھی تمھارے ساتھ نکلیں گے اور تمھارے معاملہ میں کبھی کسی کی بات نہ مانیں گے اور اگر تم سے لڑائی ہو گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ سراسر جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ ان کی مدد بھی نہ کریں گے اور اگر ان کی مدد کریں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے پھر ان کو مدد نہ دی جائے گی۔ البتہ تمھارا خوف ان کے دلوں میں اللہ (کے خوف) سے زیادہ ہے یہ اس لیے کہ وہ لوگ سمجھتے نہیں۔ وہ تم سے سب مل کر بھی نہیں لڑ سکتے مگر محفوظ بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں ان کی لڑائی تو آپس میں سخت ہے آپ ان کو متفق سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں یہ اس لیے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔ ان کا حال تو پہلوں جیسا ہے کہ جنھوں نے ابھی اپنے کام کی سزا پائی ہے اور ان کے لیے (آخرت میں) دردناک عذاب ہے۔ (اور) مثال شیطان کی سی ہے کہ وہ آدمی سے کہتا ہے کہ تو منکر ہو جا پھر جب وہ منکر ہو جاتا ہے تو کہتا ہے بے شک میں تم سے بری ہوں کیوں کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہاں کا رب ہے۔ پس ان دونوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں دوزخ میں ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔ (الحشر۔ 2 تا 17)

مسلمان اپنی متلون مزاجی اور غیر مستقل مزاجی کی قومی خصلت کی وجہ سے جلد ہی تھکاوٹ اور بیزاری کا مظاہرہ کریں، حضور نے انگور کے باغات جلانے کا حکم دے دیا۔

یہ باغات آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ چنانچہ بنو ثقیف نے کسی شخص کو حضور کے پاس بھیجا کہ وہ تباہی کے اس فعل سے ہاتھ کھینچ لیں اور تمام باغات مسلمان اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس جنگ کے بعد پیغمبر نے طائف کا محاصرہ ختم کیا اور مکّہ چلے گئے۔ تاکہ وہاں اپنے ساتھیوں میں وہ مال غنیمت تقسیم کریں جو قبیلہ بنو ہوازن سے ہاتھ آیا تھا۔ مالک بن عوف جو بنو ثقیف کے سرداروں میں سے تھا، کو پیغام بھیجا گیا کہ اگر اسلام قبول کرلو، تو تمھیں تمہاری بیوی اور بچوں کو واپس لوٹانے کے علاوہ سو اونٹ بھی دیئے جائیں گے۔ مالک خفیہ انداز میں طائف سے روانہ ہوا اور حضور کی خدمت میں پیش ہو کر اسلام قبول کیا۔

تمام واقعات جنھوں نے اسلام کو ایک رخ دیا تھا، کے متعلق اسناد موجود ہیں۔ یہ تمام روایات مستند اور صحیح ہیں۔ جو اُن وقتوں کے انسانوں کی ذہنیت، اسلام کے پھیلنے کی وجوہات اور محمد کے مشن کی کامیابی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ دسویں صدی ہجری میں مکّہ کی فتح کے بعد قبیلہ ہوازن کو شکست دینے سے بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اور جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو مسلمانوں نے لالچ کا بہت زیادہ مظاہرہ کیا، جو پیغمبر کی نو مسلموں کو بخشش کی وجہ سے بہت فکر مند تھے، انہیں ڈر تھا کہ اُن کو کم حصہ ملے گا۔ کیونکہ حضور نے ابوسفیان، معاویہ، حارث بن حارث، حارث بن ہشام، سہل بن عمر اور حویطب بن عبد العزیٰ، جو فتح مکّہ کے بعد مجبوری کی وجہ سے ایمان لائے تھے، کو فی کس سو اونٹ دیے گئے اور دوسرے نامور قریشیوں کو بھی اُن کے مرتبے کی نسبت سے نوازا گیا۔ انصاری یہ دیکھ کر بہت ناراض ہوئے جس کی خبر سعد بن عبادہ نے حضور کو پہنچائی۔ حضور نے تمام انصار کو جمع کیا اور ایک بہت ہی مؤثر تقریر کی جو اُن کی قوت تدبیر، مسائل کی گتھیاں سلجھانے اور لوگوں کو رام کرنے کی صلاحیت کا پتہ دیتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے بیان کے آخر میں کہا: اے انصار کی جماعت اور میرے مددگار ساتھیو، کیا تمھیں یہ پسند نہیں

ہے کہ اونٹ اور بکریاں تو دوسروں کے حصے میں آئیں اور تم خدا کے پیغمبر کو اپنے ساتھ لے جاؤ؟۔ اور یوں اُن کے اندر مال غنیمت کے حرص کی آگ سرد ہوئی[124]۔

دس سال محمد نے جو مدینہ میں گزارے، اس عرصہ کے دوران اُن کی باتیں اور رویے اُن کی سیاست و تدبیر کی قوت کا ثبوت ہیں۔ سیرت کی کتابیں ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہیں، جنھیں پڑھ کر کوئی بھی معاملہ فہم انسان سو سے زیادہ ایسے واقعات ڈھونڈ نکالے گا، جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔

سورت النِّسَاء کی آیات 105 تا 108 کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اس کی شان نزول یوں بیان کرتے ہیں ۔ طعمہ بن ابیرق نے ایک زرہ چرائی اور اُسے ایک یہودی کے ہاں چھپا دیا۔ صاحب زرہ کو وہاں سے مل گئی اور طعمہ پر اس کی چوری کا شبہ ظاہر کیا گیا۔ تو اُس نے قسم کھائی کہ اُس نے چوری نہیں کی اور نہ ہی اس میں اُس کا ہاتھ ہے۔ تب اُس نے یہودی پر الزام لگایا اور لوگ فیصلے کی خاطر اُسے حضور کے پاس لے آئے۔ اُنھیں امید تھی کہ ایک یہودی کے مقابلے میں محمد اُن کی طرف داری کرتے ہوئے اسے بے گناہ قرار دیں گے لیکن ان آیات سے بہت اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ حضور نے ایسا نہیں کیا اور غیر منصفانہ جانبداری کے مقابلے میں انصاف کو ترجیح دی:

124: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ فتح مکّہ کے دن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو (غزوہ حنین کی) غنیمت کا سارا مال دے دیا تو بعض نوجوان انصاریوں نے کہا (اللہ کی قسم!) یہ تو عجیب بات ہے ابھی ہماری تلواروں سے قریش کا خون ٹپک رہا ہے اور ہمارا حاصل کیا ہوا مال غنیمت صرف اُنھیں دیا جا رہا ہے، اس کی خبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو خبر مجھے ملی ہے کیا وہ صحیح ہے؟ انصار لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے اُنھوں نے عرض کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح اطلاع ملی ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس سے خوش اور راضی نہیں ہو کہ جب سب لوگ غنیمت کا مال لے کر اپنے گھروں کو واپس ہوں اور تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لیے اپنے گھروں کو جاؤ گے؟ انصار جس نالے یا گھاٹی میں چلیں گے تو میں بھی اسی نالے یا گھاٹی میں چلوں گا۔ (صحیح البخاري، کتاب مناقب الأنصار)۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا

(بے شک ہم نے تیری طرف سچی کتاب اتاری ہے تاکہ تو لوگوں میں انصاف کرے جو کچھ تمھیں اللہ سجھادے اور تو بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ ہو)۔

سورت الحُجرَات کی آیت 9 بھی اسی قسم کا مضمون لیے ہوئے ہے۔ جو نہ صرف حضور کی سیاست اور تدبیر کو آشکار کرتی ہے بلکہ اس سے ہمیں اُن وقتوں کی سماجی حالت اور آغاز اسلام کے وقت پائے جانے والے تعصبات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

(اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو پس اگر ایک ان میں دوسرے پر ظلم کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پھر اگر وہ رجوع کرے تو ان دونوں میں انصاف سے صلح کرا دو)۔

یہ آیت اپنے طور پر بہت واضح اور حکیمانہ ہے۔ تفسیر جلالین میں ایک واقعے کو اس کی شان نزول بتایا گیا ہے۔ اس واقعے کا ذکر اس لحاظ سے سود مند رہے گا کہ اس سے نہ صرف اُن وقتوں کے سماجی حالات آشکار ہوتے ہیں بلکہ یہ اسلام کے آغاز کے تعصب اور جانبداری کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔

"حضور گدھے پر سوار تھے اور عبد اللہ بن ابی کے پاس سے گزرے تو اُس وقت گدھے نے پیشاب کر دیا۔ بدبُو سے بچنے کے لیے ابن ابی نے اپنا ہاتھ ناک پر رکھ دیا۔ عبد اللہ بن رواحہ بھی وہیں موجود تھا اور اُس نے ابن ابی سے یہ کہا: "خدا کی قسم، حضور کے گدھے کے پیشاب کی بو اس عطر سے زیادہ خوشبودار ہے جو تم نے استعمال کیا ہوا ہے۔ دونوں گروہوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی اور فریقین نے جوتوں اور کھجور کی شاخوں سے ایک دوسرے کو مارنا شروع کر دیا"۔

یہ حالات وواقعات اس بات کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ جیسے جیسے پیغمبر کی شان میں اضافہ ہوتا گیا، لوگ اُن سے خوف کھانے لگے۔ چنانچہ فتح مکّہ کے بعد بجیر بن زہیر بن ابی سلمیٰ نامی شاعر نے اپنے بھائی کعب بن زہیر کو لکھا کہ جن لوگوں نے پیغمبر کی ہجو لکھی ہے یا اُسے آزار دیا ہے، پیغمبر اُنھیں قتل کروا رہا ہے، تمام وہ شعراء جو ایسا کرتے رہے ہیں وہ مکّہ سے بھاگ گئے ہیں۔ تم اگر محفوظ رہنا چاہتے ہو تو اُس کے پاس جا کر امان طلب کرو کیونکہ وہ کسی ایسے انسان کو قتل نہیں کرواتا جو اپنے ماضی پر شرمندگی کا اظہار کرے اور معافی کا طلب گار ہو۔ بصورت دیگر اپنی حفاظت کرو اور اس علاقے میں مت نظر آؤ۔ ــــــ کعب نے پیغمبر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، اسلام قبول کیا اور جان کی امان پائی۔

(یہ قصیدہ "بردہ" کے نام سے مشہور ہے۔ جسے سن کر حضور بہت خوش ہوئے اور انعام کے طور پر اپنی چادر کعب کو عطا کی جسے عربی میں بردہ کہتے ہیں)[125]۔

125: جب کعب کو خط موصول ہوا تو اُس پر زندگی تنگ ہو گئی اور اُس کو اپنی جان کی فکر لاحق ہو گئی اور اُس کے مخالف افواہیں پھیلانے لگے کہ وہ مقتول اور موت کے منہ میں ہے۔ جب اُس کو کوئی چارہ کار نہ رہا تو اُس نے رسول اللہ کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا۔ اُس میں خوف و یاس اور دشمنوں کی افواہوں کا ذکر کیا۔ پھر وہ مدینہ آیا اور اپنے ایک جھنی دوست کا مہمان ہوا۔ وہ دوست اُس کو رسول اللہ کے پاس نمازِ فجر میں لے آیا، رسول اللہ کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر دوست نے اشارہ کر کے بتایا: "آپ رسول اللہ ہیں، اُٹھو اور ان کی امان طلب کرو"۔ چنانچہ وہ رسول اللہ کے پاس آیا اور آپ کے پاس بیٹھ کر اپنا ہاتھ رسول اللہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ آپ اُس کو پہچانتے نہ تھے، اُس نے عرض کیا: "یا رسول اللہ کعب بن زہیر توبہ کر کے مسلمان ہو کر جان کی امان کے لیے آیا ہے۔ اگر میں اُس کو لے آؤں تو کیا آپ اُس کی معذرت قبول کر لیں گے"۔ یہ سُن کر رسول اللہ نے کہا: "ہاں" تو اُس نے کہا: "یا رسول اللہ میں ہی کعب بن زہیر ہوں"۔ ایک انصاری نے اچھل کر کہا: "یا رسول اللہ اجازت دیجیے میں اس دشمنِ خدا کی گردن اڑا دوں"۔ تو رسول اللہ نے فرمایا: "چھوڑو یہ اپنے پرانے رویہ سے تائب ہو کر آیا ہے"۔ یہ سُن کر کعب بن زہیر انصار پر ناراض ہو گیا کہ کسی مہاجر نے اُس کے خلاف کوئی بات نہیں کہی تھی۔ چنانچہ پھر کعب نے اپنا قصیدہ لامیہ رسول اللہ کے سامنے پیش کیا۔ (البدایہ والنہایہ، عماد الدین اسماعیل ابن کثیر)۔

یہ سادہ لوح اور آزاد منش لوگ تکلفات سے ناواقف تھے۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں وہ اپنے رہبر کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتے تھے اور قرآنی امر و نہی کی اطاعت کے علاوہ کسی چیز کو اپنے اوپر فرض نہیں سمجھتے تھے۔ یوں وہ محمد کو اپنوں میں سے ایک گردانتے تھے۔ لیکن یہ بدوی طریقہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ پیروکاروں کے لیے لازمی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے امیر یا رئیس کو ویسا احترام دیں جس کا وہ خواہش مند تھا۔ سورت الحُجرَات کی آیات ایک تا پانچ، جو ان اصولوں اور آداب کے متعلق ہے، نازل ہوتی ہیں اور اُن کے رویوں کی حدود متعین کی جاتی ہیں

1: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

(اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پہل نہ کرو)۔

مطلب واضح ہے کہ کسی کو بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ بات یا کام کے حوالے سے اللہ سے سبقت لینے کی کوشش نہ کرے۔ یہاں حضور یہ چاہ رہے ہیں کہ کوئی باتوں میں اُن سے پہل نہ کرے اور نہ ہی اُن کی اجازت کے بغیر کوئی کام کیا جائے۔

2: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ۔

(اے ایمان والو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ بلند آواز سے رسول سے بات کیا کرو جیسا کہ تم ایک دوسرے سے کیا کرتے ہو)۔

یعنی عمر بن خطاب کی مانند باتیں مت کرو، جنھوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنی رائے کو بہتر گردانتے ہوئے پیغمبر سے با آواز بلند اختلاف کا اظہار کیا تھا اور پیغمبر کو "یا رسول اللہِ" کی بجائے "محمد" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

3: اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ۔

(جو لوگ اپنی آوازیں رسول اللہ کے حضور دھیمی کر لیتے ہیں یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو پرہیز گاری کے لیے جانچ لیا ہے ان کے لیے بخشش اور بڑا اجر ہے)

پتہ چلتا ہے کہ بدوؤں کے ہاں مؤدبانہ انداز میں بولنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ حضور کے سامنے بھی اونچی آواز میں بولا کرتے تھے۔ لیکن حضور کی تحریک کے طاقت پکڑنے کے بعد اُن کا ادب کرنا لازمی ٹھہرا۔

4: اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔

(جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں)۔

حضور کا گھر ان کی بیویوں کے حجروں پر مشتمل تھا۔ بدّو اُن کے گھر کے پیچھے آ کر زور سے آواز لگاتے: "اوئے محمد"۔ حضور اس بات کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ان کے اس رویے کو ان کی بے عقلی قرار دیتے ہیں، اور حضور صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی، یہ خدائی کلام ہے۔ خدا کو یہ پسند نہیں آ رہا کہ کوئی اُس کے پیغمبر سے اس طرح پیش آئے۔ کیونکہ اس سے پیغمبر کی شان میں کمی ہوتی ہے اور چونکہ اُس کا پیغمبر اب کامیاب ہو چکا تھا، اور اب یہ وہ نہیں رہا تھا جو دوسرے لوگوں کی طرح اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر خندق کھودتا تھا اور مٹی اٹھاتا تھا۔

5: وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (اور اگر وہ صبر کیے رہتے یہاں تک کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا)۔

سورت المجَادلة کی آیت 12 اُنھی آداب کو واضح انداز میں بیان کرتی ہے۔ کہ اگر کوئی مومن پیغمبر سے علیحدگی میں ملنا چاہتا ہے تو پہلے صدقہ دے۔

یا اَیُّهَا الَّذینَ آمَنُوا اِذا ناجَیتُمُ الرّسُولَ فَقَدِّمُوا بَینَ یَدَی نَجویکُم صَدَقَةٍ۔ (اے ایمان والو، جب تم رسول سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو)۔

لگتا ہے یہ تجویز مسلمانوں پر گراں گزری تھی اور وہ اس سے ناراض ہوئے تھے۔ چنانچہ اسی سورت کی آیت 13 سے اس رسم کو منسوخ کر دیا گیا۔

أَأَشفَقتُم أَن تُقَدِّموا بَينَ يَدَي نَجواكُم صَدَقاتٍ فَإِذلَم تَفعَلوا وَتابَ اللَّهُ عَلَيكُم۔ (کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمھیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا)۔

پیغمبر سے ملاقات کے حوالے سے ہمیں سورت الأحزاب میں بھی ہدایت ملتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ۔

(اے ایمان والو نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو مگر اس وقت کہ تمہیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے نہ اس کی تیاری کا انتظام کرتے ہوئے لیکن جب تمہیں بلایا جائے تب داخل ہو پھر جب تم کھا چکو تو اٹھ کر چلے جاؤ اور باتوں کے لیے جم کر نہ بیٹھو کیوں کہ اس سے نبی کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ تم سے شرم کرتا ہے اور حق بات کہنے سے اللہ شرم نہیں کرتا: الأحزاب۔ 53)۔

اس آیت کو کسی شرح یا تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آیت واقعات کے متعلق خود بتا رہی ہے۔ صحابی چاہتے تھے کہ حضور کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آئیں، اُن کے گھر میں جب چاہیں داخل ہوں، جب تک کھانا پک نہیں جاتا تب تک بیٹھ کر انتظار کریں، اور کھانا کھانے کے بعد بیٹھ کر گپ بازی کریں[126]۔

126: انس بن مالک نے کہا کہ اس آیت یعنی آیت پردہ (کے شان نزول) کے متعلق میں سب سے زیادہ جانتا ہوں، جب زینب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا اور وہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر ہی میں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا تیار کروایا اور قوم کو بلایا

یہ باتیں پیغمبر کی شان کے خلاف تھیں جو اب ایک ریاست کا سربراہ بھی بن چکے تھے۔ پیغمبر اور پیروکاروں کے درمیان پرائیویسی کی ضرورت تھی۔ پیغمبر یہ کہنے سے شرماتے تھے لیکن خدا کو ایسا کہنے میں کسی قسم کی شرم نہیں تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں حضور خدائی الفاظ کے ذریعے اُنھیں حاکم ریاست کے ساتھ پیش آنے کے آداب سکھا رہے ہیں۔ اس آیت کے اگلے حصے کا مطلب گو کچھ اور ہے لیکن وہ اسی استنباط کی تائید کرتی ہے۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ۔ (اور جب نبی کی بیویوں سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کے باہر سے مانگا کرو اس میں تمہارے اور اُن کے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی ہے)۔

اس سلسلے میں عائشہ سے روایت کردہ ایک حدیث ہے: ”میں اور حضور ایک ہی برتن میں کھانا کھا رہے تھے کہ وہاں سے عمر کا گزر ہوا۔ حضور نے اسے کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے دوران میری اور عمر کی انگلی ٹکرائی۔ عمر نے کہا: کاش، اگر میری بات پر کان دھرے جاتے تو آپ کو کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی“۔ چنانچہ اس کے بعد پردے والی آیت نازل ہوئی۔

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ عمر نے حضور سے کہا: تمھاری بیویاں دوسری عورتوں کے مانند نہیں ہیں۔ اِنھیں پردہ کراؤ۔ لہٰذا پردے کی آیت نازل ہوئی۔

(کھانے سے فارغ ہونے کے بعد) لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر جاتے اور پھر اندر آتے رہے (تاکہ لوگ اٹھ جائیں) لیکن لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ”یا أیھا الذین آمنوا لاتدخلوا بیوت النبي إلا أن یؤذن لکم إلی طعام غیر ناظرین إناہ“ کہ ”اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں مت جایا کرو۔ سوائے اس وقت کے جب تمھیں (کھانے کے لیے) آنے کی اجازت دی جائے۔ ایسے طور پر کہ اس کی تیاری کے منتظر نہ رہو۔“ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”من وراء حجاب“ تک اس کے بعد پردہ ڈال دیا گیا اور لوگ کھڑے ہوگئے۔ (صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن)۔

"یا نِساء النَّبِیِّ لَستُنَّ کَاَحَدٍ مِنَالنِّساء " (اے پیغمبر کی بیویو تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو : الأحزَاب۔32)۔

حضور کی بیویاں دوسری عورتوں کی طرح کیوں نہیں تھیں، کیونکہ محمد دوسرے مردوں کی طرح نہیں تھے۔ لہذا بیویوں کے حوالے سے بھی اُن کی شان اور مقام بلند ہونا چاہیے، اور اُن کی بیویوں کو بھی مشرق کی شہزادیوں کی مانند پردے میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے سورت الأحزَاب کی آیت 53 جو پہلے دی گئی آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَا کَانَ لَکُمۡ اَنۡ تُؤۡذُوۡا رَسُوۡلَ اللّٰہِ وَلَاۤ اَنۡ تَنۡکِحُوۡۤا اَزۡوَاجَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖۤ اَبَدًا۔ (تم رسول اللہ کو ایذا نہ دو اور نہ تم اُس کی موت کے بعد اُس کی بیویوں سے نکاح کرو)۔

یہ بہت بڑا گناہ ہے اور محمد اس مسئلے پر اس قدر حساس تھے کہ اُنھوں نے اسرائیلی بادشاہوں کی طرح کسی کو حق نہیں دیا، کہ اُن کی موت کے بعد کوئی اُن کی بیویوں سے ہم بستر ہو۔

دوسرے لوگوں کے مقابلے میں برتری اور امتیاز کا اظہار قرآن کی اس عبارت میں شدت سے محسوس ہوتا ہے جس سے بے اعتنائی اور حقارت ٹپکتی ہے۔

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ۔

(بدّو بولے ہم ایمان لے آئے ہیں کہہ دو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہوئے اور ابھی ایمان تمھارے دلوں میں کہاں داخل ہوا: الحُجرَات۔14)۔

جب نئے اسلام قبول کرنے والوں نے، ہم نے طاقت اور جنگ کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے، کی مناسبت سے چاہا کہ اپنے اسلام قبول کرنے کا اظہار رسول اللہ کے سامنے کریں اور اُن پر احسان جتائیں تو سورت الحُجرَات کی آیت 17 نازل ہوتی ہے۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰادِقِيْنَ۔

(یہ لوگ تمھیں احسان جتاتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے ہیں کہہ دو مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتلاؤ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتاہے کہ اس نے تمھیں ایمان کا رستہ دکھایا بشرطیکہ تم سچے ہو)۔

یہ خشک لہجہ اور بے اعتنائی کا اظہار کرنے والا محمد کہاں اور وہ جذبات کی گرمی سے سرشار اور نصیحتوں سے بھرپور وعظ کرنے والا محمد کہاں۔ وہ محمد جو کبھی کعبہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ارمیا نبی کی طرح سورت الفجر سنایا کرتا تھا جس سے پند و نصائح جھڑتے تھے اور جس سے انسانیت کی راہ و رسم کا اظہار ہوتا تھا۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ۔ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ۔ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ۔ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ۔ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ۔ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ۔ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ۔ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ۔ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ۔۔۔۔ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ۔ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا۔ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا جو نسل ارم سے ستونوں والے تھے کہ ان جیسا شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے پتھروں کو وادی میں تراشا تھا اور فرعون کے ساتھ جو خیمے اور میخیں رکھتا تھا۔ ان سب نے ملک میں سرکشی کی پھر اُنھوں نے بہت فساد پھیلایا پھر اُن پر تیرے رب نے عذاب کا کوڑا پھینکا بے شک تمہارا رب تاک میں ہے۔۔۔ ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو اور میت کا ترکہ سب سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو: الفجر۔ 6 تا 14 اور 17 تا 20)۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس ترتیب سے ادا ہوئے جملوں اور ان کی خوش آہنگی کا لفظ بہ لفظ یا جملہ بہ جملہ ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔

مدینہ میں نازل شدہ ضوابط کا تعلق عملی و انتظامی پہلو سے ہے۔ جس سے ان بے لگام بدوؤں کی خود غرضی اور خود سری کو لگام ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ سورت النِّساء کی آیت 94 میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا

(اے ایمان والو! جب اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تحقیق کر لیا کرو، اور جو تم پر سلام کہے اس کو مت کہو کہ مسلمان نہیں ہے تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں ہیں تم بھی تو اس سے پہلے ایسے ہی تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا لہذا تحقیق سے کام لیا کرو بے شک اللہ تمھارے کاموں سے باخبر ہے)۔

یہ آیت حضور کے چند ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی جو سفر کے دوران بنی سلیم کے ایک شخص سے ملے جس کے پاس بھیڑیں تھیں۔ اُس نے اُنھیں سلام کیا جس انداز سے مسلمان ایک دوسرے کو کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ اس شخص نے ڈر کے مارے سلام کیا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اُس شخص کو قتل کر دیا اور اُس کی بھیڑوں کو مال غنیمت کے طور پر لے آئے۔

سورت الحُجرَات میں اور آیات بھی ہیں جو زندگی کے آداب سکھاتی ہیں، اسی قسم کی آیت نمبر 11 ہے۔ یہ آیت بنی تمیم کے ایک گروہ کے متعلق ہے جنھوں نے عمارہ اور صہیب نامی غریب مسلمانوں کا مذاق اڑایا اور اُن کی تحقیر کی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ وَلَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُنَّ خَيۡرًا مِّنۡهُنَّ‌ وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ‌ بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِيۡمَانِ

(اے ایمان والو ایک قوم دوسری قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے ٹھٹھا کریں کچھ بعید نہیں کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) گناہ ہے)۔

قرآن کی درجنوں آیات بول چال، نشست و برخاست، ایک دوسرے سے پیش آنے اور حسن اخلاق کا جہاں درس دیتی ہیں۔ وہیں ہمیں حضور کے زمانے کے عربی معاشرے کے سماجی حالات کے متعلق بھی پتہ چلتا ہے۔

اسلام میں عورت

واستوصوابالنساءخیراًفانھن

عوان لایمکن لانفسھنّ شیئاً

دسویں صدی ہجری، حجۃ الوداع کے موقع پر پیغمبر نے عورتوں کی یوں تعریف کی کہ اُن کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ، وہ قیدی ہیں اور اپنے طور پر کوئی اختیار نہیں رکھتیں: جامع الأخبار[127]۔

اسلام سے پہلے کے عرب معاشرے میں عورت کی حیثیت یا وجود آزادانہ نہیں تھا۔ وہ مردوں کی ملکیت شمار ہوتی تھیں اور اُن کے ساتھ کسی بھی قسم کا سلوک جائز اور رائج تھا، خواہ وہ سلوک انسانیت کی راہ و رسم سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔ شوہر کے مرنے کے بعد عورتیں بھی باقی ترکے کی مانند وارث کو منتقل ہو جاتی تھیں۔ وارث بغیر مہر ادا کیے اُنھیں اپنی بیوی بنانے کا مجاز تھا۔ اور اگر عورت اس پر رضامندی کا اظہار نہ کرے اور کسی اور مرد سے شادی کرنا چاہے تو اُسے یہ اجازت اسی صورت میں ملتی تھی کہ خاوند سے اگر اُسے کچھ ترکہ ملا ہے تو اسے اپنے وارث کے حوالے کر دے وگرنہ وہ زندگی بھر قید میں رہے گی اور اُس کی موت کے بعد اُس کا وارث مرد اُس کی میراث کا مالک بن جائے گا۔ سورت النِّسَاء کی آیت 19 اسی غیر انسانی عمل کو روکنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

127: احادیث کا مجموعہ جسے چھٹی صدی ہجری میں شیخ تاج الدین محمد بن حیدر شعیری نے تالیف کیا تھا۔

اے ایمان والو! تمھیں حلال نہیں کہ عورتوں کے وارث بن جاؤ زبردستی اور عورتوں کو روکو نہیں اس نیت سے کہ جو مہر اِن کو دیا تھا اس میں سے کچھ لے لو مگر اس صورت میں کہ صریح بے حیائی کا کام کریں اور ان سے اچھا برتاؤ کرو۔

سورت النِّسَاء کی آیت 34 کی یہ عبارت "اَلرِّجالُ قَوّامُونَ عَلَی النِّساء "(مرد عورتوں پر حاکم ہیں) اسی اصول کو برقرار رکھتی ہے کہ مرد اور عورت تمام معاشرتی حقوق میں برابر نہیں ہیں۔ اسی آیت میں عورتوں پر تسلط اور سیادت کی دلیل مختصراً بیان کی گئی ہے۔ "بِما فَضَّلَ اللہُ بَعضَھُم عَلی بَعضٍ وَبِما اَنفقُوا مِن اَموالِھِم "(اس واسطے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی ہے اور اس واسطے کہ اُنھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں)۔ اس کا پہلا حصہ مبہم ہے کیونکہ اس میں فرمایا گیا ہے: کیونکہ اللہ نے انسانوں کو برابر پیدا نہیں کیا بعض کو بعض پر برتری دی گئی ہے۔

تفسیر جلالین کے مطابق مرد کی عورت پر فضیلت کی وجہ عقل، علم اور انتظامی صلاحیت ہے۔ زمخشری اور بیضاوی[128] اور چند دوسرے مفسرین مرد کی عورت پر برتری کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرد کی عورت پر برتری ویسے ہی ہے جیسے حاکم کی رعایا پر۔ پھر وہ فلسفہ طرازی کرتے اس کی وجہ تراشتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرد عقل، طاقت اور تدبیر سے آراستہ ہیں، اسی وجہ سے نبوت، امامت اور حاکمیت اُنھی کے لیے مخصوص ہوئی۔ اُنھیں وراثت میں زیادہ حصہ ملتا ہے اور شرعی عدالت میں اُن کی گواہی زیادہ معتبر اور دو عورتوں کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اُن کا ورثے میں حصہ دو عورتوں کے برابر ہوتا

128: عبداللہ بن عمر بیضاوی عالم اسلام کے بڑے علماء میں سے ایک ہیں۔ ایران کے صوبے فارس کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد فارس کے قاضی القضاۃ تھے۔ بیضاوی پہلے شیراز میں قاضی رہے، اس کے بعد وہ تبریز چلے گئے، اور ساری عمر قضاوت کے علاوہ تدریس و تالیف میں مصروف رہے۔ قاضی بیضاوی نے زمخشری کی "تفسیر الکشاف" پر حاشیہ لکھا۔ جسے ابھی تک اہل سُنّت کے ہاں بہت تقدس حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے صوفیت، قضا اور عربی زبان میں صرف و نحو پر لکھا ہے۔

ہے۔ جہاد اور نماز جمعہ عورتوں پر فرض نہیں ہے، نیز طلاق دینے کا حق بھی اُن کے پاس نہیں ہے۔ اذان، خطبہ، نماز با جماعت کی امامت، گھڑ سواری، تیر اندازی، شرعی حدود کے حوالے سے گواہی وغیرہ سب مردوں کے لیے مخصوص ہیں۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں استدلال کتنا کمزور ہے۔ اس ضمن میں تقریباً ہمیشہ معلوم کو علّت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی اُن کا خیال ہے کہ چونکہ معاشرتی زندگی میں انجام دیئے جانے والے کاموں اور رسوم ورواج کی اکثریت کو مردوں کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا عورتوں کا درجہ مرد سے کمتر قرار دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اُن میں ان کاموں کو سرانجام دینے کے لیے درکار استعداد اور اہلیت نہیں ہے۔ یوں اسلامی شریعت مرد کی عورت پر بالادستی کو تسلیم کرتی ہے۔ جب کہ قضیہ اُس کے الٹ ہے۔ اسلامی شریعت چونکہ عورت کو کمزور گردانتی ہے اس لیے اُس کی گواہی اور حق وراثت کو مرد سے نصف طے کیا گیا ہے۔ لہٰذا صورت یہ نہیں ہے کہ چونکہ عورت ورثے اور گواہی کے سلسلے میں مرد سے نصف حق رکھتی ہے، لہٰذا وہ مرتبے کے حوالے سے مرد سے کمتر ہے۔ یہ ایک واضح حکم ہے جس کے دفاع کے لیے تاریک راہداریوں کے اندر سے دلائل تلاش کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ تاریخ کے آغاز سے تمام ابتدائی اقوام میں روزی کی تلاش اور ایسے کام جن کے لیے طاقت درکار ہوتی ہے، مرد کے پاس تھے۔ اس لیے عورت مرتبے کے حوالے سے دوسرے درجے پر قرار پائی۔ جرمن فلسفی نیتشے کے الفاظ میں عورت دوسرے درجے کا انسان شمار ہوئی۔

عورتوں کو دوسرے درجے کا انسان سمجھنے کا رویہ عربوں کے ہاں بہت ہی وحشیانہ اور قابل مذمت صورت میں موجود تھا۔ محمد نے مختلف نصیحتوں اور تنبیہات سے اس وحشیانہ رویے کی شدت کو کم کرنے کے علاوہ عورتوں کو حقوق دیئے ہیں جن کی اکثریت سورت النِّسَاء میں ملتی ہے۔

عورتوں کو کمتر شمار کرنے کے حوالے سے ان مفسرین کی توضیح اور فلسفہ طرازی منطق اور عقلی لحاظ سے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اُن وقتوں میں عربوں کے ہاں جو رائج تھا یہ در حقیقت اُسی کی تائید و تصدیق کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اُنھیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ اُنھوں نے "فَضَّلنا بَعضَهُم عَلى بَعضٍ" (بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے جملے میں مردوں کی عورتوں پر فضیلت کی وجہ بیان کی گئی ہے جسے عقلی معیار پر تولنا ممکن ہے "بِما اَنفَقُوا مِن اَموالِهِم "۔ یعنی چونکہ مرد عورتوں کی مالی کفالت کرتے ہیں چنانچہ عورت اُن کی ماتحت ہے، اُسے چاہیے کہ مرد کے طے کردہ امر و نہی کی اطاعت کرے۔ یہ وہ وجہ ہے کہ بیضاوی، زمخشری اور مفسرین کی اکثریت ایسی رائے رکھتی ہے کہ مرد حاکم ہے اور عورت رعایا ہے، مرد آقا اور عورت غلام ہے۔ اسی طرح کا جملہ جو اس جملے کے بعد ہے وہ اس سوچ کو بہت اچھے انداز میں واضح کرتا ہے۔ " فَالّصالِحاتُ قانِتاتُ حافِظاتُ لِلغَيبِ" چنانچہ نیک بیویاں وہ ہے جو مردوں کی مطیع رہتی ہیں اور شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے آپ کو اُس کے لیے محفوظ رکھتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عورتیں اس بات کو نہ بھولیں کہ وہ مرد کی ملکیت ہیں۔ اسی سورت النِّساء میں پیغمبر اسلام نے مردوں اور عورتوں کے حقوق و حدود کا تعین کیا ہے۔ اور زمانہ جاہلیت کے رواج کو تبدیل کرتے ہوئے عورتوں کی صورت حال بہتر بنائی ہے۔

وَإِن أَرَدتُمُ استِبدالَ زَوجٍ مَكانَ زَوجٍ وَآتَيتُم إِحداهُنَّ قِنطارًا فَلا تَأخُذوا مِنهُ شَيئًا أَتَأخُذونَهُ بُهتانًا وَإِثمًا مُبينًا۔ وَكَيفَ تَأخُذونَهُ وَقَد أَفضى بَعضُكُم إِلى بَعضٍ وَأَخَذنَ مِنكُم ميثاقًا غَليظًا

(اور اگر تم ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو بدلنا چاہو اور ایک کو بہت سامال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لوگے۔ تم اسے کیوں کر لے

سکتے ہو جب کہ تم میں سے ہر ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکا ہے اور وہ عورتیں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں: النِّسَاء۔ 20،21)۔

اس آیت سے بہت آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عرب مرد جب چاہتے کہ اپنی عورت کو چھوڑ دیں تو جو سامان وہ اسے مہر کے طور پر دے چکے ہوتے تھے اسے واپس لے لیتے تھے۔ اسلامی شریعت نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

لیکن سورت النِّسَاء کا آخری حصہ دور جاہلیت کے رویوں کو جاری رکھنے کا مشورہ دیتا ہے اور مردوں کا اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو ماریں۔ جسمانی طور پر طاقتور ہونے کی وجہ سے مرد کافی عرصہ سے ایسا کرتے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی میں بھی جوانمردی اور انصاف کے منافی یہ عمل جاری ہے۔ لیکن اسے شریعت کا حصہ بنانے سے ناقدین کو تنقید اور طعنہ زنی کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ آیت نمبر 34 کچھ یوں ہے:

وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ

(اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمھیں اندیشہ ہو تو اُنھیں سمجھاؤ اور اُن سے الگ سوؤ اور اُنھیں مارو)[129]۔

129 : بیویوں کے مارنے کے حوالے سے سنن ابن ماجہ کی کتاب النکاح میں ایک حدیث یوں ہے: اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک رات عمر رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا، جب آدھی رات ہوئی تو وہ اپنی بیوی کو مارنے لگے، تو میں ان دونوں کے بیچ حائل ہو گیا، جب وہ اپنے بستر پہ جانے لگے تو مجھ سے کہا: اشعث !وہ بات جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے تم اسے یاد کر لو: ”شوہر اپنی بیوی کو مارے تو قیامت کے دن اس سلسلے میں سوال نہیں کیا جائے گا، اور وتر پڑھے بغیر نہ سوؤ“ اور تیسری چیز آپ نے کیا کہی میں بھول گیا۔

ہر قوم کے ضوابط اُس کی عادات، اخلاقیات اور طرز زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔ روایات، عربوں کی تاریخ اور اس آیت سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اُن کے ہاں بیوی کو مارنا معمول کی بات تھی۔ مرد اپنے آپ کو عورت کا مالک تصور کرتے تھے اور اسے جو سزا چاہتے دیتے تھے۔

اسماء بنت ابو بکر زبیر بن العوام کی چوتھی بیوی تھیں۔ زبیر بن عوام چند چیدہ صحابیوں میں سے ایک ہونے کے علاوہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے۔ اسماء کہتی ہیں کہ زبیر کو جب ہم میں سے کسی ایک پر غصہ آتا تھا تو وہ تب تک اُسے ڈنڈے سے مارتے رہتے تھے جب تک ڈنڈا ٹوٹ نہ جائے۔

اسلامی شریعت کو کم از کم اس حوالے سے سراہا جا سکتا ہے کہ اس نے درجہ بندی کرتے ہوئے پہلے سمجھانے اور پھر ساتھ نہ سونے کی ہدایت کی ہے اور اگر یہ دونوں باتیں سود مند ثابت نہ ہوں تو بیوی کو مارنے کی تدبیر استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین اور فقہا کے عقیدے کے مطابق بیوی کو اتنا نہیں مارنا چاہیے کہ اُس کی کوئی ہڈی ٹوٹ جائے کیوں کہ ایسی صورت میں قصاص کا حکم لاگو ہو جائے گا۔ زمخشری اس آیت کی تفسیر میں یوں کہتے ہیں: "نافرمان بیوی کو سزا دینے کے حوالے سے کچھ فقہا اس ترتیب کے قائل نہیں ہیں اور وہ تینوں میں سے کسی بھی وسیلے کو استعمال کرنا جائز سمجھتے ہیں"۔

جس کسی نے اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یقیناً احمد بن حنبل یا ابن تیمیہ جیسے کسی کٹر عرب عالم کا پیروکار ہو گا۔ لیکن قرآن کی اس آیت کے معنی انتہائی واضح ہیں اور اس سے اگلی آیت انہی معنوں کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔

وَاِن خِفتُم شِقَاقَ بَينِهِمَا فَابعَثُوا حَكَماً مِن اَهلِهِ وَحَكَماً مِن اَهلِهَا اِن يُرِيدَا اِصلاحاً

(اور اگر تمھیں کہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو اگر یہ دونوں صلح کرنا چاہیں گے: النِّسَاء۔ 35)۔

اس سورت میں مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں اور آپس کے تعلقات کو جس طور پر مقرر کیا گیا ہے۔ ان میں اکثر احکام کی بنیاد اہل یہود کی شریعت تھی جو زمانہ جاہلیت کے عربوں کے ہاں پہلے سے ہی معمول کا حصہ بن چکے تھے ماسوائے اپنے باپ کی بیوی سے شادی کرنے کے، جس کا ذکر آیت 22 میں آیا ہے اور اسے بے حیائی اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔

"وَلا تَنكِحوا ما نَكَحَ آباؤُكُم مِنَ النِّساءِ إِلّا ما قَد سَلَفَ" (اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو پہلے ہو چکا)۔ اسی آیت کے "إِلّا ما قَد سَلَفَ" کے جملے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے ہاں یہ رسم رائج تھی۔

سورت النِّسَاء کی آیت 24 میں ایسی عورت سے نکاح کو قطعی انداز میں حرام قرار دیا گیا ہے جو پہلے سے شوہر والی ہو۔ اس آیت میں گو کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ عورت جو خریدنے کی وجہ سے ملکیت بن چکی ہے یا جنگ کے نتیجے میں قیدی ہو کر ہاتھ لگی ہے، وہ خواہ پہلے سے شوہر والی ہی کیوں نہ ہو، اسے شیر مادر کی طرح حلال قرار دیا گیا ہے اور اس کا جائز ٹھہرانے کے متعلق ابن سعد کی ایک روایت ہے۔

اوطاس سے کچھ عورتیں ہمارے ہاتھ لگیں جو شوہر والیاں تھیں۔ ہمیں ان سے ہم بستر ہونے میں کراہت ہوئی تو ہم نے پیغمبر سے اس کے بارے میں پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی: "وَالمُحصَناتُ مِنَ النِّساءِ إِلّا ما مَلَكَت أَيمانُكُم۔۔۔" (اور شوہر والی عورتیں بھی مگر وہ تمہارے قبضے میں آ جائیں)، چنانچہ ہمارا اُن پر تصرف حلال ہو گیا۔

لیکن سورت النِّسَاء کی اُسی آیت 24 میں جو عورتوں کے حقوق کے علاوہ اُن وقتوں کی مذموم اور رائج رسم کی طرف اشارہ کرتی ہے، فرمایا جاتا ہے: "اُس کے علاوہ جو تم پر حرام ٹھہرایا گیا ہے تم مہر ادا کر کے اُن عورتوں سے متمتع ہو سکتے ہو۔ اس کے بغیر تم زنا کے مرتکب ہو گے۔ اس تمتع کی شرط یہ ہے کہ مرد انہیں اجر دے یا مہر جس پر فریقین راضی ہوئے ہیں"۔ یہی وہ آیت ہے جس سے اسلام میں متعہ یا عارضی شادی کا جواز پیدا ہوتا ہے لیکن سنی علماء کے نزدیک "جس عورت کے ساتھ تمتع کرو، اُسے اُس کا اجر دو" والی آیت فتح مکّہ کے موقع پر نازل ہوئی اور یہ صرف تین دن کے لیے مؤثر تھی اور اس کے بعد منسوخ ہو گئی۔ وہ "اُجُورَھُنَّ" کے لفظ سے اپنے موقف کی دلیل لاتے ہیں جس کا مطلب اُن کے نزدیک مہر نہیں بلکہ "انہیں اجر دو" ہے۔ لیکن شیعہ اس قسم کے شادی کو جائز سمجھتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اور آیت ہے جس سے ہمیں اُن وقتوں کے سماجی نظام سے آگاہی ہوتی ہے اور ہمیں اُس نظام میں مرد و زن کے مالی معاملات کے حوالے سے آپس کے تعلقات سے واقفیت بہم پہنچاتی ہے۔ سورت المُمتَحنَۃ کی آیت 10 میں فرمایا گیا ہے:

اِذا جاءَ کُمُ المُؤمِناتِ مُھاجِراتٍ۔۔۔فَلاتَرجِعُوھُنَّ اِلیَ الکُفّارِ۔۔۔ وَآتُوھُم ما اَنفَقُوا وَلا جُناحَ عَلَیکُم اَن تَنکِحُوھُنَّ اِذا آتَیتُمُوھُنَّ اُجُورَھُنَّ وَلا تُمسِکُوا بِعِصَمِ الکَوافِرِ وَاسئَلُوا ما اَنفَقتُم وَلیَسئَلُوا ما اَنفَقُوا۔

(اگر کوئی عورت مسلمان ہو کر تمھاری طرف مہاجرت کرے تو اُس کا شوہر اُس پر حق نہیں رکھتا اور وہ اگر اپنی بیوی کا مطالبہ کرے تو اُسے عورت حوالے نہ کرو بلکہ اُس نے عورت پر جو خرچہ کیا ہے اُسے ادا کر دو۔ اسی طرح تمھاری کوئی عورت شرک پر آمادہ ہو کر مشرکین کے پاس واپس جانا چاہتی ہے تو اُسے پاس رکھنے پر اصرار نہ کرو۔ (مبادا وہ ففتھ کالمسٹ کا کردار ادا کرے) بلکہ اس کے عوض اُس سے اُس خرچے کا مطالبہ کرو جو تم نے اُس پر خرچ کیا ہے)۔

سورت البقَرَۃ میں آیت 231 کی طرح کی ایسی آیات ہیں جو حضور کی انسانیت اور انصاف پسندی سے آگاہ کرتی ہیں جہاں وہ عربوں کی عورتوں سے بدسلوکی سے منع کرتے ہیں، جیسے آیت 231:

وَإِذا طَلَّقتُمُ النِّساءَ فَبَلَغنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمسِكوهُنَّ بِمَعروفٍ أَو سَرِّحوهُنَّ بِمَعروفٍ وَلا تُمسِكوهُنَّ ضِرارًا لِتَعتَدوا

(اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے، تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو محض ستانے کی خاطر اُنھیں نہ روکے رکھنا)۔

اسی طرح کی آیت 232 ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جب مرد عورت کو طلاق دے چکے اور اُن کی عدت کے دن پورے ہو جائیں تو اُنھیں اپنے خاوندوں سے دوبارہ شادی کرنے سے مت روکو۔ یہ آیت معقل بن یسیار کے غصے اور شدید رویے کے متعلق نازل ہوئی تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی بہن دوبارہ اپنے شوہر سے نکاح کرے۔[130]

وَإِذا طَلَّقتُمُ النِّساءَ فَبَلَغنَ أَجَلَهُنَّ فَلا تَعضُلوهُنَّ أَن يَنكِحنَ أَزواجَهُنَّ إِذا تَراضَوا بَينَهُم بِالمَعروفِ

(اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پس وہ اپنی عدت تمام کر چکیں تو اب اُنھیں اپنے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق راضی ہو جائیں)۔

130: امام حسن بصری روایت کرتے ہیں کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی لیکن جب عدت گزر گئی اور طلاق بائن ہو گئی تو اُنھوں نے پھر ان کے لیے پیغام نکاح بھیجا۔ معقل رضی اللہ عنہ نے اس پر انکار کیا، مگر عورت چاہتی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی "فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن" کہ تم اُنھیں اس سے مت روکو کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کریں۔ (صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن)۔

اسی سورت میں ہمارا واسطہ ایک اور موضوع سے بھی پڑتا ہے گو اس کا موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ اس حوالے سے اہم ہے کہ اس سے پیغمبر کے زمانے کے سماجی حالات سے ہمیں واقفیت ہوتی ہے اور اس سے وہ موضوعات بھی بخوبی واضح ہوتے ہیں جن سے حضور کا سامنا ہوتا تھا۔

سورت البَقَرَة کی آیت 222 میں ایام حیض اور حیض سے پاک ہونے کے بعد عورت کے قریب آنے کے متعلق ہے۔ اس سے آگے یہ عبارت درج ہے: "فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ" (تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے) تفسیر جلالین کے مطابق اس سے مراد اسی جانب سے ہے جہاں حیض کی وجہ سے جانے سے روکا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد والی آیت 223 میں جو بات کہی گئی ہے وہ کُلی طور پر صرف نئی ہی نہیں بلکہ پہلے والے مفہوم کے تقریباً اُلٹ ہے۔ فرمایا گیا ہے:

نِساؤُکُم حَرثٌ لکُم فَأتُوا حرَثَکُم اَنّیٰ شِئتُم۔ (تمھاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں پس تم اپنی کھیتیوں میں جیسے چاہو آؤ)۔

جلالین نے "اَنّیٰ شِئتُم" (ہر طرف سے آؤ) والے جملے کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: "مَن قیامٍ وَقُعُود وَاضطِجاعٍ وَاِقبالٍ اِدبار" (بیٹھے ہوئے، کھڑے ہوئے، لیٹے ہوئے، آگے سے، پیچھے سے)۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا مقصد یہودیوں کے اس عقیدے کو رد کرنا تھا جس کے مطابق اگر عورت کے پیچھے سے جائیں تو پیدا ہونے والا بچہ بھینگا یا کھبّا ہو گا۔

جلال الدین السیوطی کا کہنا ہے آیت 222 واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ اپنی عورتوں کے نزدیک اُسی طرف سے آؤ جس طرف اللہ نے فرمایا ہے۔ لیکن عمر اور چند دیگر صحابیوں کے اعتراض کی وجہ سے آیت 223 نے آیت 222 کو منسوخ کر دیا۔ دیگر اہل کتاب بھی اپنی بیویوں کے ساتھ یوں ہی سوتے تھے اور یہی طریقہ انصار کو بھی پسند تھا کیونکہ اس سے عورت کے اعضا کا پردہ اور ستر قائم رہتا ہے۔ لیکن مہاجرین اہل قریش اور مکّہ کے لوگوں کی طرح مختلف طریقے استعمال کرتے تھے۔ اور عورت کو

ہر جانب الٹ پلٹ کر مزہ لیتے تھے۔ اس کے لیے وہ اُنھیں پشت کے بل لٹاتے، پیٹ کے بل لٹاتے، یا سامنے سے یا پیچھے سے یا دونوں طرف سے آتے تھے۔

ایک مہاجر نے ایک انصاری عورت سے شادی کی اور وہ اسی طریقے کو استعمال کرنا چاہ رہا تھا تو انصاری عورت نے کہا۔ ہم ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹیں گے۔ یہ معاملہ حضور تک پہنچا تو اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی: "تمھاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں پس تم اپنی کھیتیوں میں جیسے چاہو آؤ"۔

احمد بن حنبل اور ترمذی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ عمر ایک صبح حضور کے پاس آئے اور کہا: "یا رسول اللہ ھلکت" "میں ہلاک ہو گیا یعنی مجھ سے کفر ہو گیا۔ حضور نے پوچھا: "ما اھلکت یا عمر؟" (اے عمر، تو کیسے ہلاک ہوا)۔ عمر نے عرض کیا: "رحلی اللیلۃ فلم یرد علیہ شیئاً" (میں کام سر انجام دینا چاہتا تھا لیکن نہیں ہو سکا)۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور "اَنّی شِئتُم" کی معنی یہ ہیں: "مقبلات، مدبرات و مستلقیات" (پشت کے بل لیٹے یعنی سامنے سے، پیچھے سے ٹانگیں کھولنا اور پیٹ پر لیٹنا)۔

قرآن کی کئی آیات اور اسلامی تعلیمات میں عرب معاشرے میں عورتوں کی زبوں حالی اور مردوں کے اُن کے ساتھ غیر انسانی سلوک کا واضح اظہار ملتا ہے۔ مثلاً سورت النّور کی آیت 35 میں پیغمبر حکم دیتے ہیں کہ اپنی زر خرید عورتوں کو پیسوں کی خاطر زنا پر مجبور مت کرو۔

لاتُکرِھُوا فَتَیاتِکُم عَلَی البِغاءِ اِن اَرَدنَ تَحَصُّناً لِّتَبتَغُوا عَرَضَ الحَیٰاۃ الدُّنیا۔ (تمھاری لونڈیاں جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں اُنھیں دنیا کی زندگی کے فائدہ کی غرض سے زنا پر مجبور نہ کرو)۔

کہتے ہیں کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی کے متعلق نازل ہوئی اور ثبوت موجود ہیں کہ اس نفرت انگیز کام میں صرف عبد اللہ بن ابی ہی ملوث نہ تھا بلکہ یہ مال کمانے کا ایک ذریعہ تھا جس میں لوگ اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرتے تھے اور اُن کی کمائی اپنی جیب میں ڈالتے تھے۔ چنانچہ فتح مکّہ کے بعد بہت زیادہ عورتیں

بیعت کرنے اور اسلام قبول کرنے کی خاطر پیغمبر کے حضور پہنچیں تو اُن کے اسلام قبول کرنے کے حوالے سے شرط کے پر سورت المُمتحَنَة کی آیت 12 نازل ہوئی:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ ۔

(اے پیغمبر! جب تمھارے پاس مؤمن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ شرک کریں گی نہ چوری کریں گی نہ بدکاری کریں گی نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی اور نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو اُن سے بیعت لے لو)۔

اسلام قبول کرنے کے لیے یہ شرائط جن کا ذکر ہوا ہے، خاصی دلچسپ ہیں:

تم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گی، چوری نہیں کرو گی، زنا کا ارتکاب نہیں کرو گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گی، بچوں کی ولدیت کے حوالے سے بہتان نہیں باندھو گی۔ اچھے کام کرو گی، اور ناپسندیدہ عادات جیسے نوحہ خوانی، گریبان کھلا رکھنا، بالوں کی تراش اور چہرے کی سجاوٹ ترک کر دو گی، اگر قبول ہے تو تب اسلام قبول کرو۔

کہتے ہیں کہ جب ابو سفیان کی بیوی یعنی معاویہ کی ماں ہند بنت عتبہ بیعت کے لیے آئی اور اسے زنا نہ کرنے کی شرط سنائی گئی تو اُس نے جواب میں کہا: ”شریف اور آزاد عورتیں اس قسم کے کام نہیں کرتیں“، اور عمر جو اُس وقت وہاں موجود تھے، وہ ہنسنے لگے[131]۔

ایک اور نفرت انگیز رسم جس سے اسلام نے منع کیا ہے وہ نومولود بچیوں کا قتل ہے جس کا ذکر قران میں یوں آیا ہے: ”بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَت“ (وہ کس گناہ پر ماری گئی: التّکویر۔9)۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب بیٹیوں کو باعث شرم سمجھتے تھے اور بیٹوں کے خواہشمند تھے اور اُن پر فخر کرتے تھے اور اپنی کم عقلی کی وجہ سے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اگر یوں ہو گیا کہ بیٹیاں دنیا میں آنا بند ہو گئیں تو نسل انسانی ختم ہو جائے گی۔

سورت النّحل کی آیت 58 اور 59 میں اس بُری عادت کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا گیا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ كَظِيۡمٌ ۔ يَتَوَارٰى مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمۡسِكُهٗ عَلٰى هُوۡنٍ اَمۡ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ۔

(اور جب ان میں سے کسی کی بیٹی کی خوشخبری دی جائے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غمگین ہوتا ہے۔ اس خوش خبری کی برائی باعث لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے آیا اسے ذلت قبول کر کے رہنے دے یا اس کو مٹی میں دفن کر دے)۔

131: اس پیراگراف سے یہ تصور ابھرتا ہے گویا عمر زنانہ کرنے کی بات پر ہنسے تھے۔ جب کہ اکثر کتابوں میں یوں درج ہے کہ جب حضور نے اپنے ”بچوں کو قتل نہیں کرو گی“ کے الفاظ کہے تو ہند نے جواب میں کہا، کہ ہم نے تو بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا اور تم نے بدر کے مقام پر اُنھیں قتل کر دیا اور اب ہمیں نصیحتیں کر رہے ہو کہ اپنے بچوں کو قتل نہیں کرو گی۔ یہ بات سن کر عمر اس قدر ہنسے کہ بے حال ہو گئے۔

عورت اور پیغمبر

اِگناز گولڈ زیہر کے مطابق دنیا کے کسی بھی مذہبی ادب میں ہمیں وضاحت، ترتیب اور تفصیل کی وہ نظیر نہیں ملتی جس قدر جزئیات ہمیں پیغمبر اسلام کی زندگی کے بارے میں ملتی ہیں۔ پیغمبر کی زندگی کا جو تجزیہ اور توصیف ہمیں احادیث اور سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے اس کا موازنہ دنیا کے کسی دوسرے مذہب کے بانی سے نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ستائش آمیز بیان اُس کی کتاب Le dogma et la loi de 1'1slam (اسلام میں عقیدہ اور شریعت) میں رسول اکرم کی عورتوں کے سلسلے میں روز افزوں چاہت کی مناسبت سے آیا ہے جسے اُس نے ایک تاریخی حقیقت قرار دیا ہے اور اس کے اثبات کے لیے اُس نے تاریخی اسناد کا سہارا لیا ہے۔

نوح اور ابراہیم تو ایک طرف، ہمیں تو موسیٰ و عیسیٰ کی زندگیوں کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں چلتا، جو قومی اور نسلی تعصب کی وجہ سے مبالغہ آمیز داستانوں کے گرد و غبار کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن محمد کی زندگی سے متعلق سینکڑوں آیات، معتبر احادیث اور سیرت کی کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں، جو اُن کی رحلت کے قریب لکھی گئیں اور ایسی روایات بھی ملتی ہیں جو تعصب کے نتیجے میں ابھی تک مسخ نہیں ہو پائی تھیں۔ اُن میں سے اہم ترین قرآنی آیات اور اُن کی وہ شان نزول ہے جو مفسرین نے بیان کی ہے جن سے ہمیں اُن وقتوں کے واقعات اور حوادث کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ اس موضوع پر بہت زیادہ آیات ہیں اور سورت النِّسَاء کی آیت 54 پر تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس کی شان نزول رسول اکرم کی عورتوں سے چاہت کی وجہ سے ایک یہودی کا دیا گیا وہ طعنہ ہے جس میں کہا گیا تھا کہ محمد کو عورتیں حاصل کرنے کے علاوہ کیا اور کوئی کام نہیں ہے؟۔

اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا۔

(یا لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ نے اُنھیں اپنے فضل سے دیا تو ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور اُنھیں بڑا ملک دیا)۔

اس آیت میں داؤد اور اُس کے بیٹے سلیمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ داؤد کی 99 بیویاں تھیں اور سلیمان کے حرم میں ایک ہزار آزاد اور غلام عورتیں تھیں۔ اور اس کے باوجود اُن کی پیغمبری کے مرتبے میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

البتہ خود یہ بات بھی بنو اسرائیل کے بادشاہوں کی دوسری کہانیوں کی مانند مبالغے اور افسانہ طرازی سے مزین ہے۔

مغربی ناقدین کے مطابق عورتوں کی اس قدر چاہت ایک انسان کے روحانی مقام سے میل نہیں کھاتی جو زہد اور قناعت کی تلقین کرتا تھا۔ بلکہ اُن کے نزدیک اسلامی شریعت میں عورتوں کے حقوق اور سماجی درجہ بلند کرنے کے پیچھے بھی محمد کی عورتوں سے ذاتی رغبت تھی۔

اگر اس مسئلے کو جذباتی طور پر نہیں بلکہ صرف منطقی انداز میں بھی پرکھا جائے تو ناقدین کے کئی اعتراضات اپنا وزن کھو دیتے ہیں۔ محمد انسان تھے اور انسان کمزوریوں سے مبراء نہیں ہوتے۔ جنسی رجحان انسانی جبلت کا حصہ ہے۔ اور اِنھیں تب ہی موضوع بحث بنانا چاہیے جب کسی انسان کے افکار یا کردار سے دوسرے لوگ متاثر ہوں۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کسی انسان کا کردار تب ہی قابل اعتراض ہے جب وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ ہو وگرنہ کسی انسان کی ذاتی خوبی یا خامی، مضبوط یا کمزور پہلو کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی کہ اسے زیر بحث لایا جائے۔

سقراط کی فکر سے ایتھنز، ایتھنز سے یونان اور یونان سے پورا جہان منور ہوا تھا۔ اگر اپنی ذاتی زندگی میں اُس کا کوئی خاص رجحان یا ایسی کمزوری تھی جس سے دوسروں کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں تھا تو ایسی کمزوری موضوع بحث نہیں بنی چاہیے۔ ہٹلر میں جنسی رویوں کے حوالے سے کوئی کمزوری نہیں تھی اور نہ ہی طبیعت میں سرکشی تھی تو کیا اُسے ایک پاکیزہ انسان قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ اُس کے افکار ایسے خطرناک تھے جس نے دنیا کو خون اور آگ میں نہلا دیا۔

محمد نے اپنے آپ کو ایک ایسا انسان کہا جس نے خدا کے آگے اپنا سر جھکایا اور چاہا کہ دوسرے لوگ بھی بتوں کی پرستش کی بدی سے نجات پائیں۔ عورتوں کی طرف اُن کے جھکاؤ اور زیادہ بیویوں سے نہ اُن کی دعوت دین کو نقصان پہنچا اور نہ ہی اس سے دوسروں کی حق تلفی ہوئی تھی۔ معاشروں کے بڑے لوگوں کے افکار و اعمال کو اس زاویے سے نہیں جانچا جانا چاہیے۔ بلکہ معاشرے اور انسانیت کی بھلائی کے حوالے سے اُن کے کردار کو پرکھا جانا چاہیے۔ اور اس پیمانے سے دوسرے لوگوں کے فکر اور عقیدہ کے حق کو سلب کرنا، اور اُنھیں اسلام قبول کرنے یا ذلیل ہو کر جزیہ دینے میں سے ایک کو قبول کرنے پر مجبور کرنا زیادہ قابل بحث ہے۔

دوسری جانب مسلمانوں نے ایک اور غلط راہ اختیار کی ہے کہ اُنھوں نے بانی اسلام کی شان میں اضافہ کرنے کی خاطر ایسی چیزیں کہی اور لکھی ہیں جو قرآنی آیات اور اسلام کے آغاز کی مسلّم روایات سے متصادم ہیں۔ حتیٰ کہ محمد حسین ہیکل جیسے عالم نے جنہوں نے "حیاۃ محمد" نامی کتاب لکھی ہے، کوشش کی ہے کہ بیسیوں صدی کے واضح اور موزوں افکار و دلائل سے اس قضیے کو تہہ و بالا کر دیں۔ اُنھوں نے مغربی ناقدین کی تنقید پر ناراضگی کا اظہار کرتے حضور کا دفاع کیا ہے اور حضور کی عورتوں کی چاہت کو مکمل طور پر رد میں یوں لکھا ہے:

”محمد نے خدیجہ کے ساتھ 28 سال بسر کیے اور دوسری عورت کی ہوس نہیں کی۔۔۔۔۔۔۔یہ ایک قدرتی بات تھی اور اس کے علاوہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ امیر اور معزز خدیجہ نے، ایک غریب، سنجیدہ اور ایماندار انسان جو اُن کا ملازم تھا، کو شوہر کے طور پر چنا اور اُسے گھر داماد کے طور پر اپنے ہاں رکھا۔ چونکہ وہ جبلی طور پر یا اپنے زندگی کے مصائب کی وجہ سے قریش کے دوسرے جوانوں جیسی برائیوں و عادات سے مبراء تھا۔ اس لیے پختہ و تجربہ کار خدیجہ نے اپنی عمر سے پندرہ سال چھوٹے شوہر کی مالی طور پر امداد اور سرپرستی کی اور اپنی دولت سے اُسے خوشحالی فراہم کی تاکہ وہ بچپن کے مصائب اور چچا کے گھر کی محتاجی کو بھول جائے۔

خدیجہ کے گھر کی نعمتوں اور آسودگی نے اُنھیں موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے اُن خیالات پر زیادہ کام کر سکیں جو پچھلے دس بارہ سال سے اُن کے دماغ میں پل رہے تھے۔ یقینی بات ہے کہ خدیجہ نے بھی اپنے پرہیزگارانہ تصورات و افکار سے اُن کی راہنمائی کی ہوگی، کیوں کہ ورقہ بن نوفل کی چچازاد بہن ہونے کی وجہ سے قدرتی طور اُن کا جھکاؤ حنفاء کی طرف تھا۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے بعثت سے پہلے کے حضور کے سچے خوابوں کو اللہ کی طرف سے وحی جانا اور حضور پر سب سے پہلے ایمان لائیں۔ اس کے علاوہ وہ حضور کی چار بیٹیوں زینب، رقیہ، اُمّ کلثوم اور فاطمہ کی ماں تھیں[132]۔

ایسے حالات یا صورت حال کے ہوتے ہوئے محمد کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خدیجہ کی موجودگی میں دوسری بیوی گھر لے آتے۔ اسی وجہ سے خدیجہ کی وفات کے بعد اُنھوں نے عائشہ کا ہاتھ مانگا، اور عائشہ

132: زینب کی شادی اپنے خالہ زاد ابو العاص بن ربیع سے ہوئی۔ رقیہ اور ام کلثوم پہلے ابو لہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کی بیویاں تھیں۔ ابو لہب کے کہنے پر عتبہ اور عتیبہ نے اُنھیں طلاق دے دی۔ عثمان بن عفان نے دونوں بہنوں سے یکے بعد دیگرے شادی کی۔ اہل تشیع کے مطابق خدیجہ سے حضور کی واحد اولاد فاطمہ تھیں، زینب، رقیہ اور ام کلثوم، خدیجہ کی حضور سے پہلے کے شوہروں سے پیدا ہوئیں۔

چونکہ ابھی چھوٹی تھیں اور اُن کی عمر ابھی سات سال سے زیادہ نہیں تھی چنانچہ اُنھوں نے سکران بن عمرو کی بیوہ سودہ بنت زمعہ سے شادی کر لی"۔

محمد حسین ہیکل اس موضوع پر یوں لکھتے ہیں گویا وہ چاہ رہے ہیں کہ عورتوں کی رغبت سے محمد کو بری الذمہ قرار دیں۔ وہ کہتے ہیں: "سودہ کے پاس نہ جمال تھا اور نہ مال۔ اُس کے ساتھ شادی کا اصل مقصد حبشہ کی بغیر سرپرست والی عورت پر نیکی اور نوازش کرنا تھا"۔

کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہیکل یوں لکھتے۔ خانہ داری اور چار بچیوں کی سرپرستی کے لیے سودہ جیسی بالغ خاتون کی ضرورت تھی۔ لیکن ایسی صورت میں ممکن ہے یہ اعتراض جڑ دیا جائے کہ محمد نے پہلے عائشہ کی طرف دھیان دیا لیکن چونکہ وہ ابھی کم عمر بچی تھیں تو اُن سے شادی دو سے تین سال تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ چونکہ ایک عورت کے بغیر زندگی نہیں گزاری جاسکتی تھی، چنانچہ سودہ سے شادی کی لی گئی اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ کوئی دوسری عورت شادی کے لیے دستیاب بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ قریش اپنی بیٹی محمد کو دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور شائد مسلمانوں میں بھی کوئی ایسی لڑکی یا عورت نہیں تھی جس سے محمد شادی کرتے، چنانچہ اُنھوں نے سودہ پر اکتفا کر لیا۔ یہ وہ تھوڑا سا عرصہ تھا جو خدیجہ کے مرنے کے بعد اُنھوں نے مکّہ میں گزارا تھا۔ لیکن مدینہ ہجرت کے بعد اور خصوصی طور پر جب اُن کے پاس امکانات بڑھ گئے تو رسول کریم کی عورتوں کی طرف بے انتہا چاہت واضح انداز میں دیکھی جاسکتی ہے جس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ اُن کی بیویوں کی تعداد کا مختصر جائزہ اور فہرست پیش کرنا اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہو گا۔

1: خدیجہ بنت خویلد: ایک ممتاز اور امیر خاتون، محمد اُن کے تیسرے شوہر تھے۔ جن کے بطن سے چار بیٹیاں اور قاسم و طاہر نامی دو بیٹے پیدا ہوئے جو زندہ نہ رہے۔

2: سودہ بنت زمعہ: سکران بن عمرو کی بیوہ تھیں جو حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں سے ایک تھا اور وہیں انتقال ہوا۔ محمد حسین ہیکل کے خیالات کے مطابق محمد نے اُن کے ساتھ رحم کھا کر شادی کی کہ ایک مسلمان خاتون تنہا اور بغیر خاوند کے نہ ہو۔

3: عائشہ بنت ابو بکر: سات سال کی عمر میں منگنی ہوئی اور نو سال کی عمر میں پیغمبر کی زوجیت میں آئیں تب دونوں کی عمروں میں چالیس سال سے زیادہ کا فرق تھا[133]۔ حضور کی رحلت کے وقت اُن کی عمر سولہ سترہ سال تھی اور محمد کی سب سے چہیتی بیوی تھیں۔ حفاظ قرآن میں سے ایک ہونے کے علاوہ عائشہ کو حدیث و سنت کا اہم منبع شمار کیا جاتا ہے۔ عثمان کے قتل کے بعد وہ علی بن ابو طالب کی خلافت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں جو جنگ جمل پر منتج ہوا۔

4: اُمّ سلمہ: ان کا نام ہند بنت ابی امیہ تھا۔ عبد اللہ بن عبد الاسد مخزومی نامی صحابی کی بیوہ تھیں جو جنگ احد میں ایک کاری زخم لگنے کی وجہ سے مارا گیا تھا۔

5: حفصہ بنت عمر: جنگ احد میں بیوہ ہونے کے بعد حضور کے حرم کا حصہ بنیں۔ اس شادی کو سیاست اور مصلحت کے تحت کی گئی شادیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

6: زینب بنت جحش: پہلے حضور کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ کی بیوی تھیں۔ زینب سے پیغمبر کی شادی کو پیغمبر کی عشقیہ داستانوں میں سے ایک قرار دیا جا سکتا ہے۔ زید اور زینب کے متعلق منظوم داستان بھی لکھی گئی تھی۔ حضور زینب سے اس قدر مہربانی، عنایت اور محبت سے پیش آتے تھے کہ عائشہ اُنھیں اپنا رقیب گردانتی تھیں۔

133: نکاح کے وقت حضور کی عمر 53 سال تھی اور عائشہ 9 سال کی تھیں۔ حضور کی بیویوں میں سے وہ واحد خاتون تھیں جو باکرہ تھیں۔ باقی سب بیوہ یا غیر باکرہ تھیں۔ عائشہ کا انتقال 678ء میں ہوا، اور وہ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

7: جویریہ بنت حارث: بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابو ضرار کی بیٹی، مسافع بن صفوان کی بیوی اور ایک باوقار اور صاحب کمال عورت تھیں۔ چھٹی ہجری میں بنو مصطلق پر حملے کے نتیجے میں مالِ غنیمت کی صورت میں قیدی بن کر ایک مسلمان کے ہاتھ لگیں۔ اُن کے مالک نے آزاد کرنے کے بدلے صفیہ سے اس قدر فدیہ طلب کیا جس کی ادائیگی سے صفیہ نے عاجزی کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ حضور کے سامنے پیش ہوئیں کہ وہ فدیہ کم کرنے کی سفارش کریں۔ عائشہ کہتی ہیں: "جویریہ خوبصورت اور دلکش تھی۔ اُسے جو بھی دیکھتا اُس پر فدا ہو جاتا۔ جس وقت وہ میرے حجرے میں آئی تو میں بے حد فکر مند ہوئی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جب رسول اللہ اُسے دیکھیں گے تو اُس کے دیوانے ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا"۔ چنانچہ صفیہ رسول اللہ کے حضور پیش ہوئی اور اپنی حاجت بیان کی۔ حضور نے فرمایا کہ میرے پاس اس مسئلے کا بہتر حل ہے، میں خود تمھارا فدیہ ادا کر دیتا ہوں اور تمھیں اپنی بیوی بنا لیتا ہوں۔ جویریہ نے خوشی سے یہ پیشکش قبول کر لی اور بیوی بن گئیں۔ چونکہ محمد اب بنو مصطلق کے داماد بن چکے تھے لہٰذا مسلمانوں نے بہت زیادہ قیدیوں کو رہا کر دیا۔ عائشہ کہتی ہیں: "مجھے نہیں لگتا کہ کوئی عورت اپنے لوگوں کے لیے اس قدر خیر و برکت کا باعث ہو سکتی ہے"۔[134]

134: ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ام المؤمنین جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا ثابت بن قیس یا اُن کے چچازاد بھائی کے حصہ میں آئیں تو جویریہ نے اُن سے مکاتبت کر لی، اور وہ ایک خوبصورت عورت تھیں جسے ہر شخص دیکھنے لگتا تھا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بدل کتابت میں تعاون مانگنے کے لیے آئیں، جب وہ دروازہ پر آکر کھڑی ہوئیں تو میری نگاہ ان پر پڑی مجھے اُن کا آنا اچھا نہ لگا اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ عنقریب آپ بھی ان کی وہی ملاحت دیکھیں گے جو میں نے دیکھی ہے، اتنے میں وہ بولیں: اللہ کے رسول! میں جویریہ بنت حارث ہوں، میرا جو حال تھا وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ثابت بن قیس کے حصہ میں گئی ہوں، میں نے اُن سے مکاتبت کر لی ہے، اور آپ کے پاس اپنے بدل کتابت میں تعاون مانگنے آئی ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم اس سے بہتر کی رغبت رکھتی ہو؟" وہ بولیں: وہ کیا ہے؟ اللہ کے رسول!۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تمہارا بدل کتابت ادا کر دیتا ہوں اور تم سے شادی کر لیتا ہوں" وہ بولیں: میں کر چکی (یعنی مجھے یہ بخوشی منظور ہے)۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: پھر جب لوگوں نے ایک دوسرے سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جویریہ سے شادی کر لی ہے تو بنی مصطلق کے جتنے قیدی اُن کے ہاتھوں میں تھے سب کو چھوڑ دیا اُنھیں آزاد کر دیا، اور کہنے لگے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال والے ہیں، ہم نے کوئی عورت اتنی

8:اُمّ حبیبہ: ابو سفیان کی بیٹی اور عبید اللہ بن جحش کی بیوہ تھیں۔ عبید اللہ نے حبشہ ہجرت کی اور وہیں مر گیا[135]۔

9:صفیہ بنت حیی: (حیی بن اخطب نامی یہودی عالم کی بیٹی) کنانہ بن ربیع کی بیوی تھیں، جو خیبر کے سرداروں میں سے تھا۔ پیغمبر نے قیدیوں میں سے ان کا انتخاب کیا اور جس روز خیبر سے مدینہ واپسی فرمائی اُسی رات صفیّہ سے ہم بستر ہوئے[136]۔

10: میمونہ بنت حارث الہلالیہ: ان کی ایک بہن ابو سفیان اور دوسری بہن عباس بن عبد المطلب کی بیوی تھیں۔ میمونہ خالد بن ولید کی خالہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس شادی کے بعد خالد نے اسلام قبول کیا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ پیغمبر نے اُنھیں چند گھوڑے عطا کیے۔

11:فاطمہ بنت سریح

12:ہند بنت یزید

13:اسماء بنت سیاء

برکت والی نہیں دیکھی جس کی وجہ سے اس کی قوم کو اتنا زبردست فائدہ ہوا ہو، اُن کی وجہ سے بنی مصطلق کے سو قیدی آزاد ہوئے۔ (سنن ابی داوٗد، کتاب العِتق)۔

135:ام حبیبہ کا نام رملہ بنت ابو سفیان تھا۔ بنو امیہ کے پہلے خلیفہ معاویہ کی بہن تھیں۔

136:رات کو آپ اُترے اور خیمے میں داخل ہوئے، وہ بھی اُن کے ساتھ داخل ہوئیں۔ وہ خیمے میں اپنا سر رکھ کر سو گئے۔ رسول اللہ کو صبح ہوئی تو آپ نے حرکت (آہٹ سنی، فرمایا) کون ہے؟۔ اُنھوں نے فرمایا: "ابو ایوب ہوں"۔ آپ نے فرمایا "تمھارا کیا کام ہے؟"۔ اُنھوں نے کہا" "یا رسول اللہ! جوان لڑکی جن کی نئی شادی ہوئی ہے اور آپ نے اُن کے شوہر کے ساتھ جو کیا سو کیا۔ اس لیے میں اُن سے بے خوف نہ تھا، میں نے کہا کہ اگر وہ جنبش کریں تو میں آپ کے قریب رہوں گا۔ رسول اللہ نے فرمایا: "اے ابو ایوب! خدا تم پر رحمت کرے"۔ (طبقات ابن سعد)۔

14: زینب بنت خزیمہ

15: ہبلہ بنت قیس: اشعث بن قیس کی بہن[137]۔

16: اسماء بنت نعمان: ان سے نکاح تو کیا لیکن ہم بستر نہیں ہوئے

17: فاطمہ بنت ضحّاک: ان سے نکاح تو کیا لیکن ہم بستر نہیں ہوئے

18: ماریہ قبطیہ: کو مصر سے تحفے کے طور پر بھیجا گیا۔ جس کے بطن سے ابراہیم پیدا ہوا جو بچپن ہی مر گیا۔

137: غالباً یہاں کتابت کی غلطی ہوئی ہے قتیلہ کی بجائے ہبلہ لکھا گیا ہے۔ پس منظر کچھ یوں ہے: "ابو اسید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلے اور ایک باغ میں پہنچے جس کا نام "شوط" تھا۔ جب وہاں جاکر اور باغوں کے درمیان پہنچے تو بیٹھ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ یہیں بیٹھو، پھر باغ میں گئے، جونیہ لائی جا چکی تھیں اور اُنھیں کھجور کے ایک گھر میں اتارا۔ اس کا نام امیمہ بنت نعمان بن شراحیل تھا (یہ وہی خاتون ہیں جن کا نام 16 نمبر پر اسماء بنت نعمان لکھا ہوا ہے۔ قتیلہ کا ذکر نیچے ہے)۔ اُن کے ساتھ ایک دایہ بھی اُن کی دیکھ بھال کے لیے تھی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس گئے تو فرمایا کہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے۔ اس نے کہا کیا کوئی شہزادی کسی عام آدمی کے لیے اپنے آپ کو حوالہ کر سکتی ہے؟ بیان کیا کہ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا شفقت کا ہاتھ ان کی طرف بڑھا کر اس کے سر پر رکھا تو اس نے کہا کہ میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اسی سے پناہ مانگی جس سے پناہ مانگی جاتی ہے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ ابو اسید! اسے دو رازقیہ کپڑے پہنا کر اسے اس کے گھر پہنچا آؤ"۔ (صحیح بخاری، کِتَاب الطَّلَاقِ)۔

قتیلہ کا واقعہ یہ ہے: "ابن عباس رضی اللہ کا بیان ہے۔ کہ جب اُس خاتون نے پناہ مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے ناراض ہو کر چلے آئے۔ تو اشعث نے کہا یا رسول رنجیدہ نہ ہوں، میرے پاس اس سے زیادہ خوب صورت عورت ہے، چنانچہ اُس نے اپنی بہن کا نکاح قتیلہ کا نکاح آپ سے کر دیا"۔ حضور کی وفات کے بعد قتیلہ مرتد ہو گئی اور عکرمہ بن ابو جہل سے شادی کر لی۔ ابو بکر قتیلہ کا سر قلم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن عمر بن خطاب کے کہنے پر باز رہے، کیونکہ قتیلہ نکاح کے بعد رخصت نہیں ہوئی تھی۔ اور اپنے بھائی سمیت مرتد ہو گئی تھی۔۔ (بحوالہ: البدایہ والنہایہ، ابن کثیر)۔

19: ریحانہ: قرانی اصطلاح "مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" کے مطابق ماریہ قبطیہ کی مانند ایک کنیز تھی۔ ان دونوں کے ساتھ ہم بستری کے لیے کسی قسم کے رسمی قبول و ایجاب کی ضرورت نہیں تھی۔ بنو قریظہ پر حملے کے دوران قیدی بن پیغمبر کے حصے میں آئی لیکن اس نے نہ تو اسلام قبول کیا اور نہ ہی محمد سے نکاح کرنے پر رضامند ہوئی، بلکہ پیغمبر کے گھر میں ایک کنیز کے طور پر زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔

20: **اُمّ شریک دوسیہ**: اُن چار خواتین میں سے تھیں جنھوں نے خود اپنے آپ کو پیغمبر کو ہبہ کیا تھا۔ وہ خواتین جن کا باقاعدہ نکاح ہوا تھا جس میں مہر، گواہان کی موجودگی اور ولی کی رضامندی جیسی رسوم ضروری تھی، اور وہ کنیزیں جو کسی کافر یا مشرک کی بیوی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے حلال ٹھہریں، اُن دونوں سے ہٹ کر یہ خاتون تیسرے زمرے میں آتی ہیں۔ پیغمبر کے حرم میں ایسی عورتیں تھیں جنھوں نے اپنے آپ کو پیغمبر کو ہبہ کر دیا تھا۔ باقی تین خواتین میمونہ، زینب اور خولہ تھیں۔[138]

138: تاریخ میں حضور کی چند اور شادیوں کا بھی ذکر ہے۔ جن میں ایک شادی ملیکہ بنت داؤد نامی خاتون سے بھی ہوئی تھی۔ "واقدی کے قول کے مطابق حضور نے ملیکہ بن داؤد اللیثیہ سے نکاح کیا۔ حضور کی کسی دوسری بیوی (عائشہ) نے اُس کے پاس جا کر اُسے غیرت دلائی کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو نے اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اس لیے اُس نے آپ سے پناہ مانگی۔ یہ خوب صورت اور جوان عورت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے جدا کر دیا۔ آپ نے اُس کے باپ کو مکّہ کی فتح میں قتل کرایا تھا۔ (تاریخ الرسل و الملوک)۔

تاریخ طبری میں شنباء بنت عمر الغفاریہ نامی خاتون کا بھی ذکر ہے جس سے حضور نے شادی فرمائی تھی۔ "یہ عورت بنو قریظہ سے تھی۔ بنو قریظہ کی ہلاکت کی وجہ سے اس کا نسب معلوم نہ ہو سکا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ کنانیہ تھی۔۔ جب رسول اللہ اُس کے پاس گئے تو حائضہ ہو گئی۔ اُنھی ایام میں قبل اس کے کہ وہ ظاہر ہو، ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ اگر محمد نبی برحق ہوتے تو اُن کا محبوب ترین فرزند نہ مر جاتا۔ یہ سُن کر آپ نے اُسے یہاں سے نکال دیا"۔

"حضرت سہل بن زید سے روایت ہے۔ رسول اللہ نے بنو غفار کی خاتون عمرہ بنت یزید سے شادی کی۔ آپ اُس کو گھر لائے تو معلوم ہوا کہ اُس کے سینے پر برص کا داغ ہے۔ رسول اللہ اُس سے علیحدہ ہو گئے اور صبح کو آپ نے فرمایا کہ اپنے خاندان میں چلی جاؤ۔ آپ نے اُسے کامل مہر ادا کیا"۔ (البدایہ والنہایہ)۔

اُمّ شریک کے پیغمبر کو یوں ہبہ کرنے پر عائشہ بہت پریشان ہوئیں کیونکہ اُمّ شریک انتہائی خوبصورت خاتون تھیں اور حضور نے اس پیشکش کو فوراً قبول کر لیا تھا۔ عائشہ نے غصے اور حسد سے کہا: "مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کوئی عورت اپنے آپ کو کسی مرد کے سپرد کر کے خود کو یوں بے وقعت کر سکتی ہے؟"۔ اسی حوالے سے سورت الأحزَاب کی سورت 50 کا آخری حصہ نازل ہوا جو اُمّ شریک کے عمل اور پیغمبر کی جانب سے قبول کر لینے کی تائید و تصدیق کے لیے خدا کی طرف سے نازل ہوا۔ آیت 50 کا آخری حصہ کچھ یوں ہے۔:

وَامرَأَةً مُؤمِنَةً اِن وَهَبَت نَفسَهَا لِلنَّبِیِّ اِن اَرَادَ النَّبِیُّ اَن یَستَنکِحَهَا خَالِصَةً لَکَ مِن دُونِ المُؤمِنِینَ۔

(اور اس مسلمان عورت کو بھی جو بلا عوض اپنے کو پیغمبر کو دے دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو نکاح میں لانا چاہے یہ خالص آپ کے لیے ہے نہ اور مسلمانوں کے لیے)۔

عائشہ نے جب یہ دیکھا تو بہت گستاخانہ انداز میں کہا: "إني لأرى ربك يسارع لك في هواك" (مجھے نظر آ رہا ہے کہ اللہ آپ کی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں بہت جلدی کرتا ہے)۔ [139]

عائشہ سے مروی ایک اور معتبر روایت کا شیخین (جلال الدین السیوطی، جلال الدین المحلی) حوالہ دیتے ہیں۔ کہ عائشہ اور پیغمبر کے درمیان یہ نزاع دوسری صورت میں پیش آیا تھا۔ جس کے مطابق آیت 50 نازل ہو چکی تھی اور اُنھیں جب اُمّ شریک کے واقعے سے آگاہی ہوئی تو اُنھوں نے غصے سے کہا تھا: "مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کوئی عورت اپنے آپ کو کسی مرد کے یوں سپرد کر کے خود کو بے وقعت کر سکتی

139: محمد بن سلام بیان کرتے ہیں۔ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا ان عورتوں میں سے تھیں جنھوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہبہ کیا تھا۔ اس پر عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ایک عورت اپنے آپ کو کسی مرد کے لیے ہبہ کرتے شرماتی نہیں۔ پھر جب آیت "ترجئ من تشاء منهن" (اے پیغمبر! تو اپنی جس بیوی کو چاہے پیچھے ڈال دے اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دے) نازل ہوئی تو میں نے کہا: یارسول اللہ! اب میں سمجھی اللہ تعالیٰ جلد جلد آپ کی خوشی کو پورا کرتا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب النکاح)۔

ہے ؟"۔ اُس وقت عائشہ کو تنبیہ کرنے کے لیے آیت 51 نازل ہوئی جس پر عائشہ نے وہ گستاخانہ جملہ ادا کیا تھا۔

سورت الأحزَاب کی آیت 50 جس میں پیغمبر کے عورتوں کے حوالے سے حقوق طے ہوئے، وہ کچھ یوں ہیں:

یا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنّآ اَحلَلنالک اَزواجَکَ اللاتی آتَیتَ اُجورَھُنَّ وَ ما مَلَکَت یَمینُکَ مِمّا اَفاءَ اللّٰہُ عَلَیکَ وَ بَناتِ عَمِّکَ وَ بَناتِ عَمّاتِکَ وَبَناتِ خالکَ وَ بَناتِ خالاتِکَ الاّتی ھاجَرنَ مَعَکَ وَ امرَاُۃ مُؤمِنَۃً اِن وَھَبَت نَفسَھا لِلنَّبِیِّ اِن اَرادَ النَّبِیُّ اَن یَستَنکِحَھا خالِصَۃً ککَ مِن دوُنِ المُؤمِنینَ قَد عَلِمنا ما فَرَضنا عَلَیھِم فی اَزواجِھِم وَما مَلَکَت اَیمانُھُم لِلیلا یَکُونَ عَلَیکَ حَرَجُ وَ کانَ اللّٰہُ غَفُوراً رَحیماً۔

(اے نبی! ہم نے تمھارے لیے حلال فرمائیں تمھاری وہ بیبیاں جن کو تم مہر دو اور تمھارے ہاتھ کا مال کنیزیں جو اللہ نے تمھیں غنیمت میں دیں اور تمھارے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی اور اس مسلمان عورت کو بھی جو بلا عوض اپنے کو پیغمبر کو دے دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو نکاح میں لانا چاہے یہ خالص آپ کے لیے ہے نہ اور مسلمانوں کے لیے ہمیں معلوم ہے جو کچھ ہم نے مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں مقرر کیا ہے تاکہ آپ پر کوئی دِقت نہ رہے اور اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے)۔

عائشہ کو اس آیت کے آخری حصے پر اعتراض تھا چنانچہ اُن کی تادیب کے لیے آیت 51 نازل ہوئی جہاں نہ صرف عورتوں کے حوالے سے پیغمبر کے اختیارات کی حدود کا تعین کیا گیا بلکہ اُنھیں اس سلسلے میں مطلق آزادی دے دی گئی اور عورتوں کو کسی بھی قسم کے دعوے یا تقاضے سے محروم کر دیا گیا۔ سورت الأحزَاب کی آیت 51 یوں ہے:

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا۔

(تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلالو اس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے اِس طرح زیادہ متوقع ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی، اور جو کچھ بھی تم اُن کو دوگے اس پر وہ سب راضی رہیں گی اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے، اور اللہ علیم و حلیم ہے)۔

زمخشری نے تفسیر الکشاف میں اس آیت کی شان نزول یوں بیان کی گئی ہے کہ پیغمبر کی بیویاں ایک دوسرے سے حسد کرتی تھیں اور پیغمبر سے زیادہ نفقہ کا مطالبہ کرتی تھیں[140]۔ عائشہ کی ایک روایت کے مطابق حضور نے اپنی بیویوں سے ایک ماہ کے لیے مباشرت ترک کر دی تھی۔ تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں بیویوں سے سلوک کے حوالے سے حضور کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ بیویاں بہت متفکر ہوئیں اور اُنھوں نے حضور سے کہا کہ آپ اپنے مال سے جس قدر چاہیں ہمیں دیں۔ یعنی آپ کو مطلق اختیار ہے کہ آپ کو جیسے پسند ہے ویسے کریں۔

زمخشری نے تفسیر الکشاف میں آیت 51 کی جو تفصیلی شرح کی ہے اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے: "پیغمبر اپنی کسی بھی بیوی کو قبول کرنے یا رد کرنے میں بالکل آزاد ہیں اور کسی بھی بیوی کو چھوڑنے یا طلاق دینے میں اُنھیں اختیار حاصل ہے"۔ وہ اس میں اضافہ کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں: "پیغمبر اپنے ماننے والوں میں سے کسی بھی عورت سے نکاح کرنے میں مختار اور آزاد ہیں"۔ حسن بن علی کے حوالے سے زمخشری بیان

140: یہ بنو قریظہ کے قتل عام کے بعد کا واقعہ ہے۔ جب مسلمانوں کے ہاتھ بہت زیادہ مال غنیمت لگا تھا اور حضور کو اُس مال غنیمت کا پانچواں حصہ ملا تھا۔ اس وجہ سے حضور کی بیویوں نے نفقہ بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا۔

کرتے ہیں: ”اگر پیغمبر کسی عورت سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں تو کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ وہ اُس عورت کی طرف پیش قدمی کرے تا آنکہ پیغمبر خود ہی اُس عورت سے صرف نظر کر لیں“۔

اسی باب میں زمخشری دوبارہ کہتے ہیں: ”اُن وقتوں میں پیغمبر کی نو بیویاں تھیں اور ”تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآ“ کی مخاطب وہ پانچ بیویاں تھیں جنھیں اپنے حصے کی باری یا تو بالکل نہیں ملتی تھیں یا تاخیر سے ملتی تھی، وہ سودہ، جویریہ، صفیہ، میمونہ اور اُمّ حبیبہ تھیں اور وہ چار بیویاں جو لطف و عنایت سے بہرہ مند ہوتی تھیں، اور پیغمبر باقاعدگی سے خود اُن کے پاس جاتے تھے وہ عائشہ، حفصہ، اُمّ سلمہ اور زینب تھیں“۔

عائشہ اسی سلسلے میں دوبارہ کہتی ہیں: ”شائد ہی کوئی ایسا دن ہو کہ جب پیغمبر ہم سب سے ملتے نہ ہوں۔ لیکن مباشرت کے حوالے سے جب کسی بیوی کی باری آتی تھی تو وہ رات اُسی بیوی کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ اور چونکہ سودہ بنت زمعہ ڈرتی تھیں کہ پیغمبر اُنھیں طلاق دے دیں گے چنانچہ اُنھوں نے حضور سے کہا کہ میری باری کو رہنے دیں، میں آپ سے ہم بستری کی توقع نہیں کرتی اور اپنے حصے کی رات عائشہ کے حوالے کرتی ہوں۔ لیکن مجھے طلاق نہ دیں کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ روز محشر میرا شمار آپ کی بیویوں میں سے ہو“[141]۔

141: عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ام المؤمنین سودہ کو ڈر ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُنھیں طلاق دے دیں گے، تو اُنھوں نے عرض کیا: آپ ہمیں طلاق نہ دیں، اور مجھے اپنی بیویوں میں شامل رہنے دیں اور میری باری کا دن عائشہؓ کو دے دیں، تو آپ نے ایسا ہی کیا، اس پر آیت ”وَاِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِہَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یُّصۡلِحَا بَیۡنَہُمَا صُلۡحًا وَالصُّلۡحُ خَیۡرٌ“ نازل ہوئی (اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تم میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں۔ اور صلح بہتر ہے: النِّسَاء۔128: سنن ترمذی)۔

سورت الأحزَاب کی آیت 51 کے آخر میں جو اہم نکتہ ہے اس کے مطابق آزادیِ عمل اور تمام اختیارات پیغمبر کو تفویض ہوئے تھے اور اُن کی بیویوں کے پاس کسی قسم کا تقاضا کرنے یا جواب طلبی کا حق نہیں تھا۔ اور اُن کی کسی بھی قسم کی توقع یا تقاضا خدائی امر اور ارادے سے انحراف گنا جائے گا۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى " یعنی یہ ترتیب اُن کے لیے بہتر رہے گی کیونکہ اس سے اُن کے درمیان رقابت ختم ہو گی، اور یوں وہ ہمیشہ مطمئن اور راضی رہیں گی۔ شائد عورتوں کے وقار کو جو ٹھیس پہنچی تھی اسے سہلانے، اور اُن کی عزت نفس کو جس انداز سے مجروح کیا گیا تھا، اُس کا اثر کم کرنے کے لیے آیت 52 نازل ہوئی، جسے اُنھیں بہلانے، دلاسا دینے اور خوش کرنے کی کوشش سمجھا جا سکتا ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعۡدُ وَلَاۤ اَنۡ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكَ حُسۡنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَـكَتۡ يَمِيۡنُكَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ رَّقِيۡبًا

ان کے بعد اور عورتیں تمھیں حلال نہیں ہیں، اور نہ کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ اُن کا حسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو، البتہ لونڈیوں کی تمھیں اجازت ہے اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے

لیکن یہاں ایک مسئلہ در پیش ہے اور اس سلسلہ میں عائشہ سے روایت کردہ ایک حدیث ہے جسے تمام محدثین صحیح گردانتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ حضور کی وفات سے پہلے تمام عورتیں اُن کے لیے حلال ہو گئی تھیں۔

زمخشری اس بات کے قائل ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آیت 52 سنّت کے علاوہ اس آیت "اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ " (تمہارے لیے حلال فرمائیں: الأحزَاب۔50) کی دلیل سے جو پہلے نازل ہوئی، سے نسخ ہو گئی۔ ایسی صورت میں منسوخ آیت کو پہلے ہونا چاہیے تھا جب کہ یہاں نسخ آیت بعد میں ہے۔ بہر حال سیوطی اپنی کتاب "الإتقان في علوم القرآن" میں کہتے ہیں کہ پہلی آیت نے بعد والی آیت کو نسخ کر دیا ہے۔

سورت الأحزَاب کی متعدد آیات کے مجموعے سے حیران کن نتیجہ سامنے آتا ہے کہ عورتوں کے حوالے سے حضور کا دائرہ امتیاز کافی وسیع تھا۔

وہ چار سے زیادہ بیوی رکھ سکتے تھے۔ وہ رشتہ دار خواتین جنھوں نے ہجرت کی تھی وہ اُن پر حلال تھیں۔ اگر کوئی عورت خود کو پیش کرے تو بغیر گواہوں اور مہر کی ادائیگی کے وہ اسے بیوی بنا سکتے تھے۔ بیویوں کے درمیان انصاف اور اُنھیں مساوی حقوق دینے سے خود کو مبراء رکھ سکتے تھے۔ اگر کسی بیوی کی ہم بستری کی باری ہوتی، تو اسے ملتوی یا ترک کر سکتے تھے۔ اگر وہ کسی عورت کو چاہتے یا نکاح کی خواہش رکھتے تو وہ دوسرے مسلمانوں پر حرام ہو جاتی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد کسی کو حق حاصل نہیں تھا کہ اُن کی بیواؤں سے نکاح کرے (الأحزَاب۔ 53 تا 55)۔ اور ان کے علاوہ پیغمبر کی بیویوں کو نفقہ میں اضافہ کرنے کا تقاضا کرنے کا حق نہیں تھا۔[142]

رسول اللہ کے ان امتیازات، اختیارات اور آزادی عمل کے مقابلے میں اُن کی بیویوں پر مخصوص ذمہ داریاں عائد تھیں۔

142: سیرت حلبیہ میں عورتوں کے حوالے سے حضور کے خصوصی امتیازات اور اختیار کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ "آنحضرت کو اگر کسی ایسی عورت کی طرف رغبت ہو جو شوہر والی نہ ہو تو آپ کے لیے یہ جائز تھا کہ آپ لفظ نکاح یا ہبہ کا ذکر کیے بغیر اور بغیر گواہوں اور اُس کے ولی کے عورت کے ساتھ ہم بستری کر لیں (یعنی ایسی صورت میں وہ عورت لفظ نکاح کے بغیر آپ کے بیوی ہو جائے گی) جیسا کہ حضرت زینب بن جحش کے معاملے میں ہوا۔۔۔۔۔ اسی طرح اگر آپ کو کسی ایسی عورت کی طرف رغبت ہو جائے جو شوہر والی ہو تو اُس کے شوہر پر واجب تھا کہ آنحضرت کے لیے وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اسی طرح اگر آپ کو کسی باندی کی طرف رغبت ہو جائے تو اُس کے آقا پر واجب تھا کہ وہ اپنی باندی آنحضرت کو ہبہ کر دے۔ اسی طرح آپ کے لیے جائز تھا کہ آپ کسی عورت کو بغیر اُس کی مرضی معلوم کیے جس سے چاہیں بیاہ دیں۔ اسی طرح آپ کے لیے جائز تھا کہ آپ احرام کی حالت میں شادی کر لیں جیسا کہ حضرت میمونہ کے ساتھ آپ کے نکاح کا واقعہ ہے۔

وہ دوسری عورتوں کے مانند نہیں تھیں۔ وہ دوسرے مردوں کے سامنے ظاہر نہیں ہو سکتی تھیں، اُنھیں پردے کے پیچھے سے بات کرنے کا حکم تھا۔ زمانہ جاہلیت میں رائج زیبائش سے پرہیز لازم تھا۔ جو بھی نفقہ دیا جائے گا اُس پر قانع رہیں گی اور مراعات نہ ملنے کی وجہ سے شکایت نہیں کریں گی۔

شادی کے حوالے سے سورت الأحزَاب کی آیت 53 کے آخر میں واضح انداز میں فرمایا گیا ہے:

وَما کانَ لکُم اَن تُؤذوُا رَسوُلَ اللهِ وَلا اَن تَنکِحُوا أزواجَهُ مِن بَعدِهٖ إِنَّ ذٰلِکُم کانَ عِندَ اللّٰہِ عَظِیمًا۔

(اور تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم رسول اللہ کو ایذا دو اور نہ یہ کہ تم ان کی بیویوں سے آپ کے بعد کبھی بھی نکاح کرو بے شک یہ اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے)۔

تالمود میں یہی حکم یہودی بادشاہوں کی بیواؤں کے متعلق آیا ہے۔

ابن عباس کہتے ہیں: ”کہ ایک شخص حضور کی ایک بیوی سے ملنے آیا اور حضور نے اُس سے فرمایا کہ ایسا دوبارہ نہ ہونے پائے۔ اُس مرد نے کہا: ”یہ میری چچا کی بیٹی ہے اور مجھ سے کوئی ناروا حرکت سرزد نہیں ہوئی“۔ پیغمبر نے فرمایا: ”میں یہ جانتا ہوں لیکن کوئی بھی اللہ سے اور مجھ سے زیادہ غیرت مند نہیں ہے“۔ اُس آدمی کو بُرا لگا اور وہاں سے جاتے وقت بڑبڑاتے ہوئے بولا: ”مجھے میرے چچا کی بیٹی سے بات کرنے سے منع کیا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد میں اُس سے شادی کر لوں گا“۔ اور سورت الأحزَاب کی آیت 53 اسی مناسبت سے نازل ہوئی۔

ایک بات جس کا اس باب میں ذکر ضروری ہے کہ حضور کے حرم میں کسی بھی وقت بیس بیویاں نہیں رہیں۔ اُن میں سے دو ظاہری یا نام کی حد تک پیغمبر کی بیویاں شمار ہوتی ہیں لیکن آپ اُن سے ہم بستر نہیں ہوئے۔ اُن میں سے بعض جیسے حضرت خدیجہ، زینب بنت خزیمہ اور ریحانہ نامی لونڈی پہلے ہی مر چکی تھیں۔ وفات کے وقت اُن کے حرم میں نو سے زیادہ بیویاں نہیں تھیں اور اُن کے درمیان دھڑے

بندی اور رقابت موجود تھی[143]۔ ایک طرف عائشہ، حفصہ، سودہ اور صفیہ تھیں اور دوسری طرف زینب بنت جحش، اُمّ سلمہ اور دوسری بیویاں تھیں۔

حضور کی ازواج میں سے چند ایک کے واقعات اسلامی تاریخ و ادب میں درج ہیں، جن میں سے ایک واقعہ افک یعنی عائشہ پر صفوان بن معطل کے حوالے سے تہمت تھی۔ تیسری ہجری میں غزوہ بنو مصطلق کے بعد عمر بن خطاب اور خزرج کے ایک شخص کے درمیان جھگڑا ہوا۔ عبد اللہ بن ابی جو مدینہ کے منافقین کے طور پر جانا جاتا تھا اور اسلام کی ابتدائی تاریخ میں خاصا بدنام تھا، کو اس بات پر بہت غصہ آیا اور اُس نے کہا: ”یہ بدنصیبی ہم نے خود گلے لگائی ہے (یعنی قریشی مہاجرین کو قبول کرتے ہوئے اُن کی پذیرائی کرنا)۔ یہ مثل ہم پر صادق آتی ہے کہ جب اپنے کتے کو کھانے سے سیر کر دو گے تو وہ آپ کو ہی کاٹے گا۔ ہم واپس یثرب چلتے ہیں جہاں ہمارے عزیزوں کی اکثریت ہے اور اس گھٹیا اقلیت کو باہر کرتے ہیں“۔

جب یہ بات حضور کے کانوں تک پہنچی تو اُنھوں نے واپس مدینہ پہنچنے کی جلدی کی تا کہ عبد اللہ بن ابی کو اس تحریک اور فتنے سے باز رکھ پائیں۔ یہ سفر لگاتار تھا اور حضور نے ستانے کی خاطر بہت کم توقف کیا۔ اپنی باری کی وجہ سے اس سفر میں عائشہ حضور کے ساتھ تھیں۔ واپسی پر راستے میں ایک جگہ مختصر قیام

143: عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: مجھے معلوم ہونے سے پہلے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا میرے گھر میں بغیر اجازت کے آ گئیں، وہ غصہ میں تھیں، کہنے لگیں: اللہ کے رسول! کیا آپ کے لیے بس یہی کافی ہے کہ ابو بکر کی بیٹی اپنی آغوش آپ کے لیے وا کر دے؟ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئیں، میں نے اُن سے منہ موڑ لیا، یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ”تو بھی اس کی خبر لے اور اس پر اپنی برتری دکھا“ تو میں اُن کی طرف پلٹی، اور میں نے اُن کا جواب دیا، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ اُن کا تھوک اُن کے منہ میں سوکھ گیا، اور مجھے کوئی جواب نہ دے سکیں، پھر میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ کا چہرہ کھل اٹھا تھا“۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح)۔

کے دوران قضائے حاجت کے لیے باہر صحرا میں گئیں اور وہاں اپنا ہار گم کر بیٹھیں جس کی تلاش میں کارواں سے پیچھے رہ گئیں اور جس اونٹ پر آپ کا ہودہ تھا وہ دوسرے اونٹوں کے ساتھ چلا گیا۔

عائشہ صحرا میں اکیلی رہ گئیں تا آنکہ صفوان بن معطل، جو قافلے کے پیچھے پیچھے آرہا تھا تاکہ اگر کسی کی کوئی چیز پیچھے رہ جائے تو وہ اسے تلاش کر لائے، اُس جگہ آن پہنچا اور اُنھیں اپنے پیچھے اونٹ پر سوار کر کے مدینہ لے آیا۔ یہ بات چھپی نہ رہ سکی خصوصی طور پر جب اس بات کا زینب بنت جحش کی بہن حمنہ کو پتہ چلا۔ اور چونکہ زینب و عائشہ میں رقابت تھی تو اُسے عائشہ کو نقصان پہنچانے کا موقع ہاتھ آ گیا اور اُس نے عائشہ پر صفوان کے ساتھ زنا کرنے کا الزام لگا دیا۔ مشہور شاعر حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ بھی اُس کے ساتھ ہم زبان ہو گئے۔ عبد اللہ بن ابی جس کا پیغمبر کے ساتھ نفاق اور کینہ مسلّم تھا، وہ بھی چپ نہ بیٹھا اور اُس نے یہ خبر پورے شہر میں پھیلا دی۔

ظاہری حالت و صورت احوال کے مطابق اس الزام سے بریت یا اپنی بے گناہی ثابت کرنا عائشہ کے لیے خاصا مشکل تھا۔ اس غزوہ (شب خون) سے واپس آنے کے فوراً بعد عائشہ کا مقابلہ ایک ایسی عورت سے تھا جو جوانی اور خوب صورتی میں اُن کے ہم پلہ تھی اور جس کے حصول کی خاطر اُن کے شوہر پر بہت سی آیات نازل ہوئی تھیں۔ پیغمبر نے اسی غزوے میں بنو مصطلق پر فتح پانے کے بعد مسافع بن صفوان کی بیوی جویریہ بنت حارث بن ابوضرار کو اُس کے مالک سے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، چار سو درہم کے عوض خریدا اور اپنی بیوی بنا لیا۔ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضور نے بہت تھوڑی مدت میں دو خوبصورت بلائیں اُن کے سر پر لا بٹھائی تھیں۔ چنانچہ اُن کی لطیف زنانہ روح کا مجروح ہونا فطری طور پر ممکن تھا۔ چنانچہ انتقام لینے کی خاطر اُن سے یہ انحراف سرزد ہو گیا یا اُنھوں نے اپنے شوہر کو تنبیہ کرنے اور سزا دینے کی خاطر یہ منظر تخلیق کیا ہو۔ کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کاروان نے کوچ کیا اور جب عائشہ کا ہودہ اونٹ پر رکھا گیا تو اُن لوگوں کو اس طرف توجہ نہ ہوئی ہو کہ ہودہ خالی ہے ؟۔

عائشہ جو محمد کی اتنی چہیتی تھیں، کوچ کا حکم دیتے وقت اُنھوں نے اُن کے متعلق استفسار کیوں نہیں کیا؟۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سینکڑوں مجاہد کوچ کی تیاری کر رہے تھے اور عائشہ کو خبر تک نہ ہوئی اور وہ وقت پر کاروان تک نہیں پہنچیں اور وہیں صحرا میں رہیں تا آنکہ صفوان وہاں پہنچے؟۔ اگر صورت حال یوں تھی کہ صفوان کو متحرک کاروان سے ہر حالت میں پیچھے رہنا تھا تو جب کاروان نے آرام کی غرض سے اگلا پڑاوٗ ڈالنا تھا تو صفوان کو اُن تک پہنچنا چاہیے تھا۔ قافلہ جانے کے بہت دیر بعد صفوان کا قافلے کی جگہ پر پہنچنا اور وہاں اکیلی عائشہ کو پانا حقیقت کے ساتھ قطعاً منطبق نہیں ہوتا۔ صاف ظاہر ہے کہ عائشہ اپنی مرضی سے پیچھے رہیں اور اس کے لیے صفوان کے ساتھ ملی بھگت کی گئی تھی۔ جوں ہی صفوان عائشہ کو پیچھے بٹھائے مدینہ میں داخل ہوا تو عائشہ کے متعلق بدگمانی اور سرگوشیاں شروع ہو گئیں اور تھوڑی ہی دیر میں پورے شہر میں پھیل گئیں۔ ایک چھوٹا سا شہر مدینہ جہاں چھوٹی چھوٹی باتیں ایک دم سے پورے شہر میں پھیل جاتی تھیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی اہم بات بیس روز بعد عائشہ کے کانوں تک پہنچی اور اُس وقت وہ اس قدر پریشان ہوئیں کہ بیماری کا بہانہ کر کے اپنے باپ کے گھر چلی گئیں؟۔ چنانچہ ایسا فرض کرنا فطری ہے کہ وہ پہلے دن سے اس خبر سے واقف تھیں لیکن یہ خبر حضور تک پہنچنے کے بعد جب اُنھیں سرد مہری اور بے اعتنائی کا سامنا ہوا تو اُنھوں نے بیماری کا بہانہ کیا اور اپنے باپ کے گھر چلی گئیں۔

اس تمام ظاہری صورت اور نامساعد حالات کے باوجود ایسا قطعی طور پر بعید نہیں ہے بلکہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ عائشہ بے گناہ تھیں اور یہ اُن کے بچگانہ اور زنانہ ذہن کا تخلیق کردہ تماشا تھا۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ صفوان بن معطل عورتوں سے نفرت کے حوالے سے مشہور تھا۔ بہر حال لوگوں کی بدگوئی اور بدزبانی جب حضور تک پہنچی تو وہ اس سے اس قدر پریشان ہوئے کہ اُنھوں نے ایک دم سے اس سلسلے میں اپنے قریبی ترین عزیز یعنی علی بن ابو طالب اور اُسامہ بن زید سے مشورہ کیا۔

اُسامہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ عائشہ معصوم ہیں اور ابو بکر کی بیٹی ایسی آلودگیوں سے پاک ہے۔ لیکن علی بن ابو طالب نے کہا: ”آپ کو عورتوں کی کمی نہیں ہے، اور اگر عائشہ کی کنیز سے تحقیق کی جائے

تو سچ تک پہنچنا ممکن ہے"۔ سچ اگلوانے کی خاطر اُس بیچاری کنیز کو علی نے بہت مارا۔ چونکہ وہ کنیز کچھ نہیں جانتی تھی چنانچہ اُس نے عائشہ کی برأت کی قسم کھائی۔ لیکن اس کے باوجود حضور کے شک اور پریشانی میں کمی واقع نہ ہوئی چنانچہ وہ عائشہ سے پوچھ گچھ کرنے ابوبکر کے گھر گئے، جہاں پر رونے دھونے اور جرم کے انکار کا سامنا ہونا ایک فطری بات تھی۔ اس کے علاوہ اُن پر وحی نازل ہوئی تو اُن کو ڈھانپ دیا گیا اور سر کے نیچے چمڑے کا تکیہ رکھ دیا گیا۔ اس دوران اُنھیں اس قدر پسینہ آیا کہ اُنھوں نے جو قبا پہنی ہوئی تھی پسینہ اُس سے باہر بہنے لگا اور سورت النُّور نازل ہوئی۔ اس سورت میں بہت سی آیات میں زنا کی سزا، کسی پر تہمت لگانے کی سزا اور افک کی کہانی کے علاوہ عائشہ کی برأت کی وجہ بھی موجود ہیں۔ (آیات 2 تا 26)

زمخشری کے بقول کسی بھی اور موضوع کو اس شدت سے قرآن میں بیان نہیں کیا گیا جس کی بہترین مثال آیت 23 ہے:

اِنَّ الَّذِینَ یَرمُونَ المُحصَناتِ الغافِلاتِ المُومِناتِ لُعِنُوا فِی الدُّنیا وَالاخِرۃِ وَلَھُم عَذابُ عَظِیمُ۔

(جو لوگ پاک دامنوں بے خبر ایمان والیوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے)۔

اس ماجرے کے آخر میں اُن تینوں یعنی حمنہ بنت جحش، حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ جنھوں نے یہ بہتان لگایا تھا، پر حدّ نافذ کرتے ہوئے کوڑے مارے گئے۔ یہاں پر قانون عطف استعمال ہوا یعنی پہلے سے کیے گئے گناہوں کی سزا اُنھیں بعد میں دی گئی کیونکہ اُس وقت تک کسی پر تہمت لگانے کی حدّ کا تعین نہیں ہوا تھا۔

زینب کا قصہ

محمد کی زینب کے ساتھ شادی کا ذکر سیرت کی کتابوں، روایات حتیٰ کہ قرآن میں بھی موجود ہے۔ یہ ایک ایسی شادی ہے جسے محبت کی شادی کہا جا سکتا ہے۔

زینب زید بن حارثہ کی بیوی تھی۔ زید کو خدیجہ نے اپنی جوانی کی عمر میں خرید ا تھا اور اُسے محمد کے حوالے کر دیا تھا۔ حضور نے اُسے آزاد کر دیا اور اُن وقتوں کی رائج عرب رسم کے مطابق اپنا بیٹا بنالیا۔ اُن وقتوں کے رواج کے مطابق منہ بولے بیٹے کے وہی حقوق و فرائض ہوتے تھے جو اصلی بیٹوں کے تھے، جیسے ورثے کا حق اور اُن کی بیویاں محرمات میں شامل ہوتی تھیں۔ سورت الأحزَاب کی آیت چار سے آٹھ کے نزول سے پہلے تک مسلمان اُسی پرانی رسم پر عمل پیرا رہے۔ عبد اللہ بن عمر کا اس موضوع پر کہنا ہے: ”ہم جو پیغمبر کے نزدیک تھے ہم زید کو زید بن محمد پکارتے تھے کیونکہ وہ صرف محمد کا منہ بولا بیٹا ہی نہیں تھا بلکہ اس کے علاوہ بھی وہ رسول کے سچے فدائی صحابہ میں ایک سمجھا جاتا تھا“۔

زینب پیغمبر کی پھوپھی امیمہ بنت عبد المطلب کی بیٹی تھی۔ اور زید کے لیے زینب کا رشتہ خود پیغمبر نے مانگا تھا۔ لیکن چونکہ زید ایک آزاد کردہ غلام تھا لہٰذا زینب اور اُس کے بھائی عبد اللہ نے اس رشتے سے کراہت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن تب سورت الأحزَاب کی آیت 36 نازل ہوئی:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا

(اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو لائق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے تو اُنھیں اپنے کام میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو وہ صریح گمراہ ہوا)۔

اس آیت کے نزول کے بعد زینب اور عبد اللہ نے پیغمبر کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور زینب کا زید سے نکاح کر دیا گیا۔ حضور کے عشق کی داستان کا آغاز اس واقعے کے بعد ہوتا ہے لیکن اس کے وقت کے تعین اور کیفیت پر تھوڑا اختلاف ہے۔ جلالین کی تفسیر کے مطابق اس نکاح کے جلد بعد ہی حضور کے رویئے میں تبدیلی آگئی۔ "ثُمَّ وَقَعَ بَصَرہ عَلِیھا بَعدِ حسین فَوَقِع فِ نَفسِہِ حُبّھا" یعنی زینب پر نظر پڑتے وقت یا اُس سے کچھ عرصہ بعد اُن کے دل میں زینب کے لیے محبت دھڑکنے لگی۔

زمخشری سورت الأحزَاب کی آیت 37 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "اس نکاح کے بعد جب حضور کی نگاہ زینب پر پڑی تو وہ اُنھیں اس قدر پسند آئی کہ بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا: "سُبحانَ اللہ مُقَلّبُ القُلوب" (تقدیس اُس خدا کی جو دلوں کو پھیر دیتا ہے)۔ زینب کو پیغمبر نے پہلے دیکھا تھا اور اُنھیں وہ پسند نہیں آئی تھی وگرنہ وہ اپنے لیے رشتہ مانگ لیتے۔ زینب نے یہ جملہ سنا تو زید کو بتایا تو زید نے اپنی فراست سے یہ مطلب نکالا کہ خدا نے اُس کے دل میں زینب کے حوالے سے بیزاری پیدا کر دی ہے۔ وہ جلدی سے پیغمبر کے پاس گیا اور عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بیوی کو چھوڑ دوں۔ حضور نے پوچھا: "کیا ہوا، کیا زینب پر کسی قسم کا شُبہ ہے؟"۔ زید نے عرض کیا: "میں نے اُس میں سوائے اچھائی کے کچھ نہیں دیکھا لیکن میں اُسے خود سے برتر اور اعلی نسب کی سمجھتا ہوں، اس وجہ سے میں بے چینی کا شکار ہوں۔ یہ جملہ اُس مناسبت سے قرآن میں آیا ہے: "اَمسِکَ زَوجَکَ وَاتَّقِ اللہ" (اپنی بیوی پاس رکھو اور اللہ سے ڈرو)۔ سورت الأحزَاب کی آیت 37 بہت واضح، بامعنی اور خوبصورت انداز میں حضور کے خلوص و صداقت کی نشاندہی کرتی ہے"۔

وَاِذ تَقُولُ لِلّذی اِنعَمَ اللہُ عَلَیہِ وَ اَنعَمتَ عَلَیہِ اَمسِک عَلَیکَ زَوجَکَ وَاتَّقِ اللہَ وَتُخفی فی نَفسِکَ مااللہُ مُبدیہِ وَتَخشَی النّاسَ وَاللہُ اَحَقُّ اَن تَخشیہُ فَلَمّا قضی زَیدُ مِنھا وَطَراً زَوَّجنا کَھا لِکَی لیَکُونَ عَلَی المُؤمِنینَ حَرَجُ فی اَزواجِ اَدعِیائِھِم اِذا قَصَوا مِنُنَّ وَطَراً وَکانَ اَمرُ اللہُ مَفعُولاً

(اور جب تو نے اُس شخص سے کہا جس پر اللہ نے احسان کیا اور تو نے احسان کیا اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں ایک چیز چھپاتا تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے ڈرتا تھا حالانکہ اللہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ تو اس سے ڈرے پھر جب زید اس سے حاجت پوری کر چکا تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی گناہ نہ ہو جب کہ وہ اُن سے حاجت پوری کر لیں اور اللہ کا حکم ہو کر رہنے والا ہے)۔

یہ آیت خاصی واضح ہے اس لیے اسے کسی تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔ حضور کو زینب بھا گئی تھی لیکن جب زید طلاق دینے کی خاطر ان سے اجازت لینے کی خاطر ان کے حضور پیش ہوا تو آپ نے فرمایا: ”طلاق نہ دو اور اُسے پاس رکھو“۔ یہ کہتے ہوئے حضور نے اپنی دلی خواہش کو دبا دیا اور زید کو نصیحت کی کہ اپنی بیوی کو پاس رکھو۔ لیکن خدا آپ سے کہتا ہے: ”تم لوگوں کی بدگوئی سے ڈرتے ہوئے زید کی زینب کو طلاق دینے کی اپنی دلی خواہش کو مت چھپاؤ، تمھیں صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ جب زید نے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اُس کی بیوی تمھارے حوالے کر دی تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کے حوالے سے مومنوں پر کوئی پابندی نہ رہے“۔

نکاح کے بعد حضور کے رویے میں تبدیلی اور زینب کے لیے شیفتگی کا پیدا ہو جانا ممکن تھا۔ بیشک زینب اور زید کی ازدواجی زندگی مختصر تھی، لیکن زید کے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہونے اور طلاق دینے کی اجازت لینے کی خاطر زینب کے بُرے رویے کا ذکر کرنے کو مناسب توجیہ کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں زمخشری کی تفسیر حالات کی یوں تصویر کشی کرتی ہے کہ شادی کی بعد تقریب کے دوران جب حضور کی نظر زینب پر پڑی تو اُن کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ ادا ہوا ”سبحان اللہ مقلب القلوب“۔ نبی کے منہ سے یہ جملہ سُن کر اور شائد اُن کی آنکھوں میں چمک کا مشاہدہ کرنے سے حضور کی محبت اور رغبت سے زینب آگاہ ہو گئی تھیں اور اسی وجہ سے محمد کو قابو کرنے اور قریش کے طاقتور ترین اور اہم ترین

شخص کی بیوی بننے کی خواہش اُن کے دل میں انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ شائد یہی وہ دلیل یا وجہ ہے جس نے پہلے روز سے ہی زید کے ساتھ بُرے رویے اور سرد مہری کی بنیاد رکھ دی تھی اور اپنے نسب کی برتری کا اظہار اُس کے سامنے ہونے لگا تھا۔

اس صورت سے آگاہ ہونے کے بعد زید اپنے سرپرست اور آزاد کنندہ سے خلوص اور عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے زینب کو طلاق کی غرض سے آیا اور باوجودیکہ پیغمبر نے زید کو بیوی پاس رکھنے کی تلقین کی تھی، زید نے زینب کو طلاق دے دی۔

تفسیر کیمبرج[144] میں جس کا لکھنے والا نامعلوم ہے۔ اسے حال ہی میں سورت مریم سے قرآن کے خاتمے تک بنیاد فرہنگ ایران نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، پیغمبر کے رویئے میں تبدیلی اور زینب سے عشق کی داستان یوں بیان کی گئی ہے۔

"ایک روز رسول صلیٰ اللہ علیہ وسلم زید سے ملنے زینب کے گھر آئے۔ زینب ساما کچہہ[145] پہنے خوشبودار تیل کُوٹ رہی تھیں، وہ اُنھیں بہت اچھی لگی[146] اور اُن کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کاش یہ اُن کی

144: یوں لگتا ہے کہ تفسیر کیمبرج چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئی تھی۔ اس کا نصف اوّل یعنی سورت البَقَرَة تا سورت مَریَم موجود نہیں ہے اس بے مثال تفسیر کا نصف دوم کیمبرج کی لائبریری میں موجود ہے۔ اسے فارسی زبان کی ایک معتبر اور واضح تفسیر کا درجہ حاصل ہے۔

145: ساما کچہہ سے مراد پستان بند، سینہ بند ہے۔ یعنی زینب نیم عریاں تھیں اُنھوں نے قمیض نہیں بلکہ صرف انگیا پہنی ہوئی تھی۔

146: مفسرین اور مورخین اسلام نے اس واقعہ کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ یعنی لکھتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ اپنے منہ بولے بیٹے زید کے گھر گئے اور زینب کو نہاتے دیکھا۔ جب رسول کی بے خطا نظروں نے زینب کے عریاں بدن کو دیکھا تو بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا: " فتبارک اللہ احسن من الخالقین " (اللہ بڑی برکت والا سب سے بہتر بنانے والا ہے: المؤمنون۔14)۔ زید بن حارثہ بن شراحبیل کعبی رسول اللہ کا منہ بولا بیٹا تھا۔ غزوہ موتہ کے موقع پر اسلامی لشکر کا سپ سالار تھا اور اُسی غزوہ میں آٹھویں ہجری میں مارا گیا۔

"واقعہ یہ ہوا تھا کہ جب زینب سے کہا گیا کہ رسول اللہ باہر دروازے پر کھڑے ہیں، اُنھوں نے عجلت میں کپڑے پہنے اور پوری طرح نہیں پہنے تھے کہ خود ایک دم رسول اللہ کے سامنے آ گئیں۔ اُن کی صورت آپ کے دل میں کھُب گئی۔ آپ کچھ منہ سے کہتے وہاں سے پلٹے اور کوئی الفاظ تو سمجھ نہیں آئے۔ البتہ یہ آپ نے ذرا بلند آواز میں فرمایا: "سبحان ا اللہ العظیم، سبحان اللہ مقلب القلوب" (پاک ہے اللہ بزرگ، پاک ہے اللہ دلوں کو پھیرنے والا)"۔ (تاریخ الرسل والملوک۔ الطبری)۔

بیوی ہوتی۔ جب زینب نے رسول کو دیکھا تو اُن پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیغمبر نے کہا: "لبساقة و حسناً "(وقار اور خوبصورتی!) یا زینب سبحان اللہ مقلب القلوب۔ اُنھوں نے دوبارہ یہ کہا اور واپس پلٹ آئے۔ جب زید آیا تو زینب نے اسے تمام ماجرا سنایا اور کہا کہ تم مجھے مزید نہیں رکھ سکتے، جاؤ! مجھے طلاق دینے کی اجازت لے کر آؤ۔ زید نے زینب کو اس قدر دشمن جانا کہ اُس کا چہرہ دیکھنے کا روادار نہ رہا۔

طلاق ہو جانے کے بعد حضور نے خود زید کو مامور کیا کہ جا کر زینب کو کہو کہ اللہ نے اُسے میری بیوی بنا دیا ہے، زید زینب کے گھر آیا، دروازہ کھٹکھٹایا۔ زینب نے پوچھا: " کون ہے؟"۔ زید نے جواب دیا: "زید ہوں"۔ زینب نے کہا: "اب مجھ سے کیا چاہتے ہو کہ طلاق دے چکے ہو؟"۔ زید نے کہا: "رسول اللہ کا پیغام لایا ہوں"۔ زینب نے کہا: "مرحبا رسول اللہ" اور دروازہ کھول دیا، زید اندر آیا تو زینب نے رونا شروع کر دیا۔ زید نے کہا: "تمھاری آنکھوں سے آنسو نہ بہیں، تم ایک نیک اور فرمان بردار بیوی تھی۔ خدا نے تمھیں مجھ سے بہتر خاوند دیا ہے"۔ زینب نے کہا: "اس بات کو چھوڑو، وہ کون ہے؟"۔ زید نے کہا: "رسول اللہ"۔ زینب سجدے میں گر گئی"۔

یہ روایت دوسری روایت پر مکمل طور پر منطبق ہوتی ہے، زید نے کہا:

"میں زینب کے گھر گیا، وہ آٹا گوندھنے میں مصروف تھی، چونکہ مجھے پتہ تھا کہ وہ پیغمبر کی بیوی بننے والی ہے اس لیے اُس کا احترام اور ہیبت مجھ پر طاری ہو گئی۔ چنانچہ میں اپنا منہ اُس کی طرف نہ کر سکا اور اُس کی طرف پشت کیے ہوئے میں نے اُسے پیغمبر کے رشتے کی درخواست کی خبر دی"۔

اس حوالے تفسیر جلالین میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضور گویا دن گن رہے تھے۔ جوں ہی زینب عدّت سے فارغ ہوئیں، وہ بغیر کسی ابتدائی تیاری یا تقریب کے وہاں گئے جہاں پر ایک بکری ذبح کی گئی اور لوگوں کو دیر تک روٹی اور گوشت دیا گیا اور یوں شادی کی تقریب منائی گئی[147]۔

لیکن عمر اور عائشہ روایت کرتے ہیں کہ سورت الأحزَاب کی آیت 37 رسول اکرم کی صراحت، امانت اور صداقت پر دلالت کرتی ہے۔ عائشہ کہتی ہیں: اگر پیغمبر اگر کسی چیز کو چھپانا چاہتے تو زینب کے متعلق ان کی دلی خواہش کا قرآن میں ذکر نہ ہوتا۔ "وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ" (اور تم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ کرتے تھے جس کو خدا ظاہر کرنے والا تھا)۔

یہ بات سچ ہے کہ رسول کی صداقت، امانت اور صراحت کے متعلق دلیل کے طور پر قرآن میں کافی آیات موجود ہیں۔ حضور نے اپنی بشری کمزوریوں کا اعتراف کرتے وقت کسی بات کی پرواہ نہیں کی۔ لیکن شوربے سے زیادہ برتن کو گرم کہنے والے اسے قبول نہیں کرپاتے[148] جس کا ذکر معجزات کے باب میں ہو چکا ہے۔ اُسی جملے جس پر مفسرین اور راویوں کا اجماع ہے، محمد بن جریر طبری اپنی تفسیر میں اسے قبول نہیں کرتے اور وہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ "تُخْفِي فِي نَفْسِكَ" (تو اپنے دل میں ایک چیز چھپاتا تھا) میں فاعل محمد ہیں۔ طبری کہتے ہیں کہ یہاں فاعل زید تھا۔ یعنی پیغمبر نے زید سے کہا: "اپنی بیوی کو پاس رکھ اور خدا سے ڈر کہ جو چیز تو اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے اللہ اسے آشکار کرنا چاہتا ہے"۔ اپنی اس بے بنیاد تفسیر کو سچ ثابت کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں: "زید کو ایک مرض لاحق تھا جو

147: زینب کی حضور کی شادی کے وقت نکاح نہیں پڑھا گیا تھا کیونکہ حضور اور زینب کا نکاح عرش پر خدا نے پڑھ دیا تھا۔ چنانچہ زینب اکثر اس بات پر فخر کیا کرتی تھیں۔ "حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت زینب بنت جحش تمام ازدواج مطہرات پر فخر فرمایا کرتی تھیں۔ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ اللہ عزوجل نے آسمان کے اوپر سے میرا نکاح کیا ہے اور پردے کی آیت کریمہ بھی اُن سے متعلق ہی نازل ہوئی"۔ (سُنن نسائی، کتاب النکاح)۔

148: یہاں اس کہاوت سے مراد ایسے لوگ ہیں جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہونے کا دم بھرتے ہیں

اُس نے چھپایا ہوا تھا اور اُسی مرض کی وجہ سے چاہتا تھا کہ زینب کو طلاق دے اور یہاں اُس مرض کو لوگوں سے چھپائے ہوا رکھنا مقصود تھا"۔

محمد حسین ہیکل بھی ماں سے زیادہ شفیق دائی کا کردار ادا کرتے ہوئے پیچھے نہیں رہتے۔ اپنی کتاب "حیاۃ محمد" میں لکھتے ہیں۔

"زینب پیغمبر کی پھوپھی کی بیٹی تھی اور آپ نے اُسے پہلے دیکھا ہوا تھا اور کبھی بھی اُس سے شادی کی خواہش نہیں کی اور اسی وجہ نے آپ نے زید پر زور دیا کہ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ لیکن زید نے اپنے سرپرست کی بات کو رد کیا اور زینب کو طلاق دے دی۔ پیغمبر نے زینب سے اس لیے شادی کی تا کہ عربوں کے ہاں منہ بولے بیٹوں کے متعلق زمانہ جاہلیت کی رسم کے آثار کا خاتمہ کیا جائے اور مؤمنین کو بتایا جائے کہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کی جاسکتی ہے۔ لہذا اُنھوں نے زینب سے شادی کر لی اور زینب کی عدت ختم ہونے کے بعد شائد وہ اسی وجہ سے جلدی سے زینب کے گھر گئے اور اپنی شادی کا وہاں ولیمہ کیا"۔

حفصہ

محمد حسین ہیکل حضور کی اکثر شادیاں کو مصلحت کی شادی یا سیاسی شادی کہتے ہیں جس کی تائید کے لیے وہ لکھتے ہیں۔

"ایک روز عمر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھے کسی سلسلے میں بات کر رہے تھے اور بیوی جھگڑے کے انداز میں بہت زبان چلا رہی تھی۔ عمر غصہ میں آ گئے اور کہا: "عورتیں اس قابل نہیں ہیں کہ وہ امور زندگی میں مردوں کے سامنے زبان چلائیں اور کوئی رائے رکھیں"۔ بیوی نے کہا: "تمھاری بیٹی رسول اللہ کے ساتھ اس حد تک بحث اور جھگڑا کرتی ہے کہ رسول سارا دن غصے میں رہتے ہیں"۔ یہ بات سنتے ہی عمر حفصہ کے

گھر گئے اور باز پُرس کی اور اُسے خدائی عتاب اور پیغمبر کے غضب سے ڈراتے ہوئے مزید کہا: ”تو اُس جوان لڑکی (اس سے مراد عائشہ ہے جنھیں اپنی خوبصورتی پر ناز تھا اور اس بات سے آگاہ تھیں کہ پیغمبر اُن سے کس قدر محبت اور قربت رکھتے ہیں) کی نقل مت کیا کرو۔ میری وجہ سے پیغمبر نے تم سے شادی کی ہے وگرنہ اُنھیں تم سے محبت نہیں تھی“۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ قضیہ معقول اور قابل قبول ہے کہ پیغمبر کی کچھ شادیاں مصلحت اور اس سوچ کو سامنے رکھ کر کی گئیں کہ اس سے اسلام کو تقویت ملے گی۔ اور حسین ہیکل کے بقول اسی وجہ سے علی اور عثمان کو اپنے دامادی میں لیا تھا۔ اور یہ بات بھی مشہور ہے کہ خالد بن ولید نے اپنی خالہ میمونہ جو عباس بن عبد المطلب اور حمزہ بن عبد المطلب کی سالی تھی، کی نو ہجری میں عمرہ کے دوران رسول سے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔

ماریہ کو خود پر حرام ٹھہرانا

پیغمبر اور عورت کے حوالے سے ایک اور واقعہ جس کا ذکر کرنا مناسب ہے، (کیونکہ اس واقعے سے نہ صرف اُن وقتوں میں ہلچل مچی تھی بلکہ اس کی وجہ سے چند آیات کا نزول بھی ہوا تھا۔) وہ پیغمبر کا ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام ٹھہرانا ہے۔ وہ واقعہ کچھ یوں ہے۔

ایک روز ماریہ حضور سے ملنے آئی، اس روز حضور حفصہ کے گھر تھے اور حفصہ گھر میں نہیں تھیں۔ حضور نے وہیں ماریہ سے ہم بستری کی۔ اسی اثنا میں حفصہ وہیں آ گئیں اور اُنھوں نے غصے سے چلانا شروع کر دیا کہ تم نے میرے گھر پر میرے ہی بستر پر اپنی کنیز سے کیوں صحبت کی ہے؟۔ حضور نے حفصہ کی تسکین خاطر اور غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے خود پر ماریہ کو حرام قرار دے دیا۔

اس بحران کے ٹلنے کے بعد ماریہ کی چاہت میں یا اس وجہ سے کہ ماریہ اپنے حرام قرار دیے جانے کی وجہ سے افسردہ ہوئی تھی، حضور نے ماریہ کو حرام قرار دینے کا اپنا فیصلہ بدل لیا۔ فیصلے کی اس تبدیلی کو جائز ٹھہرانے کے لیے سورت التّحریم کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں[149]۔

یا اَیُّھَا النَّبِی لِمَ تُحَرِّمُ ما اَحَلَّ اللّٰہُ لک تَبتَغی مَرضاتَ اَزواجِک وَاللّٰہُ غَفُورٌ رَحیم۔

(اے نبی آپ کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔1)

جس چیز کو اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے اسے حرام قرار دینے کی مغفرت اور کفارے کا بعد میں تعین ہوا جس کے لیے آیت نازل ہوئی۔ اور کفارہ ایک غلام کو آزاد کرنا تھا "قَدۡ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمۡ تَحِلَّۃَ اَیۡمَانِکُمۡ" (خدا نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔2)۔ کفارے کی صورت میں جو واجب ہے وہ سورت المائدہ کی آیت 89 میں بیان کر دیا گیا ہے[150]۔ اسی رُو سے مقاتل بن سلیمان نے لکھا ہے "حضور نے کفارہ ادا کیا اور ایک غلام کو آزاد کیا" اور حسن بن علی کا کہنا ہے کہ آیت کے آخر میں "وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ" ہونے سے مراد ہے کہ اللہ نے حضور کو معاف کر دیا تھا۔

149: حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور کے پاس ایک لونڈی تھی جس سے آپ ہم بستری فرماتے تھے۔ پھر حفصہ اور عائشہ آپ کے پیچھے پڑ گئیں، یہاں تک کہ آپ نے اُسے اپنے اوپر حرام قرار دے دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: "اے نبی! تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تم پر حلال کی"۔ (سنن نسائی، کتاب النکاح)۔

150: اللہ تمھیں تمھاری بیہودہ قسموں پر نہیں پکڑتا لیکن ان قسموں پر پکڑتا ہے جنہیں تم مستحکم کر دو سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا دینا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا یا گردن آزاد کرنی پھر جو شخص یہ نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھنے ہیں اسی طرح تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو اسی طرح تمہارے لیے اپنے حکم بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔

تیسری آیت بھی اسی جھگڑے کا تسلسل ہے۔ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ ایک ذاتی اور گھریلو معاملہ اور میاں بیوی کی گفتگو قرآن میں بیان کی گئی ہے۔

وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِہٖ حَدِیۡثًا فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِہٖ وَاَظۡہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیۡہِ عَرَّفَ بَعۡضَہٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَکَ ہٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الۡعَلِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ

(اور جب نبی نے چھپا کر اپنی کسی بیوی (حفصہ) سے (ماریہ کو حرام کرنے کی) ایک بات کہہ دی اور پھر جب اس بیوی نے وہ بات (عائشہ کو) بتا دی اور اللہ نے اس کو نبی پر ظاہر کر دیا تو نبی نے اس میں سے کچھ بات جتلا دی اور کچھ ٹال دی پس جب پیغمبر نے اس کو وہ بات جتلا دی تو (حفصہ) بولی آپ کو کس نے یہ بات بتا دی (حفصہ کو شک تھا کہ عائشہ نے وہ بات رسول کو بتائی ہے) آپ نے فرمایا مجھے خدائے علیم و خبیر نے یہ بات بتلائی۔

قرآن جو ایک ابدی شریعت اور تمام نسل انسانی کے لیے ایک فیصلہ کن اور کامل ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے، کیا اس میں ذاتی نوعیت کی ان باتوں کا ذکر حیران کن نہیں ہے؟۔ اور اس سے بھی حیران کن مفسرین کی تشریح و تفسیر ہے۔ اس کی ایک مثال تفسیر کیمبرج ہے جس میں اس جملے کی تفسیریوں کی گئی ہے۔

”جب حفصہ نے پیغمبر علیہ السلام کے راز کی خبر عائشہ کو بتا دی اور خدائے عز و جل نے اپنے پیغمبر کو اس سے آگاہ کر دیا کہ حفصہ نے تمھارا راز عائشہ کو بتا دیا ہے تو پیغمبر نے اُن باتوں میں سے چند حفصہ کو سنائیں جو اُس نے عائشہ کو بتائی تھیں“۔

اس قسم کی زنانہ باتیں جو دنیا کے ہر کونے میں ہزاروں کی تعداد میں ہر روز ہوتی ہیں، کیا یہ ضروری تھا کہ اِنھیں قرآن میں درج کیا جاتا اور خدائے بزرگ و برتر جو خالق کائنات ہے کو مفسرین اس درجہ نیچے گرا دیتے کہ وہ حفصہ کی عائشہ سے کی گئی باتوں سے پیغمبر کا آگاہ کر رہا ہے؟۔ بہر حال سورت التّحریم کی

پہلی تین آیات میاں بیوی کے جھگڑے کے متعلق ہیں۔ چوتھی اور پانچویں آیت میں حفصہ اور عائشہ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر اُنھوں نے شکوے کرنے اور ایک دوسرے سے حسد کرنے والی یہ زنانہ حرکات جاری رکھیں تو وہ پیغمبر کو ناراض کرنے کا باعث بنیں گی، خدا اُس کا مددگار اور حامی ہے اور ممکن ہے پیغمبر تمھیں طلاق دے دے۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا

(اگر نبی تمھیں طلاق دے دے تو بہت جلد اس کا رب اس کے بدلے میں تم سے اچھی بیویاں دے دے گا فرمانبردار ایمان والیاں نمازی توبہ کرنے والی عبادت گزار روزہ دار بیوائیں اور کنواریاں۔ 5)۔

اس آیت کے معنی اور شان نزول واضح ہے لیکن تفاسیر میں سے ایک، شائد تفسیر کیمبرج یا تفسیر طبری میں جو مطالب بیان کیے گئے ہیں، اُنھیں پڑھ کر مفسر کی سادہ لوحی اور فرط ایمان پر ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ اپنے پیغمبر کی شان بڑھانے کے لیے یہ پاکباز اور خشک مزاج مفسر لکھتے ہیں: "بیوہ" کے لفظ سے مراد فرعون کی بیوی آسیہ ہے اور "کنواری" کے لفظ سے مراد حضرت مریم ہیں جو جنت میں حضور کا انتظار کر رہی ہیں اور حضور سے شادی کی خواہشمند ہیں"۔

اسی مناسبت سے شائد اچھا ہو گا کہ اسی مناسبت سے سورت التّحریم کی اوّلین آیات کی شان نزول کے حوالے سے جو دوسری روایت ہے، اسے بھی بیان کر دیا جائے۔

حضور نے زینب کے گھر سے شہد کھایا تھا۔ جب وہ وہاں سے باہر آئے تو زینب سے رقابت کی وجہ سے عائشہ اور حفصہ نے حضور سے کہا کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بدبو آرہی ہے۔ جب حضور نے یہ بات سنی تو شہد کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا لیکن بعد میں شائد اپنی قسم کھانے سے پشیمان ہوئے تو جھڑکنے والی سورت التّحریم نازل ہوئی اور قسم توڑنے کا کفارے کا تعین ہوا اور اپنی بیویوں کو دھمکی دی گئی کہ اگر

اُنھوں نے رقابت اور حسد کی روش سے توبہ نہ کی تو اُنھیں طلاق دے دی جائے گی۔ لیکن یہی سمجھا جاتا ہے کہ پہلی روایت درست ہے کیونکہ اس میں حفصہ سے راز کی بات کہنے اور راز کے فاش ہونے کا ذکر آیا ہے۔

قرآن میں خدا

زمین در جنب این نُہ طاق مینا
چو خشخاشی بود بر روی دریا
تو خود بنگر کزین خشخاش چندی
سزد گر بر بُروت خود بخندی

نیلے رنگ کے ان نو طاقوں کے پہلو میں زمین ایسے ہے جیسے سمندر کی سطح پر خشخاش کا دانہ ہو۔ تم خشخاش کے ان چند دانوں کے سامنے خود کو دیکھو گے تو اپنی مونچھوں پر خود ہنسنے لگو گے۔ [151]

چھ ہزار ارب (6×1021) ٹن وزنی، 40،076 کلومیٹر پر محیط اور 510,065,284 مربع کلومیٹر رقبے والا سمندر میں تیرتا خشخاش کا یہ دانہ چھوٹے سیاروں میں سے ایک ہے جو اپنے سورج کے گرد چکر لگانے میں 365 دن سے تھوڑا زیادہ وقت لیتا ہے اور اس کے آٹھ ساتھی سیارے بھی پہلے سے طے شدہ مدار میں حرکت کرتے ہیں۔ ان میں سب سے دور سیارہ پلوٹو ہے جو عطارد کی مانند چھوٹا ہے۔ یہ دونوں سیارے سورج سے ساڑھے چار ارب اور ساڑھے سات ارب سال کے فاصلے پر اپنے اپنے مداروں میں گردش کر رہے ہیں۔

151: فارسی ادبیات کے ایران سے پی ایچ ڈی استاد نے اس شعر کا مفہوم یوں بتایا ہے: ”زمین ان نو آسمانوں کے مقابلے میں ایسے ہی ہے جیسے سمندر کی موج پر کوئی ناچیز ذرہ، تو جو خود اس ذرے کا ناچیز حصہ ہے، اگر اپنی حیثیت پر تمہیں ہنسی آ جائے تو بالکل بجا ہے“۔ دشتی کے بقول یہ اشعار محمود شبستری کے ہیں، اور ایسا ہی کچھ دیگر سائٹس پر بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن فارسی کی مشہور سائٹ گنجور کے مطابق یہ اشعار فرید الدین عطار کی کتاب ”اسرار نامہ“ سے لیے گئے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس فاصلے کو تصور میں لا سکیں تو ہمیں ایک ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے ایک تیز رفتار جیٹ طیارے میں سفر کرنا ہو گا جو ستر سال بعد پلوٹو پہنچے گا۔

سائنسی اور ریاضیاتی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورج کی قوت کشش کے دائرہ اختیار کی آخری حد پلوٹو نہیں ہے بلکہ اس سے نکلنے کے لیے اس سے سو گنا زیادہ فاصلہ طے کرنا ہو گا۔ یعنی ایک ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے سات ہزار سال کے بعد ہم کسی دوسرے سورج کے دائرہ کشش کی سرحدوں تک پہنچ سکیں گے۔ اپنے تمام جاہ و جلال کے باوجود سورج ایک ایسی کہکشاں کے متوسط جسامت والے ستاروں میں سے ایک ہے جو موسم گرما کی راتوں میں آسمان پر ہمیں دودھیا رنگ کی لکیر کی مانند نظر آتی ہے۔ اس کہکشاں کے کائناتی غبار میں سے سات ہزار ستاروں کو شناخت کر لیا گیا ہے، یہ تمام سورج ہیں۔ اس بات کا احتمال ہونے کے علاوہ یہ مفروضہ عقل کے قریب تر ہے کہ ان سب کا ہمارے نظام شمسی کی مانند سیاروں کا اپنا نظام ہو گا۔

تقریباً 510,100,000 کلو میٹر رقبہ کے مالک، سمندر میں تیرتے، اس خشخاش کے دانے کا حجم 1,082,842,210,000 مکعب کلو میٹر ہے لیکن سورج کے مقابلے میں یہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر سورج کو ایک خول سمجھا جائے تو اس میں ہماری زمین کی جسامت والے دس لاکھ کُرّے سما جائیں گے۔ کیونکہ سورج اپنے نظام شمسی کے 99،86 فیصد مادے کا اکیلا مالک ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمام دیگر سیاروں اور اُن کی چاندوں کی 0.14 فیصد مادے سے تشکیل ہوئی ہے۔ جس میں زمین اور اس کے چاند کا حصہ سورج کے 0.0014 فیصد سے بھی کم ہے۔ فضا میں ایسے ستارے بھی موجود ہیں جو اپنی جسامت کی وجہ سے 510،100،000 کی جسامت والے ہمارے سورج کو اپنے جبڑوں میں دبا لیں۔ دودھیا کہکشاں میں موجود ان جسیم ستاروں میں سورج بھی ایک ستارہ ہے جس کا محیط 1,392,000 کلو میٹر اور حجم تقریباً 1،200،000،000 ارب ٹن ہے۔

تخمینے کے مطابق ہر کہکشاں میں ایک کھرب ستارے موجود ہیں۔ ان ستاروں کی زمین سے دوری کو عام ہندسوں کے ذریعے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے نوری سال کا پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ روشنی کی رفتار تقریباً 300,000 کلومیٹر فی سیکنڈ ہے اور ایک نوری سال سے مراد 9.4608 ارب کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ کچھ ستاروں کا زمین سے فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ اُن کی روشنی زمین پر لاکھوں سال بعد پہنچتی ہے۔

دماغ کو چکرا دینے والے ان ہندسوں سے کائنات کی وسعت کا مبہم سا احساس ہونے لگتا ہے اور کُرّہ زمین سمندر میں گرے خشخاش کے دانے سے بھی حقیر تر لگتا ہے۔

کائنات کی عظمت کے تصور سے ہی ہر سوچنے والے انسان میں عجز و انکساری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس وسیع اور بظاہر لا محدود کائنات کی کوئی حد ہے تو اُس کا احاطہ کرنا انسانی سوچ کی حدود اور دماغی صلاحیت سے بہت دور ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے تخیل اور تصور کی گستاخانہ پرواز بھی اس سمت میں ہماری راہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔

اگر اس لامتناہی کائنات کا کوئی آغاز اور انجام ہے تو وہ ہمارے فہم و ادراک سے بالا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے سوچنے کی صلاحیت بھی اُسے دریافت کرنے میں اپنے آپ کو عاجز پاتی ہے۔ اگر ہم اس بات کے قائل ہیں کہ اس عظیم کائنات کا کوئی خالق ہے تو پھر خالق کو اس کائنات سے بھی بڑا اور اس پر محیط ہونا ہو گا۔ اگر اس دہشت انگیز اور لا محدود مشینری کو کوئی کنٹرول کر رہا ہے تو ہمیں اُس کی لا محدود اور لامتناہی قوت کا قائل ہونا پڑے گا۔

ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس عظیم صانع کی لامحدود طاقت کے قائل ہوں اور اپنے محدود تصورات سے اُس کی برتری، عظمت اور پاکیزگی کے سامنے اپنی بیچارگی، کمتری اور حقیر پن کا اعتراف کریں جو مولوی (جلال الدین بلخی) کے بقول ”آنچہ اندر وہم ناید آن بود“ (جو ہمارے تصورات سے بالا ہے وہ ہے)۔

لیکن مشاہدات، مطالعہ اور دینی عقائد سے پتہ چلتا ہے کہ انسان ایسا نہیں سوچتے۔ اور سوائے چند لوگوں کے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، انسان اپنی حقیر زندگی کے کینوس کو بڑا کرتے ہوئے اُسے خدا کے بے پایاں نظام پر قیاس کرتے ہیں اور اسی طرح وہ اپنی ذات جو جذبات، تاثرات، کمزوریوں، نقائص اور تمام قسم کی اغراض و ہوس سے عبارت ہے، کو ذرا بڑا کرتے ہوئے اُسی کے نمونے پر خالق کی بے مثال ذات کو تخلیق کرتے ہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ جملہ حدیث ہے یا عہد نامہ عتیق سے عربی زبان میں آیا ہے[152]: "خلق الانسان علی شاکلته" (اللہ نے انسان کو اپنی شکل پر تخلیق کیا ہے)۔

اگر ہم اس جملے کو الٹا کریں اور کہیں کہ انسان نے اپنی شکل پر خدا کو تخلیق کیا تو یہ حقیقت کے زیادہ قریب ہو گا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بامعنی اور طنزیہ کتاب میرے ہاتھ لگی جس کا عنوان تھا: "اور موسیٰ نے خدا کو تخلیق کیا"۔ در حقیقت یہ عہد نامہ عتیق کی عبارت ہے "اور خداوند نے انسان کو پیدا کیا" جسے الٹا کیا گیا ہے یعنی موسیٰ نے اپنے تصور سے خدا کو پیدا کیا۔

پورے عہد نامہ عتیق میں جو خدا ہم پر ظاہر ہوتا ہے وہ ایک قہار، زود رنج، قوت برداشت سے عاری اور عبادت و ستائش کا بھوکا ہے۔ اپنی لاکھوں کی مخلوق میں اُس نے ابراہیم کو اپنا دوست گردانا، کیونکہ اُس نے بندگی کے لیے اپنا سر جھکایا تھا۔ چنانچہ اُس کی نسل کو اپنے لیے منتخب کیا، اُنھیں ایک برگزیدہ قوم کہا اور اُنھیں تمام کُرّہ ارض کی سلطنت کا مالک ٹھہرایا۔[153]

152: پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں اختیار رکھیں۔ اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اُس کو پیدا کیا۔ نرو ناری اُن کو پیدا کیا۔ (عہد نامہ عتیق۔ باب، پیدائش۔ آیت 27،26)۔

153: جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اُس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں۔ تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو۔ اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہو گیا اور خدا نے اُس سے ہم

چونکہ نوح کے بعد خداوند کو یہی مطیع اور تقدیس کرنے والا شخص ملا تھا، لہٰذا بڑھاپے میں اُس کی بیوی سارہ حاملہ ہوئی اور اسحاق پیدا ہوا۔ پورے کنعان میں کوئی ایسی دوشیزہ نہیں تھی جو اسحاق کی ہمسری کر سکتی اور خدا کی منتخب اُمّت کی نسل کو وجود میں لاسکتی۔ چنانچہ ابراہیم نے کسی شخص کو کالدیہ بھیجا اور اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی ربکا کا خواستگار ہوا کہ اُسے کنعان لائے۔ اس کے بعد خداوند نے بنی اسرائیل کی قوم سے عہد لیا کہ وہ سوائے اُس کے کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور اس کے عوض تمام دنیا کی حکمرانی اُنھی کی ہوگی۔ تورات میں اس عظیم حکومت کی تفصیل درج نہیں ہے۔ خدا کی توجہ پورے نظام شمسی میں صرف زمین اور زمین میں صرف فلسطین پر ہی مبذول ہوتی ہے۔

کلام ہو کر فرمایا۔ کہ دیکھ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو سب قوموں کا باپ ہوگا۔ اور تیرا نام پھر ابرام نہیں کہلائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرادیا ہے۔ اور میں تجھے بہت آبرومند کروں گا اور قومیں تیری نسل سے ہوں گی اور بادشاہ تیری اولاد میں سے برپا ہوں گے۔ اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان اُن کی سب پُشتوں کے لئے اپنا عہد جو ابدی عہد باندھوں گا تاکہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں۔ اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تُو پردیسی ہے ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے اور میں اُن کا خدا ہوں گا۔ پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پُشت در پُشت اُسے مانے۔ اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک اولادِ نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھال کا ختنہ کیا کرنا۔ اور یہ اُس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ پُشت در پُشت ہر لڑکے کا ختنہ جب وہ آٹھ روز کا ہو جائے خواہ وہ گھر میں پیدا ہو خواہ اُسے کسی پردیسی سے خریدا ہو جو تیری نسل سے نہیں۔ لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زرخرید کا ختنہ کیا جائے اور میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی عہد ہوگا۔ اور وہ اولادِ نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اُس نے میرا عہد توڑا۔ اور خدا نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے سو اُس کو ساری نہ پکارنا۔ اُس کا نام سارہ ہوگا۔ اور میں اُسے برکت دُوں گا اور اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا۔ یقیناً میں اُسے برکت دوں گا کہ قومیں اُس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اُس سے پیدا ہوں گے۔ (عہد نامہ عتیق: پیدائش، باب۔ 17)۔

ایک بار جب خدا کو نظر آتا ہے کہ سدوم اور گمورہ کے دونوں شہروں کے لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے ہیں تو وہ غضبناک ہو کر دونوں شہروں کو تباہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ابراہیم جو خدا سے زیادہ نرم دل تھا، کی استدعا اور شفاعت کا بھی خدا پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور پھر بجلی گرتی ہے جس سے ہر چیز جل جاتی ہے ۔ مرد اور عورتیں حتیٰ کہ بے گناہ بچے بھی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم کی اشک شوئی کی خاطر فرشتہ بھیجا جاتا ہے تاکہ اُس کے بھتیجے لوط کو اس قتل عام سے بچایا جائے۔ پوری تورات میں خدا ہمیں ایک مطلق العنان، بے رحم، تقاضے کرنے والے اور لاپرواہ بادشاہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ موسیٰ بھی ہمیں ایسی خواہش میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ وہ داؤد اور سلیمان کی طرح بنی اسرائیل پر حکم رانی کریں اور حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کی عورتوں سے بھی چشم پوشی نہ کریں[154]۔

قرآن میں خدا کمال کی تمام صفات سے آراستہ ہے۔ وہ دانا، طاقتور، بے نیاز، دیکھنے والا، سننے والا، عاقل اور مہربان ہے۔ اور تمام کائنات اُس کی مرضی کے تابع ہے۔

154: اس کتاب میں "اور میا" کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتابت کی غلطی ہے اور یہاں اوریا ہونا چاہیے تھا۔ اوریا حتّی مشہور نبی داؤد کے امراء اور سرداروں میں سے تھا۔ عہد نامہ عتیق یعنی تورات میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔ "اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اُٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اُس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوب صورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اُس عورت کا حال دریافت کیا۔ اور کسی نے کہا کہ وہ اِلعام کی بیٹی بت شبع نہیں جو حتِّی اوریا کی بیوی ہے؟۔ اور داؤد نے لوگ بھیج کر اُسے بلا لیا۔ وہ اُس کے پاس آئی اور اُس نے اُس سے صحبت کی۔ پھر وہ اپنے گھر کو چلی گئی۔ اور وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ سو اُس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں۔ اوریا جو شہر سے باہر گیا ہوا تھا، داؤد نے اُسے پاس بلایا اور چند دن بعد اُسے ایک خط دے کر اپنے دشمنوں کے خلاف ایک ایسی جنگ پر بھیج دیا جسے جیتنا ممکن نہیں تھا۔ اُس خط میں داؤد نے سپہ سالار یوآب کو حکم دیا تھا کہ اوریا کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تُم اُس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے۔ تو اُس نے اوریا کو ایسی جگہ رکھا جہاں وہ جانتا تھا کہ بہادر مرد ہیں چنانچہ اوریا قتل ہو گیا۔ داؤد نے اوریا کی بیوی سے شادی کر لی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد توبہ کی جو خدا کے حضور قبول ہوئی"۔ عہد نامہ عتیق، کتاب سموئیل دوم، باب 11 اور 12۔ سلیمان نبی اسی عورت سے پیدا ہوا۔

لیکن کچھ اور صفات جیسے جبّار، قہار، منتقم اور کینہ پرور بھی اُس کی ذات سے منسوب کی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ غصے اور مکر و فریب کی صفات سے بھی بہرہ مند ہے اور کبھی کبھار "خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ" یعنی سب سے بڑا مکار بن جاتا ہے۔

کیا یہاں پر ایک تضاد نظروں کو نہیں کھٹکتا؟۔ اگر خدا قائم بالذات اور کاملیت کا مطلق نمونہ ہے تو ناگہانی حالت میں اُس پر غصے اور انتقام لینے کی کیفیت کیوں طاری ہو جاتی ہے؟۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بے نیاز اور قادر مطلق خدا غصے کے عارضے کا شکار ہو کر کمزوری کی کیفیت کا اظہار کرے۔ کیونکہ صفات اور خواص ذات کا حصہ ہوتی ہیں جیسے غصہ انسانی صفت ہے۔ اگر کوئی واقعہ کسی شخص کی مرضی یا خواہش کے مطابق وقوع پذیر نہیں ہوتا تو غصے کی کیفیت اُس پر غلبہ پا لیتی ہے۔ وہ جو ایک مطلق، بے نیاز صانع اور کائنات کا حقیقی خالق ہے مٹھی بھر لوگوں سے، جو اپنی بیوقوفی اور حماقت کی وجہ سے اُسے شناخت نہیں کر پاتے، کیوں ناراض ہوتا ہے؟ اور "غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"، بلکہ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" ہونے کے باوجود فرماتا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ" (بے شک اللہ اس کو نہیں بخشتا جو کسی کو اس کا شریک بنائے: النساء۔ 116) اور وہیں اُن کے لیے ہمیشہ کے لیے عذاب مقرر کرتا ہے حالانکہ اُس نے خود فرمایا ہے: "اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" (اور بے شک اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا: الأنفال۔ 51)۔ یعنی اللہ عدل کی صفت سے آراستہ ہے لیکن گناہ گاروں کو آتش جاوداں میں پھینک دیتا ہے۔ مبادا گناہ گار یہ سوچیں کہ وہ جلنے کے بعد معدوم ہو جائیں گے اور اُن پر عذاب ختم ہو جائے گا، تو اس خوش فہمی کو دور کرنے کے لیے قرآن میں فرمایا گیا ہے:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ

(جس وقت ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم اُن کو اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ عذاب چکھتے رہیں: النِّسَاء۔56)۔

کیا اس شدتِ عمل اور کبھی نہ ٹھنڈے ہونے والے غصے کا کوئی جواز دریافت کیا جا سکتا ہے اور غصّہ، جو کمزوری اور عجز کی نشانی ہے، کو قادر مطلق خدا سے منسوب کیا جا سکتا ہے؟

قرآن میں بے شمار آیات ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قسم کی ہدایت اور گمراہی اللہ کی طرف سے ہے اور وہیں بے شمار آیات ایسی ہیں جن میں انسانوں پر فرائض عائد ہوئے ہیں جن کی پابندی نہ کرنے پر شدید عذاب و مصائب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کبھی کبھار دانائے مطلق اور مطلق طاقت کے مالک کو انسانوں کی مدد اور کمک کی ضرورت ہوتی ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوٰرِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوٰرِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ

(عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں: الصّف۔14)۔

وَاَنزَلْنَا الحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ

(اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے: الحدید۔25)

آیئے، اُن اصولی مباحث کو دیکھتے ہیں جن پر صدیوں سے قرآن کے شارحین اور علم الکلام کے ماہرین نے تفاسیر و تاویلات لکھی ہیں، تاکہ تضادات یا کم از کم اس کے برعکس رنگ اور تفاوت کو دور کریں۔ اب ہم قرآن کے صرف اُس مواد کا سرسری اور اجمالی جائزہ لینے پر اکتفا کریں گے جو 23 سال کے دور رسالت کے واقعات سے متعلق ہے

جب گستاخ ابو لہب نے پیغمبر سے کہا: "تبالک یا محمد الھذا دعوتنا؟" (محمد تم تباہ ہو جاؤ، کیا اس لیے ہمیں یہاں بلایا ہے؟) تو خداوند عظیم جو اس کائنات کا خالق ہے، بہت غصے میں آیا اور ایک دم سے سورت المَسَد نازل فرمائی، حتیٰ کہ اُس کی بیوی کو بھی اپنی تحقیرانہ کڑک سے معاف نہیں رکھا۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ۔ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ۔ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۔

(ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔ نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا اور نہ وہ جو اس نے کمایا۔ وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہو گا۔ اور اس کی جورو بھی جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے۔ اس کے گلے میں مونج کی رسّی ہو گی: 1 تا 5)۔

خدائے عظیم جب ابو الاشد کے غرور اور خود ستائی سے تنگ آ گئے تو اُس کے تکبّر اور خود ستائی کو سورت البَلَد میں جوابی تازیانہ رسید کیا۔ سورت الھُمَزة بھی ایک ایسا ہی تازیانہ ہے جو ولید بن مغیرہ اور امیہ بن خلف کو رسید کیا گیا جنھوں نے حضور کے سامنے اپنی دولت پر غرور کیا اور ایک دوسرے کو آنکھ مارتے ہوئے نوکیلے جملوں سے حضور کا مذاق اڑایا تھا۔

اسی طرح کا جواب عاص بن وائل کو سورت الکوثَر میں بھی دیا گیا، جس نے کہا تھا کہ مرنے کے بعد محمد وارث کے بغیر اور ابتر ہو گا۔ جنگ بدر کے بعد کعب بن اشرف کے مکّہ سفر پر بھی خدائے عظیم و خالق کائنات بہت ناراض ہوئے۔ خصوصی طور پر کہ کعب بن اشرف جو یہودی ہونے کے ناطے اہل کتاب تھا اور محمد جو خدا پرست اور توحید کے ماننے والے تھے، کے مقابلے میں مشرکین سے بدر میں شکست پر ہمدردی کا اظہار کیا۔ سورت النِّسَاء کی آیات 51، 52، 53 اور 54 میں اسی تلخی کا اظہار کیا گیا ہے۔

سورت الحشر خدائی رجز خوانی ہے جو بنو نضیر کے قلع قمع کرنے کے متعلق ہے کیونکہ وہ یہودیت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسی مناسبت سے عبداللہ بن عباس نے اس سورت کو سورت بنی النضیر کا نام دیا تھا۔

خدا نے قرآن میں اپنے پیغمبر کے مخالفین اور ہر اُس انسان جس نے پیغمبر کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں، پر ناراضگی کا اظہار کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ پیغمبر کے داخلی معاملات اور متعدد بیویوں سے جھگڑے پر بھی مداخلت کی۔ ان میں سے پیش آنے والی ایک مشکل زید بن حارثہ کی بیوی زینب بنت جحش سے پیغمبر کی محبت تھی۔ جس کے لیے زید کے دل میں زینب کے لیے کراہت پیدا کی گئی۔ چنانچہ طلاق اور عدّت کے مکمل ہونے کے بعد اُسے اپنے پیغمبر کے زوجیت میں دے دیا۔ اسی سورت الأحزَاب میں بیویوں کی طرف سے نفقہ میں اضافہ کے مطالبے کی مشکل کا پیغمبر کو سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ بنو قریظہ کے قتل عام کے بعد بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگا اس لیے پیغمبر کی بیویوں نے زیادہ نفقے کا مطالبہ کر دیا۔ لیکن خدا فرماتا ہے کہ اسی نفقے پر قناعت کرو وگرنہ طلاق دے دی جائے گی اور یوں اس دھمکی سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور مشکل پیش آتی ہے۔ سورت التّحریم کی کافی آیات اسی سے متعلق مخصوص کی گئی ہیں اور وہ مسئلہ پیغمبر کا ماریہ قبطیہ سے ہم بستر ہونا اور حفصہ کا واویلا تھا جس کی تفصیل اس سے پہلے باب میں دی گئی ہے۔

عائشہ اور حفصہ کے حسد اور رسول کو ناراض کرنے سے اللہ بہت ناراض ہوا اور اُن دونوں عورتوں کو تنبیہ کی کہ اگر تم نے توبہ نہ کی اور پیغمبر کی ناراضگی کا باعث بنیں تو خدا، جبرئیل اور صالح مومنین ایک دم اُس کی مدد کو پہنچیں گے اور اگر ایسا ہو گیا اور پیغمبر نے تمھیں طلاق دے دی تو خدا اپنے پیغمبر کو تم سے بہتر عورتیں عطا کرے گا جو مسلمان، مطیع، روزے رکھنے والی، نماز ادا کرنے والی، مہاجر، بیوہ اور باکرہ ہوں گی۔

ایک تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ یہاں بیوہ عورت سے مراد فرعون کی بیوی آسیہ اور باکرہ سے مراد حضرت مریم ہیں، جو دونوں بہشت میں حضور کی بیویاں بنیں گی۔ چونکہ قرآن ایسا کچھ میں نہیں فرمایا گیا، لہذا یہ تفسیر مفسر کی ذہنیت کی عکاس ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

سورت النُّور کی بنیاد افک کا قضیہ اور حضرت عائشہ پر لگایا گیا بہتان تھا۔ چنانچہ اسی رُو سے اُس سورت میں پاکباز عورتوں کو بدنام کرنے پر حدّ کا تعین ہوا۔ اور حدود کے اصول کے اُلٹ حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش کو اسّی کوڑے مار کر عائشہ کی پاکدامنی کو ثابت کیا گیا۔

622ء سے 632ء کے سالوں کے درمیان تمام لامتناہی کائنات خدا کو بھول چکی تھی۔ حتیٰ کہ کرّہ ارض کے دیگر ممالک نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی کہ نجد و حجاز کے مٹھی بھر لوگ خدا کے متعلق سوچنے میں مشغول ہیں، جو کبھی ڈر سے یا سستی کی وجہ سے غزوات میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھیں سزا دینے کے لیے دوزخ کی آگ کو مزید بھڑکایا گیا، اور اس کے برعکس جو لالچ یا ایمان کی وجہ سے یا مال غنیمت حاصل کرنے کے لالچ میں بہادری اور استقامت کا ثبوت دیتے تھے، اُنھیں "جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" (جنت جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں[155]) سے نوازا گیا۔ اور جب کبھی خدا کا محبوب رسول لوگوں کے تمسخر و طعنوں سے رنجیدہ ہوا تو اُس کی دلداری کرتے ہوئے کہا گیا کہ اُنھیں میرے سپرد کر دو: "اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ" (بیشک ہم تمہارا اٹھٹھا کرنے والوں کے لیے کافی ہیں: الحِجر۔ 95)۔

155: نوٹ۔ تمام قرآنی آیات کا ترجمہ ایک پاکستانی سائٹ سے کاپی پیسٹ کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں "نھر" دریا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی کے علاوہ ترکی زبان میں بھی دریا کو "nehir" ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن اور احادیث میں جہاں کہیں بھی "الْاَنْهٰرُ" کا لفظ آیا ہے تو اُس کا ترجمہ ہمارے ہاں دریا کی بجائے نہریں ہی کیا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ پیغمبر اسلام جب معراج پر جاتے ہیں تو واپس آکر لوگوں کو بتاتے ہیں کہ فرات، نیل، سیحان اور جیحان، یہ چاروں جنت سے پھوٹتے ہیں۔ صاف بات ہے کہ یہ نہریں نہیں بلکہ دریا ہیں۔ اس غلطی کی نشاندہی کرنے کے باوجود میں نے یہاں اور باقی جگہوں پر دریا کی بجائے نہریں ہی لکھا ہے، کیونکہ ہمارے ہاں یہی ترجمہ مستعمل ہے۔

عربوں کے امور میں باری تعالیٰ کی سب سے اہم اور مؤثر ترین مداخلت جنگ بدر کے دوران ہوئی۔ پوری سورت الأنفَال کا موضوع یہی واقعہ ہے۔

کثیر ساز و سامان سے لدا قریش کا قافلہ ابو سفیان کی سربراہی میں دمشق سے مکّہ روانہ ہوتا ہے۔ حضرت محمد کو اس بات کی خبر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی معیت میں اس قافلے پر حملہ کرنے اور لوٹنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ ابو سفیان کو اس بات کی بھنک پڑ جاتی ہے اور وہ مکّہ سے کمک طلب کرتا ہے۔ کاروان کی مدد کے لیے قریشی جنگجوؤں کی معیت میں ابو جہل مکّہ سے روانہ ہوتا ہے۔ کمک کے پیغام کے ساتھ ہی ابو سفیان احتیاط کے طور پر اپنا راستہ بدل لیتا ہے اور ساحل سے ہوتا ہوا قافلے کو با حفاظت مکّہ پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ابو سفیان کے قافلے کا پیچھا کرنے کی بجائے محمد اور اُن کے ساتھی بدر کی میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو یہ سوچ کر ساتھ آئے تھے کہ کسی مشکل کا سامنا کیے بغیر وافر مقدار میں مال غنیمت حاصل کر پائیں گے، اب اُنھیں قریشی جنگجوؤں کا سامنا تھا، لہٰذا اُن کی ہچکچاہٹ اور مدینہ واپس جانے کا فیصلہ ایک فطری بات تھی۔ سورت الأنفَال کی آیت میں اسی موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں خدا اُن کو ملامت کرتے ہوئے کفّار سے جنگ کے سلسلے میں حوصلہ بڑھاتا ہے اور آیت 9 میں فرشتوں کی کمک بھیجنے کا وعدہ فرماتا ہے۔ اور آیت 19 میں ابو جہل کے انجام کو واضح انداز میں فرمایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ محمد کو مخاطب کیا جاتا ہے:

”وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ“ (اور تو نے مٹھی نہیں پھینکی جب کہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ 17)۔ یعنی ریت کی وہ مٹھی جو تم نے کفار کی جانب پھینکی تھی اور وہ اندھے ہو گئے تھے اسے تم نے نہیں پھینکا تھا کیونکہ ریت کی ایک مٹھی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ پورے لشکر کی آنکھوں میں چلی جائے، لہٰذا خدا نے اُس مٹھی بھر ریت کو پھینک کر اُنھیں اندھا کیا تھا۔

مشرکین کی شکست کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کی مشکل پیش آئی۔ اللہ نے سورت الأنفال کی آیت 41 میں مال غنیمت کے پانچویں حصے کو رسول اور بیت المال کے لیے مخصوص کرتے ہوئے آئندہ کے لیے مال غنیمت کی تقسیم کا طریقہ ترتیب دیا۔

اس کے بعد مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ خدا شروع میں عمر بن خطاب کی رائے سے متفق ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا رعب طاری کرنے کے لیے تمام قیدیوں کی گردن ماردی جائے: "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ" (نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں قیدیوں کو رکھے جب تک زمین میں اُن کا خون خوب نہ بہائے۔ 67)۔ لیکن بعد میں ابو بکر کی معتدل رائے سے متفق ہوتا ہے کہ قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّمَنْ فِىْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَـكُمْ۔

(اے نبی! جو قیدی تمھارے ہاتھ میں ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمھارے دلوں میں نیکی معلوم کرے گا تو تمھیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھیں بخشے گا۔ 70)۔

پوری سورت الأنفال مسلمانوں کے مشرکین اور یہودیوں سے پیدا ہونے والے کے بارے میں وقف کی گئی ہے۔ سورت الأحزاب کی آیت 9 بھی خدائی مداخلت کا اظہار کرتی ہے جب بنو غطفان اور قریش کے اتحاد نے مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کیں اور چند ہزار لوگوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

(اے ایمان والو! اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم پر کچھ لشکر آئے تو ہم نے ان پر آندھی اور وہ لشکر بھیجے جو تمھیں نظر نہ آئے)۔

اور اس کے بعد اسی سورت کی آیت 10،12،13 میں بھی مسلمانوں کو پیش آنے والے ناخوشگوار حالات میں مدد پہنچانے کی خدائی مداخلت واضح ہوتی ہے۔

تفسیر کیمبرج اس واقعے کی یوں تشریح بیان کی گئی ہے: چنانچہ خدا نے ہوا بھیجی جس سے اُن کی خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں اور اُن کی آگ بجھ گئی اور اُن کے طویلے کو تباہ کر دیا جس سے گھوڑے ایک دوسرے پر گرنے لگے اور فرشتوں نے "اللہ اکبر" کے نعرے بلند کیے۔ اس خوش عقیدہ مؤمن مفسر کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آیا کہ خدا نے بیس روز قبل یہ ہوا مدینہ کیوں نہ بھیجی، تاکہ محمد اور اُن کے ساتھی خندق کھودنے، اُس کی نگرانی کرنے اور دن رات کی بے چینی سے بچ جاتے۔ اور اس کے علاوہ اُن وقتوں کے اور بعد کے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات کیوں نہ آئی، کہ خدا نے جنگ بدر میں جو فرشتے بھیجے تھے یا طوفان جو جنگ خندق میں بھیجا تھا، اُنھیں جنگ احد میں کیوں نہ بھیجا، تاکہ وہ تباہی پیش نہ آتی اور مسلمانوں کو دردناک شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اور ستّر مسلمان جو دلیر اور بہادر تھے اور محبوب پیغمبر کے گرد جمع تھے شہید ہونے سے بچ جاتے۔ اگر اُس ہوا یا فرشتوں نے جنگ احد میں شرکت کی ہوتی تو پیغمبر کے دانت پتھر سے نہ ٹوٹتے، اور وہ تلخ اور شرمناک صورت حال پیش نہ آتی، کہ اگر علی بن ابو طالب کا مردانہ و شجاعانہ دفاع موجود نہ ہوتا، تو خود حضور بھی شہید ہو جاتے۔

قرآن کے مطالعے سے اُن وقتوں کے حجاز کے سماجی حالات کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگتی ہے۔ احکام اور اخلاقی تعلیمات سے قطع نظر قرآن کے ایک خاصے حصے سے ہمیں اُن وقتوں میں ہونے والے تنازعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ قرآن کی سینکڑوں آیات سے تنازعات، مخالفین کو جوابات، شخصی و ذاتی معاملات کے متعلق فیصلے، لوگوں کو جنگ پر جانے کے لیے ابھارنے اور حتیٰ کہ کچھ لوگوں کو جو کمزوری یا سستی کی وجہ سے اس سے پہلو تہی کرتے ہیں، ملامت کرتے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح کثیر مال غنیمت کا وعدہ، دوسروں کے مال اور عورتوں پر قبضے کی نوید، مخالفین کو دھمکیاں

اور منکرین کو دائمی عذاب کا ذکر بھی نظر آتا ہے۔ خدائی عذاب کی بجلی داموکلیس کی تلوار[156] کی مانند فضا میں معلق ہوتی ہے جس سے سب نیک سیرت اور بدکار جل کر راکھ ہو جاتے ہیں اور مٹھی بھر نافرمانوں کی وجہ سے گاؤں یا شہر منہدم ہو جاتے ہیں۔

جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو وہ تمام کیفیات جو انسانی ذات کا حصہ ہیں ہمیں خدا میں نظر آتی ہیں: وہ راضی ہوتا ہے، وہ غضبناک ہوتا ہے، محبت کرتا ہے، نقصان پہنچاتا ہے، خوش ہوتا ہے۔ مختصر لفظوں میں کینہ، محبت، غصہ، انتقام لینا حتیٰ کہ مکر و فریب اور تمام وہ خامیاں جو جلد باز، کمزور اور حاجت مند انسان کا خاصہ ہیں، ہمیں باری تعالیٰ کی پاک ذات میں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ خدا اس بیکران کائنات کا خالق اور صانع ہے، تو عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ خدا کی ذات کو ان صفات سے مبراء سمجھیں۔ اور ایسی صورت میں پھر ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہتا کہ خالق کائنات سے منسوب ان اوصاف کو حضور کی بشری سوچ کا اظہار سمجھیں۔ جنھوں نے خود فرمایا ہے: میں بھی انسان ہوں، مجھے بھی غصہ آتا ہے، میں بھی متاثر ہوتا ہوں۔ اسی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کی موت پر بہت روئے[157] یا اپنے

156: داموکلیس (Damocles) دیونیسیوس دوم (Dionysius II of Syracuse) کا درباری تھی۔ جو چار سو سال قبل مسیح میں سسلی کا حاکم تھا۔ داموکلیس نے بادشاہ کی خوش قسمتی پر رشک کا اظہار کیا کہ وہ کس قدر نعمتوں اور اختیار کا مالک ہے۔ دیونیسیوس نے داموکلیس کو ایک دن کے لیے بادشاہ بننے کی پیشکش کی تاکہ وہ بادشاہت کی حقیقت جان سکے۔ داموکلیس نے اس پیشکش کو بہت خوشی سے قبول کیا۔ داموکلیس کو تخت پر بٹھایا گیا اور اُس کے سامنے خوبصورت عورتوں سمیت تمام نعمتیں اکٹھی کر دیں گے، اور پھر ایک ننگی تلوار کو گھوڑے کی دُم کے ایک بال سے باندھ کر تخت کے اوپر لٹکا دیا گیا۔ تلوار کسی وقت بھی گر سکتی تھی۔ یہ صورت دیکھ کر داموکلیس نے التجا کی کہ اُسے جانے دیا جائے، وہ بادشاہ جیسا خوش قسمت بننا نہیں چاہتا۔ اس واقعے سے بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ داموکلیس کو احساس دلایا جائے کہ جتنی بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے، اتنے ہی بڑے خطرات اُس سے وابستہ ہوتے ہیں۔

157: وہ اس خبر سے اس قدر صدمے کی حالت میں تھے کہ اُن سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے سہارا دینے کو کہا۔ آپ جلدی سے باغ پہنچے تاکہ ماں کی گود میں دم توڑتے بچے کو الوداع کہہ سکیں۔ حضور نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے بچے کو اُٹھا کر اپنی گود میں لیا۔ اس سانحے سے آپ کا دل پھٹا جا رہا تھا اور اندرونی کرب آپ کے چہرے سے عیاں تھا۔ آپ نے رندھی ہوئی آواز میں اپنے بیٹے سے کہا "اے ابراہیم! خدا کی مرضی کے خلاف ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے"۔ اس کے بعد آپ کی آواز نے آپ کا ساتھ

چچا حمزہ بن عبد المطلب کی مُثلہ شدہ لاش دیکھ کر آپے سے اس قدر باہر ہو گئے کہ انہوں نے قسم کھائی کہ میں تیس قریشیوں کو مُثلہ کروں گا۔

یہاں پر ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ قرآن کے اندر اللہ اور محمد حیرت انگیز طور پر آپس میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ اور یہی وہ واحد توجیہ ہے جو قرآن کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کو حل کر سکتی ہے، اور اگر ہم اس موضوع کو اسی انداز سے دیکھیں تو شائد ہم پر کچھ واضح ہو سکے۔ تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن خدائی کلام ہے اور قرآن میں کئی بار اس بات کو واضح بھی کیا گیا ہے۔ "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" (اور نہ وہ اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہے یہ تو وحی ہے جو اس پر آتی ہے: النّجم۔ 3،4) اور "إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" (بیشک ہم نے اسے شبِ قدر میں اتارا: القدر۔ 1)۔

قرآن ہر حوالے سے مسلمانوں کی واحد ایسی دستاویز ہے جو اُن کے لیے باعث تکریم اور باعث فخر ہے اور ہر مسلمان اس پر بلا کسی شک کے ایمان رکھتا ہے۔ جس کی انتہا یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے ایک صدی بعد علمائے اسلام کے درمیان طویل مباحث ہوئے جو کئی صدیوں تک جاری رہے کہ قرآن

نہیں دیا اور آپ زار و قطار رونے لگے۔ بچے کو مرتے دیکھ کر اُس کی ماں اور خالہ نے زور زور سے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا، آپ نے اُنھیں چُپ کرنے کو نہیں کہا۔ جب ابراہیم کی موت ہو گئی تو آپ کی جو تھوڑی بہت امید تھی وہ بھی ٹوٹ گئی۔ آنسو بھری آنکھوں سے آپ نے پھر کہا: "اے ابراہیم! اس سچ کا اگر ہمیں پہلے سے یقین ہوتا تو ہم اور بھی زیادہ دکھ کا اظہار کرتے جتنا کہ اب کر رہے ہیں۔ کچھ دیر توقف کے بعد آپ نے کہا: "ہماری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور ہمارا دل دُکھ رہا ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے رب راضی نہ ہو، بیشک ابراہیم تمہارا جانا ہمارے دل کو چیر رہا ہے۔ (حیات محمد، محمد حسین ہیکل)۔

مکحول کہتے ہیں کہ ابراہیم کی روح نکلنے کا عالم تھا کہ رسول اللہ عبد الرحمٰن بن عوف کے سہارے آئے۔ ابراہیم انتقال کر گئے اور آنحضرت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ عبد الرحمٰن بن عوف نے کہا: "یا رسول اللہ! یہی بات ہے جس سے آپ مسلمانوں کو منع فرماتے تھے۔ مسلمان جب آپ کو روتا دیکھیں گے تو سبھی رونے لگیں گے۔

حادث یعنی مخلوق ہے یا قدیم۔ یعنی عدم سے وجود میں نہیں آیا بلکہ ذات باری تعالیٰ کی طرح ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔

ابھی ہم اس بحث کو رہنے دیتے ہیں کہ قرآن کے قدیم ہونے کا دعویٰ نہ تو عقلی بنیادوں پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی اسلامی شریعت اور علم الکلام کے اصولوں کے مطابق ہے۔ لیکن قرآن کے قدیم ہونے کے دعوے کی خاطر اہل سنّت کے عظیم امام احمد بن حنبل [158] نے عباسی خلیفہ معتصم باللہ کے زمانے میں اتنے کوڑے کھائے کہ بے ہوش ہو گئے۔ لیکن اپنے عقیدے سے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا کہ قرآن کو مخلوق یا حادث مانیں۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ ''تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَـهَبٍ وَّتَبَّ'' (ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو) والی آیت بھی خدا کی ذات کی مانند ازل سے موجود رہی ہے۔

جب کسی جماعت پر بخار غلبہ پالیتا ہے تو انہیں الفاظ، استدلال سے خاموش یا پُر سکون نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآن کو پڑھنے اور بعض مطالب پر غور و تعمق کرنے سے یہ آشکار اور واضح ہوتا ہے کہ قرآن انسانی فکر کی تخلیق ہے۔ نمونے کے طور پر ہم سورت الفَاتِحَة کو دیکھتے ہیں جسے ''سبع الثانی'' کا نام دیا گیا

158: امام احمد بن حنبل اہل سنّت کے آئمہ اربعہ میں سے ایک اور فقہ حنبلی کی بانی تھے۔ قرآن کو حادث نہ ماننے کی وجہ سے عباسی خلیفہ معتصم باللہ کے زمانے میں کوڑے کھائے، پابند سلاسل رہے، واثق باللہ کے زمانے میں بھی قید رہے، اُس کے بعد اگلے خلیفہ المتوکل کے زمانے میں رہا ہوئے۔ اُن کے نزدیک دین کو الٰہیات کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ خدا نے انسان کو ہدایت بھیجی ہے، لہٰذا ہمیں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب اللہ نے قرآن کے ذریعے اور نبی نے اپنی سنّت کے ذریعے ہمیں تمام ضروری معلومات دے دی ہیں، تو کسی اور طرف دیکھنا قطعی غیر ضروری ہے۔ ان کے نزدیک قرآن علم الکلام کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا مذہب کی حمایت میں الٰہیات کے دلائل استعمال کرنے والے لوگ اہل سُنّت میں سے نہیں ہیں خواہ وہ بیشک اس سے سُنّت پر ہی پہنچیں۔ اگر کوئی ایسی باتوں کے متعلق بحث کرے جو رسول نے نہیں کی تو وہ غلطی پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد بن حنبل نے ساری عمر تربوز اس لیے نہیں کھایا کہ انہیں کوئی ایسی روایت نہیں مل سکی کہ نبی نے تربوز کھایا ہو۔

ہے۔ اسے قرآن کی اہم ترین سورتوں میں سے گنا جاتا ہے، اسی وجہ سے یہ قرآن میں سب سے پہلے درج ہے۔ سورت الفاتِحَة خدا کا کلام نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرت محمد کا اپنا کلام ہے۔ کیونکہ اس میں خدا کی ستائش ہے، کائنات کے رب کے حضور میں اظہار بندگی ہے اور ہدایت و عنایت کی تمنا کی گئی ہے۔ خدا خود یہ نہیں فرما رہا:

اَلحَمدُلِلّٰہِ رَبِّ العالَمین۔ الرَّحمٰنِ الرَّحیمِ۔ مالِکِ یومِ الدّینِ (سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے بڑا مہربان نہایت رحم والا۔ روز جزا کا مالک)۔

اگر سورت فاتحہ کا آغاز "قُل" کے لفظ سے کیا جاتا جیسے کہ قرآن کی کئی آیات یوں شروع ہوتی ہیں "قُل ھُوَاللّٰہُ اَحَدُ"۔ "قُل یا اَیھُاَ الکافِرُونَ"۔ "قُل اِنَّما اِنا بَشَر مِثّلِکُم" تو یہ مشکل پیش نہ آتی۔

یہ بات منطقی اور معقول نہیں ہے کہ خدا خود فرما رہا ہے: "اِھدِنا الصَراطَ المُستَقیم۔ صِراطَ الّذینَ اَنعَمتُ عِلَیھِم غَیرِ المَغضوب عِلَیھِم ولا الضالِین" جس کے معنی انتہائی واضح ہیں کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

سورت فاتحہ مکمل طور پر بارگاہ الٰہی میں نیاز مندی کے اظہار کے علاوہ ستائش خداوندی ہے۔ چنانچہ اسے خدائی کلام نہیں بلکہ محمد کا کلام سمجھا جانا چاہیے جو اُنھوں نے نماز کے لیے ترتیب دیا تھا۔ اسی وجہ سے عبداللہ بن مسعود جو ایک معتبر کاتب وحی ہونے کے علاوہ حافظ قرآن بھی تھے وہ اسے اور دو اور سورتوں (النَّاس، الفَلَق) کو قرآن کا حصہ نہیں مانتے تھے۔ اسی طرح سورت المَسَد کو اس کے مضمون کی وجہ سے پروردگار عالم سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سورت ابولہب کی پرخاش اور بے ادبی کا جواب تھا۔ حضور نے اپنے رشتہ داروں اور قریش کے معتبر لوگوں کو بلایا کہ اُنھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں۔ جب حضور اپنی بات کہہ رہے تھے تو ابولہب کو غصہ آیا اور اُس نے کہا: "تبالک یا محمد! " کیا یہ بے سروپا باتیں سنانے کے لیے ہمیں یہاں بلایا ہے؟۔ اسی رُو سے اس سورت میں وہی لفظ "تَبَّ"

استعمال ہوا ہے۔ پیغمبر کو جس بے عزتی کا سامنا ہوا، اور ابو لہب کی بیوی اُم جمیل جو آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتی ہے، کو اگر ذہن میں رکھیں تو سورت المسد میں استعمال کیے گئے الفاظ کا استعمال نامناسب نہیں لگتا۔ لیکن یہ بات خالق کائنات اور قادر مطلق کی شان کبریائی سے بالکل میل نہیں کھاتی کہ وہ ایک نادان عرب کو بُرا بھلا کہے، اور نفرت کا اظہار کرے، اور اُس کے بیوی کو "حمالۃ الحطب" یعنی دوزخ کی آگ کے لیے لکڑیاں اٹھائے ہوئے قرار دے۔

قرآنی آیات میں جملے کا فاعل کبھی شخصِ اوّل(First Person) اور کبھی شخصِ سوم (Third Person) ہے۔ مثلاً پہلے خداوند بات کرتے ہیں اور بعد میں محمد خدا کی جانب سے بات کرتے ہیں۔ جیسے سورت النّجم میں پہلے خدا ایک بات کہتے ہیں اور بعد میں حضور اُس کی تائید کرتے ہیں: "ما ضَلَّ صاحِبُکُم وَما غَویٰ۔ وَما یَنطِقُ عَنِ الھَویٰ۔ إن ھُوَ إلّا وَحیٌ یوحیٰ" (اور نہ وہ اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہے ۔ یہ تو وحی ہے جو اس پر آتی ہے: 3۔4)۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ آیت 20 سے آیت 28 سے لگتا ہے کہ یہاں حضور بات کر رہے ہیں۔ اور کس عتاب اور ملامت سے فرماتے ہیں: "اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی" (کیا تمہارے لیے بیٹے اور اُس کے لیے بیٹیاں ہیں؟)۔ کیا خدا خود یہ پوچھ رہا ہے کہ اُس کے لیے بیٹیاں!۔ بیٹوں پر فخر کرنا اور بیٹیوں کو باعث ننگ شمار کرنا حجاز کے عربوں کی اقدار و رسوم کا حصہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں یہ اُسی سوچ کا اظہار ہوا ہے۔

اَفَاَصفیکُم رَبُّکُم بِالبَنینَ وَاتَّخَذَ مِنَ المَلائِکَۃِ إناثاً إنَّکُم لَتَقُولُونَ قَولاً عَظیماً

(کیا تمہارے رب نے تمہیں چن کر بیٹے دے دیئے اور اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا تم بڑی بات کہتے ہو: الإسرَاء۔40)۔

اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو اس فقرے کو یوں ہونا چاہیے تھے: کیا میں نے یہ فرق پیدا کیا کہ تمھیں بیٹے دیئے اور اپنے لیے بیٹیاں منتخب کیں؟۔ صاف ظاہر ہے کہ خدا نے یوں سوال نہیں کیا، اس کے علاوہ

خدا کی نظروں میں بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کی تنگ نظری اور چھوٹی سوچیں تو متمدن اقوام میں بھی نہیں ہیں۔ یہ عرب تھے جو بیٹے ہونے پر اس قدر فخر کرتے تھے۔ اگر بیٹی پیدا ہو جائے تو بعض وحشیانہ انداز سے اُسے قتل کر دیتے تھے لیکن دوسری طرف حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرشتوں کو مؤنث جنس تصور کرتے تھے۔ اسی روایتی سوچ کی وجہ سے حضرت محمد بھی بیٹے کی آرزو رکھتے تھے اور ہر عورت سے شادی کرتے وقت امید کیا کرتے تھے کہ اس سے بیٹا پیدا ہو گا۔ چنانچہ جب قاسم کی موت ہوئی تو آپ بہت زیادہ دُکھی ہوئے۔ خصوصی طور پر جب عاص بن وائل نے آپ کو وارث کے بغیر ہونے کا طعنہ دیا کیونکہ عرب بیٹوں کو حقیقی وارث سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ماریہ قبطیہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو آپ بہت خوش ہوئے اور جب اُس بچے کی موت ہوئے تو آپ بہت رنجیدہ ہوئے اور روئے۔ یہ وہ محمد تھے جنہوں نے مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اَفَاَصفیکُم رَبُّکُم بِالبَنِینَ "(کیا تمہارے رب نے تمھیں چن کر بیٹے دے دیئے: الإسرَاء۔40)۔ قرآن میں بہت بار ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ دو متکلم آپس میں مل جائیں اور خدا اور محمد ایک دوسرے سے مخلوط ہو جائیں۔ اس کا ایک نمونہ سورت الإسرَاء کی پہلی آیت ہے اور یہ وہ واحد آیت ہے جو مسلمان معراج نبوی کے ثبوت کے طور پر دیتے ہیں۔

سُبْحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ

اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کچھ یوں ہے۔

پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اسے اپنے عجائبات دکھائیں بے شک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

جملے کا پہلا حصہ ستائش خداوندی ہے، کہ وہ اپنے بندے کو مکّہ سے فلسطین لے جاتا ہے، یہ جملہ خدا کی جانب سے نہیں ہو سکتا، کیونکہ خدا اپنی تعریف خود نہیں کرتا بلکہ معقول بات یہ ہے کہ حضرت محمد یہاں خدا کی عنایت کی ستائش کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد والا جملہ جہاں مسجد اقصیٰ کے وصف بتائے جا رہے ہیں، "جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں" خدا کی جانب سے ہے اور اسی طرح "لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا" یعنی "کہ ہم اسے اپنے عجائبات دکھائیں" بھی خدا کی جانب سے ہے لیکن آخر جملے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں محمد بول رہے ہیں، جہاں کہا جا رہا ہے کہ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ کیونکہ خدا خود اپنے متعلق یہ نہیں کہے گا کہ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

قرآن میں کئی بار ایسے ہوا ہے کہ بغیر کسی پیشگی ذکر کے شخصِ اوّل شخصِ سوم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ سورت الفَتح کی ابتدائی آیات ہیں:

اِنّا فَتَحعنالکَ فَتحاً مُبیناً. لِیغفِرَ لکَ اللّٰہُ ما تَقَدَّمَ مِن ذَنبِکَ وَما تَأَخَّرَ۔ (ہم نے تم کو واضح فتح دی کہ خدا تمھارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔

پہلے فقرے "اِنّا فَتَحعنالکَ فَتحاً مُبیناً" (ہم نے تم کو واضح فتح دی) کی مناسبت سے دوسرے فقرے کو یوں ہونا چاہیئے تھا: "اَنغَفِر لکَ ما تَقَدّمَ" (تاکہ ہم تمھارے گزشتہ اور آنے والے گناہوں کو بخشتے)۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس بیان کردہ آیت کی مانند کئی ایسی اور آیات بھی ہیں جن کی توجیہ کی جا سکتی ہے لیکن بعض دوسری آیات ہیں جن کی توجیہ میں مشکل کا سامنا ہوتا ہے جیسے کہ سورت الأحزَاب کی آیت 21 میں کہا جاتا ہے: "جو چاہتا ہے کہ خدا اُس سے راضی ہو وہ اُس کے رسول کی پیروی کرے"۔ اگر یہ خطاب خدا کی طرف سے ہوتا تو کیا اس آیت کو یوں نہیں ہونا چاہیے تھا: "جو مجھے چاہتا ہے وہ میرے رسول کی پیروی کرے؟"۔ سورت الأحزَاب کی آیت 22 اور 23 میں سچے مومنین کی ثابت قدمی کی تعریف کرنے کے بعد آیت 24 میں خدا فرماتا ہے۔

لِیجزِی اللہُ الصّادِقِینَ بِصِدقِھِم وَ یعَذِّبَ المُنافِقِینَ اِن شاءَ اَویتُوبَ عَلَیھِم ۔(تاکہ اللہ سچوں کو ان کے سچ کا بدلہ دے اور اگر چاہے تو منافقوں کو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول کرے)۔

عبارت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں خدا نہیں بلکہ حضور بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر خدا یہ کہہ رہا ہوتا تو اسے صیغہ شخصِ اوّل میں ہونا اور یوں فرمایا جانا چاہیے تھا: "اجزِی الصّادِقِینَ" (تاکہ ہم سچوں کو بدلہ دے سکیں)۔

جی، قرآن میں اکثر خدا اور محمد آپس میں مل جاتے ہیں۔ کبھی خدا خود بولتا ہے اور محمد کو کہتا ہے "کہو" اور کبھی عبارت اس قسم کی ہے کہ خود حضرت محمد بات کرتے ہیں اور خدا کی بارگاہ میں اظہار بندگی کرتے ہیں۔ گویا اُن کے وجدان اور تحت الشعور میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ اُنھیں لوگوں کو ہدایت دینے پر مأمور کیا گیا ہے جو انہیں لغزش کرنے سے بچاتا ہے، اُنھیں الہام ہوتا ہے جس سے مشکلات کا حل سمجھایا جاتا ہے۔ وگرنہ بعض آیات میں خدا سے "چال" اور "مکر" کو منسوب کرنے کی سمجھ نہیں آتی۔ سورت القَلَم کی آیت 44 اور 45 میں فرمایا گیا ہے:

فَذَرنِی وَمَن یکَذِّبُ بِھذا الحَدِیثِ سَنَستَدرِجُھُم مِن حَیثُ لایعلَمُونَ وَ اُملِی لَھُم اِنَّ کَیدِی مَتِینٌ

اُنھیں مجھ پر چھوڑ دو جو اس بات کو جھٹلاتا ہے قریب ہے کہ ہم اُنھیں آہستہ آہستہ لے جائیں گے جہاں سے اُنھیں خبر نہ ہو گی، اور میں اُنھیں ڈھیل دوں گا، بیشک میری خفیہ تدبیر بہت پکی ہے)۔

یہی مضمون سورت الأعرَاف کی آیات 182 اور 183 میں دوہرایا گیا، فرق صرف یہ ہے کہ: "کَذّبوا بِآیاتِنا سَنَستَدرِجُھُم " (جو اس بات کو جھٹلاتا ہے) کو آیت کے آغاز میں فرمایا گیا ہے۔

سورت الأنفَال کی آیت 30، جو قریشی روساء کے دارالندوہ میں اکٹھے ہونے کے متعلق ہے، میں خدا سے مکر (سازش) کرنا منسوب کیا گیا ہے۔

وَاِذ یمکُرُ بِكَ الَّذِینَ کَفَرُوا لِیثبِتُوكَ اَو یقتُلُوكَ اَو یخرِجُوكَ وَیمکُرُونَ وَیمکُرُ اللہُ وَاللہُ خَیرُ المٰکِرِینَ

اور جب کافر لوگ تمھارے بارے میں سازش کر رہے تھے کہ تمھیں قید کر دیں یا تمھیں قتل کر دیں یا تمھیں دیس بدر کر دیں تو وہ سازش کر رہے تھے اور خدا سازش کر رہا تھا۔ اور خدا سب سے بہتر سازش (مکر) کرنے والا ہے۔

مکر، چالبازی اور سازش طاقت اور زور کا متبادل ہیں۔ جب کسی کمزور شخص کا سامنا کسی ایسے شخص سے ہوتا ہے جو اُس سے طاقتور ہو، تو اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ کوئی چال چلے۔ قادر مطلق خدا جس نے "کُن" کہہ کر کائنات تخلیق کی، اور وہ جس چیز کا ارادہ کرے ویسے ہی ہو جاتا ہے۔ کیا یہاں پر خدا ایک عرب شیخ کی مانند نظر نہیں آرہا، جو اپنے مقابل سے اُسی طرح زیادہ عقلمند اور چالاک ہے جیسی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عمرو بن العاص نے ابو موسیٰ اشعری کو علی اور معاویہ کی خلافت کا فیصلہ کرتے وقت مات دی تھی؟۔ خدا اور محمد کی باتوں کا آپس میں مخلوط ہو جانے کو سورت یُونس کی آیت 99 اور 100 میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ

(اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لے آتے پھر کیا تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور کسی کے بھی بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا ایمان لے آئے اور اللہ اُن کے لیے کفر کا فیصلہ کرتا ہے جو نہیں سوچتے)۔

پہلی آیت میں خدا محمد سے مخاطب ہیں۔ لیکن دوسری آیت گفتارِ محمد ہے اور اُنھی کی سوچوں کی غماز ہے، جہاں وہ اپنے آپ کو تسلّی دینے کے علاوہ مشرکین کو دی جانے والی دعوت کے قبول نہ ہونے کی توجیہ دے رہے ہیں۔ یہ خدا جو خود ہی نہیں چاہتا کہ لوگ ایمان لائیں اسے اُن لوگوں کے ایمان نہ لانے پر

ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے بھی کوئی شخص تب غصے میں آتا ہے جب کوئی امر اُس کی خواہش یا ارادے کے برعکس واقع ہو۔

لِّيَجۡزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيۡنَ بِصِدۡقِهِمۡ وَيُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ اِنۡ شَآءَ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا

(تاکہ اللہ سچوں کو ان کے سچ کا بدلہ دے اور اگر چاہے تو منافقوں کو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول کرے، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے:الأحزاب۔24)۔

ان آیات کا مواد مکمل طور گواہی دیتا ہے کہ یہاں خدا نہیں بلکہ حضور فرما رہے ہیں۔ عرب متلون مزاج اور ناپائیدار طبیعت کے مالک تھے۔ جدھر ہوا کا رخ دیکھتے اُسی طرف چلے جاتے۔ چنانچہ مکّہ میں مقیم چند مسلمان مشرکین کے لشکر کی جانب سے ابو جہل کی ہمراہی میں حضور کے خلاف لڑے۔ خدا اُن کی ناپائیدار طبیعت، بے ایمانی اور تلوّن مزاجی سے اس قدر غضبناک ہوا کہ سورت النِّسَاء میں آیت 97 سے 99 ان کے متعلق نازل کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا‌ؕ فَاُولٰٓـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ‌ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ۔ اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ حِيۡلَةً وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ سَبِيۡلًا ۔ فَاُولٰٓـئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا۔

(بے شک جو لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو اُن سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے اُنھوں نے جواب دیا ہم اس ملک میں بے بس تھے فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے سو ایسوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے کافی کمزور ہیں جو نکلنے کا کوئی ذریعہ اور راستہ نہیں پاتے۔ پس امید ہے کہ ایسوں کو اللہ معاف کر دے اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے)۔

مکّہ میں خدا محمد سے فرماتے ہیں:

اُدعُ اِلی سَبیلِ رَبّکَ بِالحِکمَۃِ وَالمَوعِظَۃِ الحَسَنَۃِ وَ جادِلھُم بِالّتی ھِی اَحسَنُ اِنَّ رَبّکَ ھُوَ اَعلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبیلِہٖ وَھُوَ اَعلَمُ بِالمُھتَدینَ

(اپنے رب کے راستے کی طرف دانش مندی اور عمدہ نصیحت سے بلا اور ان سے پسندیدہ طریقہ سے بحث کر بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے اور ہدایت یافتہ کو بھی خوب جانتا ہے: النّحل۔125)۔

چند سالوں بعد جب اسلام طاقت حاصل کرلیتا ہے اور حضور ایک لشکر کے ساتھ مکّہ آ کر اُسے فتح کر لیتے ہیں تو خدا کا لہجہ تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ اس سنگدلی اور بے پرواہی سے فرماتا ہے:

فَاِذَا انسَلَخَ الاَشھُرُ الحُرُمُ فَاقتُلُوا المُشرِکینَ حَیثُ وَجَدتُّمُوھُم وَ خُذُوھُم وَ احصُرُوھُم وَاقعُدُوالھُم کُلَّ مَرصَدٍ

(پھر جب عزت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور پکڑ لو اور اِنھیں گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو: التوبۃ۔5)۔

ایک کم طاقت کے مالک یعنی کمزور انسان کا سامنا جب زندگی کی مشکلات اور ناکامیوں سے ہوتا ہے، یا موافق حالات اور کامیابی کا حصول ہوتا ہے تو دونوں صورتوں میں اس کے رویے اور حالت میں تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ اُس کی روش کی تبدیلی کا اظہار اُس کے بیان میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن یہی امر ایک قادر مطلق، دانائے مطلق اور حکیم مطلق جس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے اور جس کے راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی، پر صادق نہیں آ سکتی۔ کہ ہجرت کے ایک سال بعد "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" (دین میں کوئی جبر نہیں: البقرۃ۔256) کی آیت نازل ہوتی ہے اور شائد اُس سے ایک سال بعد یوں فرمایا جاتا ہے:

"وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللہِ "(اور اللہ کی راہ میں قتل کرو: البَقَرَة۔ 190، 244: آل عِمرَان۔ 167)، '' لَا

یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔۔۔۔ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ : النِّسَاء۔ 95 "(مسلمانوں میں سے جو لوگ گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان ومال سے جہاد کرتے ہیں دونوں برابر نہیں ہیں)

جس شخص کو مسلمان بنانے کے لیے ایک سال پہلے جبر درکار نہیں تھا، اس آیت میں نہ صرف یہ حکم دیا گیا کہ اُس سے جنگ کرو بلکہ مومنین کو واضح انداز میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ تلوار اٹھا کر یا مال دے کر مشرکین کے خلاف جنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اُن کا درجہ اُن مسلمانوں کے برابر نہیں بلکہ برتر ہے جو گھر پر رہتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔ خدائے باری تعالی جو پیغمبر کو مکّہ میں یوں اخلاقی احکام دیتے تھے:

وَلَاتَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ. اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

(اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی بدی کا اچھائی سے ایسے جواب دے کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے: فُصّلت۔ 34)۔

لیکن مدینہ میں خدا حضور اس کے برعکس فرماتا ہے:

"فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ "(تو تم سستی نہ کرو اور صلح کی طرف نہ بلاؤ۔ اور تم تو غالب ہو: مُحَمَّد۔ 35)

اس کے علاوہ خدائی لہجے اور روش میں تبدیلی ہمیں تب بھی متوجہ کرتی ہے جب کائنات کا خالق اور اربوں ستاروں اور سیاروں کا منتظم حجاز کے مٹھی بھر عربوں سے فرماتا ہے:

"اَنتُم اَنزَلتُمُوہُ مِنَ المُزنِ اَم نَحنُ المُنزِلُو" (اِسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اِس کے برسانے والے ہم ہیں؟: الواقِعَۃ۔69)۔

کبھی وہ کمزور اور بے کس انسانوں کی مانند مدد کا حاجت مند ہو کر کہتا ہے کہ ہم نے اس لیے لوہا بھیجا تا کہ معلوم ہو سکے کہ کون اُس کی مدد کرنے میں جلدی دکھاتا ہے:

وَاَنزَلنَا الحَدِیدَ فِیہِ بَأسٌ شَدِیدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعلَمَ اللہُ مَن یَنصُرُہُ وَرُسُولَہُ

(اور ہم نے لوہا بھی اتارا جس میں سخت جنگ کے سامان اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں اور تا کہ اللہ معلوم کرے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے: الحدید۔25)۔

قرآن میں خدا نے پچاس سے زائد بار انسانوں کی ہدایت کو اپنے ارادے اور مشیت سے مشروط فرمایا ہے۔

"اِنَّ الَّذِینَ حَقَّت عَلَیہِم کَلِمَتُ رَبِّکَ لَایُؤمِنُونَ" (جن لوگوں کے بارے میں خدا کا حکم (عذاب) قرار پا چکا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے: یُونس۔96)۔

وَلَو شِئنَا لَاٰتَینَا کُلَّ نَفسٍ ھُدَاہَا وَلٰکِن حَقَّ القَولُ مِنِّی لَاَملَئَنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجمَعِینَ

(اور اگر ہم چاہتے ہیں تو ہر شخص کو ہدایت پر لے آتے لیکن ہماری بات پوری ہو کر رہی کہ ہم جنوں اور آدمیوں سے جہنم بھر کر رہیں گے: السَّجدَۃ۔13)۔

اس کے بعد بغیر پس و پیش کے فرمایا گیا ہے:

فَذُوقُوا بِمَا نَسِیتُم لِقَاءَ یَومِکُم ھٰذَا، اِنَّا نَسِینَاکُم وَذُوقُوا عَذَابَ الخُلدِ بِمَا کُنتُم تَعلَمُونَ

(تو اب اس کا مزہ چکھو کہ تم اپنے اس دن کے آنے کو بھول گئے تھے ہم نے تمھیں بھلا دیا اور اپنے کیے کے بدلہ میں ہمیشہ کا عذاب چکھو: السَّجدَۃ۔14)۔

مندرجہ بالا ان دو آیات کو پڑھنے سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا خود نہیں چاہ رہا کہ لوگوں کو ہدایت دے اور پھر ہدایت نہ دینے کی سزا عذاب ہے، اُن کے لیے دائمی عذاب ہے۔ خدا خود نہیں چاہ رہا کہ لوگوں کو ہدایت دے جو سورت الأنعام میں بہت واضح انداز میں فرمایا گیا ہے:

"وَجَعَلنا عَلی قُلُوبِهِم اَکِنَّةً اَن یفقَهُوهُ وَفی اِذانِهِم وَفراً" (اور ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے)۔

قرآن میں پچاس یا ساٹھ سے زیادہ آیت ایسی ہیں جہاں ان لوگوں کو عذاب جاوداں کا ذکر ہے جنھیں خدا خود ہدایت نہیں دینا چاہتا۔[159]

یہ موضوع جس کا ذکر ہو چکا ہے، اسے چھوڑ کر اب ہم دوسرے موضوع کی جانب جاتے ہیں جو انتہائی حیران کُن ہے کہ قرآن میں بہت زیادہ ناسخ اور منسوخ آیات موجود ہیں۔ تفسیر کے ماہرین اور تحقیق کرنے والے فقہاء نے اِن کا ذکر کیا ہے۔ منسوخ آیت وہ ہے جو پہلے نازل ہوئی اور اُس کے بعد مختلف بلکہ متضاد مطالب کی حامل جو آیت نازل ہوئی وہ پہلی آیت کی ناسخ ہے یعنی اُس نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ ایک فیصلہ لینا، فیصلے میں ترمیم کرنا یا اُس فیصلے کے بالکل الٹ ارادہ کرنا ایک انسانی وصف ہے کیونکہ اُسے حالات سے مکمل آگاہی نہیں ہوتی۔ انسان اپنے محدود علم کی وجہ سے دھوکا کھا جاتا ہے اور

159: یروشلم فتح ہونے کے بعد عمر بن خطاب یروشلم پہنچے تو نماز فجر کے بعد انہوں نے لشکر اسلامیہ سے خطاب کیا اور تقریر کے دوران اُنھوں نے قران کا سورت الکہف کی آیت سترہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ "مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ‌ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا (جسے اللہ تبارک وتعالیٰ ہدایت بخشتے ہیں وہی ہدایت پر ہے اور جسے وہ گمراہ کرتے ہیں اس کے لیے تو کوئی راہ بتانے والا نہیں پائے گا)۔ کہتے ہیں کہ جس وقت آپ نے آیت تلاوت فرمائی تو ایک پادری جو یہاں بیٹھا ہوا تھا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اللہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا اُس نے پھر مکرر کہا تو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا اس کی طرف دیکھتے رہو اگر اس نے پھر یہی کہا تو اس کی گردن اڑا دو۔ پادری آپ کے اس قول کو سمجھ گیا اور خاموش ہو رہا اور آپ نے پھر تقریر شروع کر دی"۔ (فتوح الشام۔ محمد بن عمر بن واقدی)۔

پھر بعد میں اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہری حالات و حوادث کی وجہ سے وہ ایک فیصلہ لیتا ہے لیکن پھر صورت حال کا گہرائی سے مطالعہ کرنے اور بہتر ادراک کے نتیجے میں اُسے جب صحیح صورت حال کا پتہ چلتا ہے تو وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتا ہے۔ لیکن ایک دانا اور قادر مطلق کو ایسی صورت کا پیش آنا قابل توجیہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے مخالفین طعنے دیا کرتے تھے: محمد آج ایک حکم دیتا ہے اور کل اُسے منسوخ کر دیتا ہے۔ سورت البَقَرَة کی آیت 106 میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے:

مَا نَنسَخ مِن آیَةٍ اَو نُنسِهَا نَأتِ بِخَیرٍ مِنهَا اَو مِثلِهَا اَلَم تَعلَم اَنَّ اللهَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیرُ

(ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر بات پر قادر ہے)۔

البتہ خدا ہر چیز پر قادر ہے چنانچہ اسی وجہ سے اُسے ایک آیت بھیج کر اسے منسوخ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر شئے پر قادر ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کے پاس ایسی آیات کو بھیجنے کی اہلیت ہو جنھیں بعد میں منسوخ کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مطلق دانائی اور مطلق توانائی خدائے باری تعالیٰ کی ذات کی لازمی صفات ہیں۔ باشعور اور غور و فکر کرنے والے لوگ خدا کی ستائش اِنھی صفات سے کرتے ہیں۔ لیکن ایک دانا اور توانا خدا ایسے احکامات کیوں صادر کرتا ہے جنھیں بعد میں منسوخ کرنا پڑتا ہے؟۔ اس آیت میں اپنے طور پر تضاد موجود ہے کہ جب وہ "عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیرُ" ہے تو اُس نے بہتر احکامات پہلے ہی کیوں نازل نہیں فرمائے؟۔

شائد اُن وقتوں میں کوئی ایسے فضول اور گستاخ لوگ موجود تھے جنھوں نے اپنے اعتراضات جاری رکھے جس کا جواب سورت النّحل میں مختلف الفاظ میں دیا گیا:

وَ اِذَا بَدَّلنَا آیَةٍ وَاللهُ اَعلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوا اِنَّمَا اَنتَ مُفتَرٍ بَل اَکثَرُهُم لَایَعلَمُونَ۔ قُل نَزَّلَهُ رُوحُ القُدُس مِن رَبِّکَ بِالحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِینَ آمَنُوا

(اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری بدلتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے، تو کہتے ہیں کہ تو بنا لاتا ہے۔ یہ بات نہیں لیکن اکثر ان میں سے نہیں سمجھتے۔ تو کہہ دے اسے تیرے رب کی طرف سے پاک فرشتے نے سچائی کے ساتھ اتارا ہے تا کہ یہ مومنوں کو ثابت قدم رکھے (101-102)۔

تصور یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن خدائی کلام ہے۔ چنانچہ جوں ہی ہم اسے خدائی کلام کہتے ہیں تو یہ بات لازم ہو جاتی ہے کہ ناقص انسان کی سوچوں کا رنگ اُس میں جگہ نہ پا سکے۔ لیکن ان دو آیات میں ہمیں واضح تضاد نظر آتا ہے۔ بیشک خدا جانتا ہے کہ اُس نے کیا نازل کیا ہے۔ لیکن ایک آیت سے دوسری آیت کو رد کرنے کی وجہ سے ہی مخالفین نے اپنے شک کا اظہار کیا تھا، اور اُن کے شبہات اِن احکام کے خدائی ہونے کے دعوے پر تھے۔ کیونکہ ایک سادہ لوح حجازی عرب اور عامی مخالفین بھی اس بات سے آگاہ تھے کہ ایک دانا و توانا خدا جانتا ہے کہ اُس کے بندوں کی بھلائی کس بات میں ہے۔ چنانچہ اُسے آغاز میں ہی وہ احکامات نازل کرنا چاہیے تھے جو اُس کے بندوں کی بھلائی کے لیے تھے، بجائے اس کے کہ وہ اپنے احکامات کو تبدیل کرتا جو کمزور اور نادان انسان کا خاصہ ہے۔

ان تبدیلیوں اور تضادات کے مطالعہ اور گہری سوچ بچار کے بعد سوائے ایک توجیہ کے ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آتا، اور وہ یہ ہے کہ محمد اور خدا آپس میں یوں مدغم گئے ہیں کہ اُنھیں علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ خدا محمد کے شعور کی گہرائیوں میں ظہور کرتا ہے، اُنھیں مبعوث فرماتا ہے اور اُنھیں اپنی قوم کو ہدایت دینے پر مأمور کرتا ہے۔ پھر محمد بشر تھے اور اُن کے بشری خصائص اُن کی رسالت کا حصہ تھے۔ اور اسی دوہری شخصیت سے قرانی آیات رِس رہی ہیں۔

گولڈ زیہر نے اپنی کتاب[160] کے پہلے باب کے آغاز میں عجیب اور قابل احتیاط رائے کا اظہار کیا گیا ہے جس کو نقل کرنا اس لیے ضروری سمجھ رہا ہوں کہ یہ سوچنے والے انسان کو اس معمہ کو حل کرنے کے نزدیک لے آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"انبیاء فلسفی تھے اور نہ متکلم۔ اسی لیے وہ اپنے پیغام کو کسی قاعدے یا علمی ضابطے کے تحت نہیں لائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے کسی فلسفیانہ یا لسانی نظام کو ترتیب نہیں دیا۔ اُن کی روح کی گہرائیوں سے جو آواز باہر آئی اُنھوں نے اپنی روح کی اسی آواز کو اپنے لوگوں سے بیان کر دیا۔ جوں جوں اُن کو ماننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی تو اسی تناسب سے معاشرے کے اندر ایک نیا مذہب تشکیل ہوتا گیا۔ اس کے بعد دانش مند لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے عام لوگوں کے اعتقادات کو ایک فکری نظام کی شکل دی۔ اگر اُنھیں کوئی خلا نظر آیا تو اُنھوں نے اسے پُر کر دیا۔ اگر اُنھیں کوئی تضاد نظر آیا تو اُنھوں نے تاویل و تفسیر سے اسے قابل قبول بنایا اور پیغمبر کے ہر سادہ جملے کے اندر بھی باطنی معنیٰ کا تصور خیال کیا یا اُسے پیدا کیا۔ اور تمام الہامی اظہار جو وحی کے طور اُن کے ضمیر کی آواز تھی اُسے عقلی اور منطقی استدلال سے درست ثابت کیا۔ اور ایسے مطالب اور تصورات پیدا کیے جو کبھی پیغمبر کے ذہن میں بھی موجود نہ تھے۔ اور معترضین کے سوالات اور اعتراضات جو دعوت دینے والوں کو پریشان کرتے تھے اُن کے جوابات مہیا کیے۔ ایک پورا فلسفیانہ اور الہیاتی نظام ترتیب دیا اور داخلی متشککین اور خارجی معترضین کے خلاف اپنے خیال کے مطابق ایک ناقابل شکست دفاع مہیا کیا۔ اپنے اس تمام بیان کی بنیاد وہ اپنے پیغمبر کے اقوال پر رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ مفسرین اور علم الکلام کے ماہرین اعتراضات سے بچ نہیں پاتے کیونکہ پیغمبر کے اُنھی اقوال سے دوسرے مفسرین اور علم الکلام کے

160: کتاب کا نام Vorlesungen über den Islam باب Dogmatische Entwicklungen

ماہرین دوسرے معانی اخذ کرتے ہیں اور ایک نیا نظام وضع کرتے ہیں جو پہلے نظام کے بالکل الٹ ہوتا ہے"۔

گولڈ زیہر کا مشاہدہ بہت متاثر کُن ہے اور اگرچہ اس کے بیان کا اطلاق عمومی طور پر تمام ادیان پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ تصور کیا جاتا ہے اور شائد یہ غلط بھی نہیں ہو گا کہ اگر ہم کہیں کہ پہلی صدی ہجری میں جو مباحثے اور اختلاف رائے ہوئے، اور اشعری[161]، معتزلی، شیعہ، مرجئہ[162] اور خوارج[163] جس انداز

161: اشعریہ ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری کے پیروکار تھے۔ اشعریوں کے نزدیک اللہ قادر مطلق ہے۔ چنانچہ انسان اپنے افعال پر قادر اور بااختیار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ہم انسان کے قادر اور بااختیار ہونے کے دعوے کو قبول کر لیں تو اس سے اللہ کے قادر مطلق ہونے کے دعوے پر زد پڑتی ہے۔ اللہ اگر چاہے تو وہ گناہ گار کو بخش سکتا ہے۔ قرآن قدیم ہے اور یہ ازل سے لوح محفوظ پر تھا۔ قرآن کے مخلوق یا قدیم ہونے اور انسانی افعال میں انسانی اختیار کے دعوے کو امام بخاری نے تین فقروں میں ہی نپٹا دیا۔ "قرآن اللہ کا کلام ہے، انسانی افعال تخلیق ہیں، اس معاملے کی تحقیق کفر ہے"۔ اشعریوں اور معتزلہ میں سخت مخالفت تھی۔ اشعریوں کو معتزلہ کے اس دعوے سے سب سے زیادہ چڑ تھی کہ انسانی عقل خیر و شر میں تمیز کر سکتی ہے۔ اشعریوں کے بقول اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان وحی کے بغیر حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے تو اللہ کو قرآن نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

162: فرقہ مرجئہ، معاویہ بن ابوسفیان کے زمانے میں پیدا ہوا۔ وہ اس بات کے معتقد تھے کہ ایمان دل کی تصدیق اور زبان کے اقرار کو کہتے ہیں۔ یعنی ایمان کا تعلق محض قول اور زبان سے ہے، عمل کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی ایسے شخص کے متعلق فیصلہ کرے جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے، اُس کا فیصلہ روزِ قیامت تک ملتوی کیا گیا ہے۔ فیصلے کی اس تاخیر کو وہ ارجاء کا نام دیتے تھے جو سورت التوبہ کی آیت 106 سے ماخوذ ہے۔ امامت کے بارے میں مرجئہ کا عقیدہ یہ تھا کہ جب کوئی مسلمانوں کا خلیفہ منتخب ہوتا ہے تو تمام مسلمانوں پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ یہ فرقہ در حقیقت معاویہ اور آلِ ابوسفیان کی طرز حکومت کا طرفدار تھا۔

163: خوارج کا گروہ علی بن ابوطالب کی خلافت کے زمانے میں وجود میں آیا۔ جو جنگ صفین کے بعد حاکمیت کے متعلق تھا۔ خوارج نے "لا حکم الاللہ" کہہ کر خروج کیا۔ ابو بکر، عمر، عثمان اور علی کی خلافت کو جنگ صفین کے خاتمے سے پہلے تک خوراج تسلیم کرتے تھے۔ خارجیوں کے عربوں کے علاوہ فارس، سیستان، کرمان اور خراسان میں حامی موجود تھے۔ پہلی صدی ہجری میں اُنھوں نے بڑے بڑے دستے تشکیل دیئے اور اموی و عباسی خلفاء کے لیے کافی مشکلات پیدا کیں۔ ایران میں موجود خارجی سرداروں میں سے حمزہ بن آذرک شاری اور عمار خارجی خاصے نامور تھے۔

سے ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے تھے، اُنھی سے شناسائی کی مدد سے گولڈزیہر ان نتائج پر پہنچا۔ وہ خود یہودی تھا لیکن مسیحی کلیسا کے ارتقاء سے پوری طرح باخبر تھا اور اسی طرح یہودیت اور عیسائیت کے آپس ے اختلاف سے بھی باخبر تھا۔ لیکن اس قسم کی اطلاعات کا جس قدر ذخیرہ اسلام مباحث میں موجود ہے، اُنھی سے شناسائی نے اُسے اس قدر واضح سوچ رکھنے والا بنایا۔ اُنھی اختلافات اور مباحث کا ایک چھوٹا سا نمونہ اِس باب کی مناسبت سے یہاں پیش کرنا مناسب ہو گا۔

قرآن کی ایسی تعبیرات موجود ہیں جن کو کوئی بھی ذوق سلیم کا مالک اور ذہین انسان بخوبی سمجھ لیتا ہے اور اُن کی معانی کے سلسلے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں ہوتا: ”يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ“ (ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے: الفَتْح۔10) اس کے معنی انتہائی واضح ہیں کہ طاقت کے حوالے سے خدا سب پر غالب ہے۔ یا ”الرّحمن علی العرش استوی“ (رحمان جو عرش پر جلوہ گر ہے۔ طٰہٰ۔5)۔ صاف ظاہر ہے کہ خدا کا جسم نہیں ہے کہ وہ کسی تخت پر بیٹھے، اس آیت سے مراد ہے کہ پروردگار ربوبیت کے تخت پر جلوہ گر ہے۔ یا روز قیامت کے حوالے سے فرمایا گیا ہے۔ ”وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ“ (اُس روز بہت سے چمکدار چہروں والے اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے: القِیامَۃ۔22، 23)۔ اس سے با آسانی یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ اُس روز نیکوکار خدا کی جانب سے فکرمند نہیں ہوں گے یا اُن کے خیالات کا محور خدا کی ذات ہو گی۔ ”إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ“ (خدا سننے اور دیکھنے والا ہے: الحجّ۔75)۔ یعنی خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت جو سادہ لوحی اور جامد فکری کی وجہ سے حدیث اور روایات پر اعتقاد رکھتی ہے، دینی معاملات میں عقل کے دخل کو نامناسب اور گمراہی کا باعث گردانتی ہے۔ وہ ان آیات اور تعبیرات کو لفظی معنوں میں قبول کرتی ہے اور اس بات کی معتقد ہے کہ خدا انسانوں کی مانند ہے اور اُس کے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، منہ، سر اور کان ہیں۔

ابو معمر ہُذلی[164] کہتے ہیں کہ اگر کوئی اسے تسلیم نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ حنبلی جو امام احمد بن حنبل کے پیروکار تھے، اپنے امام کی مانند اُنھی دعووں کے ساتھ جامد انداز میں چمٹے ہوئے تھے اور کسی قسم کی عقلی جنبش کو اپنے لیے مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔

ابن تیمیہ[165] اپنے فقہ کے (چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں) عظیم عالم تھے، اپنے تعصب کی وجہ سے معتزلہ کو کافر اور امام محمد غزالی کو منحرف گردانتے تھے۔ ایک روز دمشق میں وعظ کر رہے تھے اور جب کسی آیت یا حدیث کا ذکر آیا تو اپنے منبر سے اتر کر کہا کہ جیسے میں منبر سے نیچے آیا ہوں، خدا بھی اسی طرح اپنے تخت سے نیچے اترتا ہے۔

ان لوگوں کا تعصب اور فکری جمود اس درجے پر پہنچا ہوا تھا کہ مسلمان متکلمین کے اقوال اور معتزلیوں حتیٰ کہ اشعریوں کو باطل سمجھتے تھے۔ اور جو بھی ان کے نامعقول اور عامیانہ آراء سے کسی بھی قسم کا انحراف کرے اُسے بدعت قرار دیتے تھے۔

164: تاریخ اسلام میں ہُذلی نام کی دو شخصیات ہو گزری ہیں۔ ایک ابو محمد معتزلی عالم اور متکلم تھے۔ جو بصرہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں تدریس کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ارسطو کے افکار اور قرآنی آیات میں مطابقت پیدا کریں اور 840ء کے لگ بھگ زندگی بسر کی۔ لیکن ان سطور سے گمان ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے منظور شادروان دشتی علی بن عبد الرحمن بن ہُذلی نامی ایک اندلسی عالم اور ادیب تھے جو چودھویں صدی عیسوی میں ہو گزرے ہیں۔

165: ابن تیمیہ کے نام سے دو لوگ جانے جاتے ہیں۔ اور دونوں حنبلی فرقہ کے پیروکار تھے۔ ایک: مجد الدین ابوالبرکات بن تیمیہ(1193ء۔1254ء) حنبلی عالم اور فقیہ تھے اور بغداد میں زندگی بسر کی۔ دوسرے: تقی الدین احمد بن تیمیہ(1327ء۔1263ء) حنبلی فقیہ جو حرّان، شام میں پیدا ہوئے۔ دمشق میں ایک جماعت کے سربراہ تھے۔ شافعین کے مخالف اور حدیث وفقہ اور کلام کی وجہ سے مشہور تھے۔ یہاں تقی الدین احمد کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابو عامر قرشی[166] کہتے ہیں کہ اگر کوئی اس آیت "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (اس جیسی کوئی چیز نہیں: الشوریٰ۔ 11) کو ان معنوں میں سمجھے گا کہ کوئی شئے خدا کی مانند نہیں ہے تو یہ بدعت ہو گی۔ بلکہ اس آیت کے معنی یہ ہے کہ الوہیت کے حوالے سے کوئی خدا جیسا نہیں ہے وگرنہ اُس کے بھی میرے اور تمھارے جیسے اعضا اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ اور اس آیت "يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ" (جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور وہ سجدہ کرنے کو بلائے جائیں گے: القلم۔ 42) کو پڑھنے کے بعد اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر کہا کہ خدا کی رانیں میری ٹانگوں کی مانند ہیں۔

ایسے لوگوں کی آرا اور عقائد جاننے سے ہمیں بے اختیار زمانہ جاہلیت کے عربوں اور اُن کی بدوی عادات یاد آ جاتی ہیں۔ وہی عرب جو ظاہر کو کل سمجھنے اور محسوسات پر تکیہ کرنے کی وجہ سے روحانی امور سے دور تھے، اُنھی رویوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد پھر گریبان سے سر باہر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اور آریائی اقوام سے میل جول اور معتزلہ، اخوان الصفا[167]، باطنی[168]، صوفیا اور دیگر فرقوں کے ہاں جو عقلیت پسند سوچیں پیدا ہوئیں تھی، وہ اِنھیں متاثر نہ کر سکیں۔ بدقسمتی سے ان کے تمام پیشوا اور رہبر سامی النسل یعنی عرب تھے اور سوچنے سمجھنے والے انسانوں یا اُن کے عقلی مقولوں سے شائد ہی ان کا

166: ابو عامر قرشی یا محمد بن ابو عامر: قرطبہ میں 978ء سے 1008ء کے دوران ہو گزرے ہیں۔

167: چوتھی صدی ہجری میں ایک سوچ پیدا ہوئی کہ عقلی علوم کی اشاعت کے لیے دین اور حکمت کی ایک دوسرے سے دوری کو ختم کیا جائے اور عوام الناس کو حکمت کے نظریاتی و عملی مبادیات سے آگاہ کرنے کے لیے مؤلف کے نام کا ذکر کیے بغیر رسائل کی اشاعت کی جائے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "اخوان الصفا و خلان الوفاء" کا نام دیتے تھے۔ ان لکھنے والوں میں ابو سلیمان محمد معشر بستی المعروف مقدسی، ابوالحسن علی بن ہارون زنجانی، ابو احمد مہرجانی، ابوالحسن علی بن رامیناس عوفی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اخوان الصفا کے لکھنے والوں کی اکثریت ایرانیوں اور ایرانی نژاد لوگوں کی تھی۔

168: باطنی اسماعیلوں کا ایک فرقہ ہے جو اسماعیل کی امامت کے طرف دار تھے۔ یہ اسماعیلی اور فرقہ باطنیہ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اس فرقے کی بنیاد رکھنے والوں میں میمون بن دیصان کا نام لیا جاتا ہے جو قدح کے نام سے بھی جانے جاتے تھے اور خوزستان، عراق اور شام کے علاقوں میں متحرک تھے۔ فاطمی بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے جو یمن کے نواح، شام، فلسطین اور شمالی افریقہ میں موجود تھے۔ ہندوپاکستان میں بھی ان کی خاصی تعداد موجود ہے۔

کبھی واسطہ پڑا ہو۔ ان کے بر عکس معتزلہ اور علم الکلام کے ماہرین کی اکثریت یا تو غیر عرب تھی یا ایرانی اور یونانی فکر کے زیر اثر اپنے فکری جمود اور پسماندہ بدوی عقائد کے تعصب سے چھٹکارا پا چکے تھے۔ یہ تمام باتیں اُس جملے کو سچ ثابت کرتی ہیں جو ہم نے اس باب کے آغاز میں کہا تھا کہ "انسان نے خدا کو اپنی شکل پر تخلیق کیا ہے"۔

جس وقت پیغمبر رومیوں سے جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے (دسویں صدی ہجری) تو اُنھوں نے ایک عربی سے فرمایا: "کیا تم اس سال رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے نہیں جاؤ گے؟"۔ جد ابن قیس نے جواب دیا: "مجھے اجازت دیں کہ میں شرکت نہ کروں اور فتنے میں مبتلا ہونے سے بچ جاؤں۔ میں عورتوں کا بہت زیادہ شائق ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ رومی عورتوں کو دیکھ کر میں خود پر قابو نہ کھو بیٹھوں"۔ سورت التّوبَة کی آیت 49 اسی برأت کے متعلق نازل ہوئی:

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّىۡ وَلَا تَفۡتِنِّىۡ ؕ اَلَا فِى الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ

(ان میں سے کوئی تم سے کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجیے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالیے۔ سن رکھو! فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے)۔[169]

169:: تقریباً ہمیشہ رسول اللہ کا دستور رہا تھا کہ جب آپ جہاد پر تشریف لے جاتے تو مقام کا نام ظاہر نہ کرتے بلکہ جہاں حملہ مقصود تھا اُس کے علاوہ اور کسی جگہ کا نام بتاتے۔ البتہ اس موقع پر آپ نے بعد سفر قحط سالی اور خریف کی کثرت تعداد کی وجہ سے تبوک کا نام عام ظاہر کر دیا تا کہ اس سفر کے لیے سب لوگ پوری تیاری کر لیں۔ اس خیال سے آپ نے لوگوں کو تیاری سفر کا حکم دیا اور کہہ دیا کہ میں روم کے مقابلے پر جا رہا ہوں۔ اس لیے باوجود اس پریشان حالی کے جس میں مسلمان مبتلا تھے اور روم ایسی پُر شوکت طاقت کے مقابلے پر جہاد کے لیے جاتے ہوئے دل میں پس و پیش کرتے تھے، وہ آپ کے حکم کی وجہ سے تیاری کرنے لگے۔ اس تیاری سفر کے اثنا میں ایک دن آپ نے بنو سلمہ کے جد بن قیس سے کہا: "کہو جد اس سال رومیوں سے جہاد کے لیے چلتے ہو"۔ جد نے کہا: "یا رسول اللہ! کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ مجھے آپ یہیں قیام کی اجازت دے دیں اور فتنے میں نہ ڈالیں کیونکہ بخدا میری تمام قوم اس بات سے واقف ہے کہ میں عورتوں کا نہایت ہی دلدادہ ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ رومیوں کی عورتوں کو دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہو سکے گا"۔ (تاریخ الرسل و الملوک۔ محمد بن جریر الطبری)۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ الفاظ محمد کے ہیں کیونکہ جد بن قیس نے جنگ پر نہ جانے کی اجازت خدا سے نہیں بلکہ اُن سے مانگی تھی۔ لیکن خدا نے اپنے پیغمبر کی مدد کو پہنچنے میں بہت جلدی دکھائی کہ جو جنگ پر نہ جانے کی جرأت یا گستاخی کا مرتکب ہو گا اُس کے لیے دوزخ کی آگ جلا دی گئی ہے۔

جن اور جادو

جن انسانوں کی طرح کی ہی مخلوق ہے سوائے اس کے کہ وہ نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھار انسانوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کوئی پری کسی انسان کو دل بیٹھے یا کوئی نر جن کسی عورت پر عاشق ہو جائے۔ شریر روحیں کبھی انسان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں اور اُس پر مرگی کی سی کیفیت طاری کر دیں۔ اس قسم کے اوہام تمام قوموں میں پائے جاتے ہیں۔

جادو کا تصور انسانوں کے ہاں زمانہ قدیم سے موجود رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خاص منتر پڑھنے، تعویذ لکھنے یا مختلف چیزوں کو آپس میں ملانے سے ایسے کام سر انجام دیے جاسکتے ہیں جو کہ عام حالات میں ممکن نہیں ہوتے، مثلاً کسی انسان کو قتل کر دینا، مرد کو عشق میں مبتلا کرنا، کسی عورت کو دیوانہ بنا لینا، موم کی گڑیا بنا کر اُس کی آنکھ میں سوئی چبھونا جس سے سینکڑوں کلو میٹر کے فاصلے پر بیٹھا انسان اندھا ہو جائے۔ قدیم زمانوں میں ایسی خرافات اور مہمل باتیں تمام اقوام کے ہاں وجود میں آئیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اب بھی موجود ہیں۔ حتیٰ کہ اُن علاقوں میں بھی ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔

اس مسئلے کی واضح اور مسلّم وجہ یہ ہے کہ انسان ایک سوچنے والا جاندار ہے۔ وہ نئی صورت حال کو سمجھنے کے لیے سوچتا ہے۔ جب اُس کا واسطہ اجنبی صورت حال سے پڑتا ہے اور اپنی ذہنی سوچ کی روشنی سے وہ اس تاریکی کو منور نہیں کر پاتا تو وہ مفروضوں اور تخیل کو بروئے کار لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب اُس

کی سوچیں اُسے آگے بڑھنے میں مدد دینے سے قاصر ہوتی ہیں تو واہموں کی قوت اپنا کام دکھاتی ہے۔ انسان قدرت کے مقابلے پر کمزور ہے، ڈرتا ہے اور جب اپنے موجود وسائل سے اپنی خواہشات پوری کرنے اور صورت حال کو اپنے مرضی کے مطابق ڈھالنے میں دشواری کا سامنا کرتا ہے تو یہ عوامل اسے اوہام کی کھائی میں گرانے کا باعث بنتے ہیں۔ فال نکالی جاتی ہے، زائچے بنائے جاتے ہیں، مستقبل بینی کی کوشش کی جاتی ہے، رمل و جفر سے استفادہ کیا جاتا ہے، لاعلمی اور تاریکی کی وحشت چھا جاتی ہے تو فرضی مخلوقات اُسے مختلف شکلوں میں گھیر لیتی ہیں وغیرہ۔ چنانچہ یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ چھٹی صدی کے عرب اس قسم کے اوہام میں مبتلا تھے۔ لیکن یہ بات بھی حیران کن ہے کہ ان دونوں کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ جادو اور نظر بد کے ایک حقیقی امر ہونے اور اثبات کا ذکر ہمیں دو سورتوں "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" میں ملتا ہے۔ ان سورتوں کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین لبید بن اعصم کا ذکر کرتے ہیں، جس نے مشرکین کے کہنے پر پیغمبر پر جادو کیا تاکہ اُن کے کام میں خلل پڑ سکے۔ اس جادو کے نتیجے میں حضور بیمار ہو گئے تا آنکہ جبرائیل آئے اور انہوں نے پیغمبر کو اس امر کی خبر دی۔

تفسیر کیمبرج میں لکھا ہوا ہے کہ پیغمبر بیماری کی حالت میں سوئے ہوئے تھے تو اُنھوں نے اپنے سرہانے اور پاؤں کی جانب دو فرشتوں کو کھڑے پایا۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ یہ آدمی اس قدر بیمار اور تکلیف میں کیوں ہے۔ دوسرے نے جواب دیا کہ اس پر لبید کے جادو کا اثر ہے جو اُس نے "دروان" نامی کنویں میں دفن کیا ہوا ہے۔ پیغمبر نے جاگنے کے بعد علی بن ابو طالب اور عمّار کو بھیجا کہ وہ کنویں سے جادو نکالیں۔ اُن دونوں نے کنویں سے پانی کو نکالا تو اُنھیں وہاں ایک پتھر کے نیچے جادو ملا جو ویسا ہی تھا جیسا فرشتوں نے بتایا تھا۔ اُس پر گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں، اسے پیغمبر کے پاس لایا گیا۔ اُسی وقت یہ دونوں مذکورہ سورتیں جو گیارہ آیات پر مشتمل ہیں، نازل ہوئیں۔ اور ہر ایک آیت کو جب پڑھا گیا تو ایک گرہ کھلتی گئی۔ جس کے نتیجے میں پیغمبر شفایاب ہو گئے۔

طبری نے اس واقعے کے گرد بہت فسانہ طرازی کی ہے جب کہ تفسیر جلالین میں فسانہ طرازی کیے بغیر یہ کہا ہے کہ جیسے جیسے ایک آیت پڑھی گئی گرہیں کھلتی گئیں۔ تفسیر الکشاف میں اس کہانی کا ذکر تک نہیں ہوا بلکہ جادو اور اُس کی تاثیر کا انکار کیا گیا ہے اور دانا انسانوں کی طرح اسے "مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ" (اس کی مخلوقات کے شر سے: الفَلَق۔2) یعنی شرّ کو انسانوں سے منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ اس بیماری کی وجہ کسی انسان کا زہر یا اُس جیسی چیز کو کھلانا ہے۔ تاہم کوئی بھی مسلمان عالم یا مفسر جنّات کے وجود کا منکر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں دس سے زائد بار جنّات کے وجود کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ حتیٰ کہ سورت الرّحمٰن کی آیت 15 میں اُنھیں آگ کے شعلے سے تخلیق کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن میں 28 آیات پر مشتمل سورت الجنّ موجود ہے۔ جس کی شروع کی آیات میں جنوں کی ایک جماعت کا ذکر ہے جنھوں نے قرآن کی آیات سنیں تو وہ اس کے بیان کی فصاحت اور برجستگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلے یا قوم کی جانب لوٹ گئے اور اُنھیں جا کر پوری بات بتائی۔

عرب تمام پسماندہ اقوام کی طرح روحوں اور پریوں کے وجود کے قائل تھے۔ طبعی حالات، صحرا کی خاموشی اور تنہائی پر محیط ماحول نے اُنھیں اوہام کا شکار بننے میں مدد دی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی مسافر رات کے وقت صحرا میں قیام کرتا تھا تو وہ ڈر کے مارے خود کو پریوں کے بادشاہ اور جنّات کے سردار کے حوالے کرتا تھا اور اُن سے دعا مانگا کرتا تھا تا کہ وہ اُسے شریر جنّات کے شر سے محفوظ رکھیں۔ سورت الجنّ کی آیت 6 میں انسانوں کا جنوں سے پناہ لینے کا ذکر کیا گیا ہے جس نے جنوں میں غرور اور سرکشی بڑھا دی۔ اس قسم کے اوہام اور خرافات کا بدوی لوگوں میں بلکہ متمدن اقوام کے نچلے طبقات میں موجود ہونا کوئی اتنی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ بات باعث حیرت نہیں ہے کہ ان باتوں کا ذکر ایک ایسی کتاب میں ہوا ہے جسے خدائی کلام کہا جاتا ہے، اور ایک ایسے شخص نے یہ باتیں کی جو اپنے

لوگوں کی خرافات اور جاہلانہ رسوم کے خلاف اور اُن کی سوچوں اور اخلاق کی اصلاح کے لیے سامنے آیا تھا؟۔

اس سورت اور اس کے ذریعے جو مواد محمد نے ہم تک پہنچایا ہے کیا اُسے اُن کا خواب یا کشف تصور کیا جائے، جیسے بعثت سے پہلے یعنی وحی کے آنے اور فرشتے کے ظہور سے پہلے آپ کو صالح خواب آیا کرتے تھے اور سورت الإسرَاء کی پہلی آیت جس میں مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کے سفر کا ذکر ہے، اُس کی تعبیر اور تاویل بھی خواب کے طور پر کی جاتی ہے ؟۔

کیا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اپنی قوم کے جنّات کے متعلق عمومی عقائد سے محمد کی روح اس قدر متاثر ہو گئی تھی کہ رفتہ رفتہ وہ اُنھیں ایک حقیقت تصور کرنے لگے تھے۔ ایک ایسی مخلوق جو انسانوں کی مانند زمین پر زندگی گزارتی ہے لیکن نظر نہیں آتی، اور انسانوں کی مانند عقل و ادراک کی صلاحیت کی مالک ہے، لہذا توحید پرستی اور روز محشر کے حوالے سے اُنھیں تعلیمات دینا اُن پر واجب ہے ؟۔ ایسی صورت میں جنّات میں سے کوئی جن پیغمبر کے طور مبعوث کیوں نہیں ہوا؟۔ جب کہ قرآن میں دو بار اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب ہم نے کسی قوم میں رسول بھیجا تو وہ اُنھی کی قوم میں سے تھا جو اُنھی کی زبان بولتا تھا، ہر قوم میں رسول اُنھی کی قوم سے مبعوث کیا۔ حتیٰ کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اگر فرشتے زمین پر بستے تو ہم اُنھی فرشتوں میں سے کسی کو مبعوث کرتے۔ کیا ہم سورت الجنّ کو ایک ایسا منظر تصور کر سکتے ہیں جو مولوی کے لفظوں میں:

چون کہ با کودک سر و کارت فتاد

پس زبان کودکی باید گشاد

(جب بچوں سے واسطہ پڑے تو بچوں کی زبان استعمال کرنی چاہیے)۔

شائد اپنے لوگوں کی عقلی سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک کہانی تخلیق کی گئی اور اپنے لوگوں کو سنادی گئی کہ قرآنی آیات کے الفاظ اور مفہوم سے جن اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ سب نے اسلام قبول کر لیا ہے ؟۔

بہر حال جو بھی صورت ہو، محمد پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یونانی کے عظیم فلسفی اپنے تمام بلند پایہ افکار، ریاضی اور طبعی علوم کی کامیابیوں اور معاشرتی زندگی کے مسائل کی شرح بیان کرنے کے باوجود اپنے لوگوں کے ہاں رائج عقائد سے صرف نظر نہیں کر سکے، بلکہ وہ یونانی اساطیر اور اسطوری دینی رسوم میں شرکت کرتے تھے۔ لیکن ایک مسئلہ باقی رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن خدائی کلام ہے اور یہ محمد کی کہی باتیں نہیں ہیں بلکہ خدا نے وحی کے ذریعے اُن تک پہنچایا ہے۔ اسی وجہ سے سورت الجنّ کا آغاز "قُل" کے لفظ سے ہوا ہے۔ کیا جنوں اور پریوں کے متعلق حجازی عربوں کے عقائد سے خدا متفق ہے یا عربوں کے قومی عقائد حضور کی زبان سے ادا ہوئے ہیں ؟۔

تورات انسانی سوچوں کی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہے کیونکہ اس میں ابتدائی اقوام کے تخلیق کائنات کے متعلق سادہ لوحی پر مبنی نظریات کا عکس ملتا ہے۔ اس کتاب کے مطابق خدا نے چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا اور ساتویں دن جو ہفتے کا روز تھا، آرام کیا۔ زمین اور آسمانوں کی پیدائش کے وقت سورج کا وجود نہیں تھا جس کے طلوع و غروب سے شب و روز پیدا ہوتے ہیں اور انسان نے اُنھیں وقت ماپنے کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ کیا خدا اپنی اس تخلیق کے وقت کی نشاندہی کرنے کے لیے انسانی پیمانے کا محتاج تھا؟۔ اور یہ چھ دن جو کائنات کو پیدا کرنے کے دوران صرف ہوئے کیا یہ دن زمینی تھے یا نیپچون جیسے کسی سیارے کے دن تھے ؟۔ شب و روز کے پیدا ہونے کی وجہ سورج کا کرّہ زمین پر طلوع و غروب ہونا ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ خدا نے ابھی سورج کو پیدا نہیں کیا تھا تو پھر دن اور رات کیسے پیدا ہو گئے ؟۔ کیا حضرت موسیٰ کے ذہن کے مطابق یہ ممکن ہے کہ معلول کا علّت سے پہلے وجود ہو سکتا ہے ؟۔

بات جو بھی ہو، چھ دن میں تخلیق کائنات کے سلسلے میں قرآن میں کئی بار ذکر ہوا ہے۔

1: یُونس: اِنَّ رَبَّکُمُ اللہُ الَّذِی خَلَقَ السَّموٰاتِ وَالاَرۡضَ فِی سِتَّۃِ اَیامٍ ثُمَّ استوی عَلَی العَرشِ۔ آیت:3 (بیشک تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر استوا فرمایا)۔

2: الاَعرَاف: اِنَّ رَبَّکُمُ اللہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ۔ آیت:54 (بیشک تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر استوا فرمایا)

3: ھُود: وَھُوَ الَّذِی خَلَقَ السَّموٰاتِ وَالاَرۡضَ فِی سِتَّۃِ اَیامٍ وَ کانَ عَرشُہٗ عَلَی الماءِ لِیبلُوَ کُم اَیکُم اَحسَنُ عَمَلاً۔ آیت:7 (اور وہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے اور اس کا تخت پانی پر تھا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے)۔

اوپر زمین و آسمان کی چھ دن میں تخلیق کی تکرار کی گئی ہے سوائے اس فرق کے کہ تخلیق کائنات سے پہلے خدا کا تخت پانی پر تیر رہا تھا۔ یعنی زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے پانی اور تخت کا وجود تھا۔ پہلی دو آیات کے مطابق خدا نے زمین اور آسمان کی تخلیق کے بعد عرش پر استوا فرمایا۔ یہ وہی استراحت ہے جو تورات میں ساتویں دن خدا نے فرمائی تھی، یعنی یہاں پر تورات سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ بھی ملاحظہ کیا جائے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کی کہانی شخصِ سوم بیان کر رہا ہے یعنی یہاں حضرت محمد بات کر رہے ہیں۔ لیکن سورت قٓ کی آیت 38 میں خداوند خود بول رہے ہیں۔

4: وَلَقَد خَلَقناَ السَّموٰاتِ وَالاَرۡضَ وَمابَینَھُما فِی سِتَّۃِ اَیامٍ وَما مَسَّنا مِن لُغُوبٍ۔ (اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے چھ دن میں اور ہمیں کچھ بھی تکان نہ ہوئی)۔

اس آیت اور پہلی تین آیات میں فرق یہ ہے کہ یہاں صرف زمین و آسمان کی تخلیق پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان دونوں کے درمیان موجودات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مشکل اور عظیم کام کے نتیجے میں باری تعالیٰ پر تھکاوٹ طاری نہیں ہوئی۔

حیاتاتی قوت کی کمی کے نتیجے میں تھکاوٹ ظاہر ہوتی ہے اور اس کمی کو کمزور اور ناتواں انسانوں اور دیگر جانداروں سے منسوب کیا جا سکتا ہے، نہ کہ پروردگار کی ذات سے جو ازلی و ابدی ہے جو ہر قسم کی کمزوری، ضعف اور خارجی عوارض سے بالا ہے۔ تو پھر آفرینش کائنات سے خدا کے نہ تھکنے کا ذکر کس لیے ہوا ہے؟۔ کیا یہاں تورات کی اس بات کا جواب دیا جا رہا ہے کہ ساتویں دن اُس نے آرام کیا جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اُس دن اُس پر تھکاوٹ طاری ہو گئی تھی؟۔

5: **فُصّلَت :** قُل اِنَّکُم لَتکفُرُونَ بِالَّذی خَلَقَ الاَرضَ فی یومَینِ۔ آیت:9(کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا)۔

اس آیت میں محمد نہیں بلکہ پھر خدا بول رہا ہے، اور زمین کی تخلیق کا دورانیہ دو دن معین کیا گیا ہے۔ کہ اُس نے زمین کو دو دن میں تخلیق کیا۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام اہل مکّہ اس بات کو پہلے سے جانتے تھے کہ زمین دو دنوں میں تخلیق ہوئی ہے۔ لہٰذا اُنھیں ایسی ہستی کے وجود سے انکار نہیں کرنا چاہیے جس نے دو دن میں اس عظیم کارنامے کو انجام دیا ہے۔۔ لیکن عربوں کے پاس تو ایسی کوئی معلومات نہیں تھی کہ اُن سے پوچھا جاتا کہ زمین کے خالق کے منکر کیوں ہو۔ گو یہاں بظاہر خدا بول رہا ہے لیکن یہ خدائی استدلال نہیں ہے کہ وہ توقع کرے، کہ عرب "کوئی ہے جس نے دنیا کو دو دنوں میں بنایا ہے" کی سوچ کی وجہ سے ایمان لے آئیں۔ چنانچہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس آیت کو محمد کی تخلیق تصور کریں۔

6: اسی سورت فُصّلَت کی آیات 10 میں چار دنوں کا ذکر ہے جب خدا نے کُرّہ زمین پر خوراک کے وسائل پیدا کیے۔ فرمایا گیا ہے:

وَجَعَلَ فِیۡهَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِهَا وَبٰرَكَ فِیۡهَا وَقَدَّرَ فِیۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا فِیۡۤ اَرۡبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ۔

(اور اس نے زمین کے اوپر پہاڑ رکھے اور اس میں برکت دی اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے چار دن میں خوراک کا سامان مہیا کر دیا)۔

7: اس سورت میں خدا کے تخت کا عرش پر قائم ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ آیت 11 میں یوں فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ۔ (پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا پس اس کو اور زمین کو فرمایا کہ خوشی سے آؤ یا جبر سے دونوں نے کہا ہم خوشی سے آئے ہیں)۔

اس آیت میں زمین اور آسمان مؤنث کے طور پر استعمال ہوئے ہیں چنانچہ اس رُو سے یہاں فعل کے طور پر "قالتا" استعمال ہوا ہے لیکن آیت کے آخر میں "طائعین" جمع مذکر کے طور پر آیا ہے۔ اور یہ ان معاملات میں سے ایک ہے جہاں عربی زبان کے قواعد کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔

8: اسی سورت کی آیت 12 میں آسمان کو دو دنوں میں تخلیق کا بیان ہے:

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِىْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِىْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ۔ (پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کا حکم بھیجا)۔

ان آیات جو زمین اور آسمان کی تخلیق کے متعلق ہیں، اس سے تخلیق کے دن آٹھ ہو جاتے ہیں جو ایک ہفتے سے زیادہ ہیں۔ اس الجھن کے نتیجے میں انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے خدا کا کلام نہ سمجھے۔

9: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

(بے شک اللہ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں جس دن سے اللہ نے زمین اور آسمان پیدا کیے ان میں سے چار حرمت والے ہیں "رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرّم" اور یہی سیدھا دین ہے)۔

زمین کے باسیوں کے نزدیک سال سے مراد 365 اور ایک چوتھائی دن ہے جب کُرّہ زمین سورج کے گرد اپنا چکر مکمل کرتا ہے۔ اس گردش سے چار موسم پیدا ہوتے ہیں جنھیں انسان مد نظر رکھتے ہوئے اپنے کارہائے زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔ مہذب قوموں جیسے بابلیوں، مصریوں، چینیوں، ایرانیوں، یونانیوں وغیرہ نے سال کا تعین سورج کے حوالے سے کیا اور انہیں چار سہ ماہیوں یعنی بارہ مہینوں میں تقسیم کیا۔ اُنھوں نے یہ ضابطہ سورج کی آسمان میں مختلف منازل کا مشاہدہ کرنے کے بعد ترتیب دیا۔

لیکن بدوی اقوام کے لیے اپنی کم علمی کی وجہ سے ریاضی ایک مشکل مضمون تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے وقت کی حد بندی اور تعین کے لیے آسان راستہ اختیار کرتے ہوئے قمری مہینے کو قبول کیا۔ زراعت جو کہ نسل انسانی کا پہلا اور اہم ترین وسیلہ زندگی تھا، اس کی تنظیم کے حوالے سے قمری مہینے بالکل مددگار نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ بدوؤں نے ان مہینوں سے دوسرے انداز میں استفادہ کیا ہے۔ کہ آپس کی جنگوں اور دشمنی سے ہاتھ اٹھالیتے تھے اور چار مہینوں میں جنگ وخونریزی کو حرام قرار دے دیا گیا۔ عربوں کی یہ قومی رسم قرآن میں پورے جہان کے لیے ایک ایسے اصول کے طور پر آئی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ یہ خدا یا تو علاقائی بالخصوص جزیرہ عرب کا خدا ہے یا محمد چاہتے تھے کہ اس آیت کے ذریعے اس قومی رسم کو محفوظ اور اس کی اتباع سب پر لازم کر دیں۔ اسی طرح عربوں کی ایک اور رسم حج کے نام سے مسلمانوں کا فریضہ بنادی گئی ہے، اور صفا ومروہ کی پہاڑیوں کے درمیان دوڑنا شعائر اللہ قرار پایا ہے۔ اسی طرح سورت البَقَرَة کی آیت 189 میں ایک رسم کو فطرت کے مظہر کی علّت قرار دینے کے علاوہ اس کا حکم دیا ہے:

یسئلونک عنِ الاَھّلَةِ قل ھِی مَواقیتُ لِلنّاسِ وَ الحَجِ۔ (تم سے نئے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے)۔

مضحکہ خیز صورت یہ ہے کہ جلالین اس آیت کی یوں تفسیر کرتے ہیں: چاند کی حالت میں تبدیلیوں سے لوگوں کو زراعت اور حج کے موسم کے علاوہ روزہ رکھنے اور افطار کے متعلق آگاہ کرنا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ قمری مہینے زراعت کے حوالے سے لوگوں کے لیے سود مند نہیں ہیں۔ حج اور رمضان وغیرہ جیسی رسوم کو قمری مہینوں سے وابستہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کے ہاں شمسی کیلنڈر رائج نہیں تھا کہ اس کے حوالے سے ان کا تعین کرتے۔ نیز چاند کی حالت میں ہلال سے چودھویں کا چاند بننا اور بعد میں چھوٹا ہو جانا تاکہ ہلال دوبارہ طلوع ہو، کی اصل وجہ اُس کا زمین کے گرد چکر لگانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں چاند کی ایسی مختلف صورتیں ہزاروں سال بلکہ ہزاروں صدیوں سے موجود رہی ہے۔ عربوں کے حجاز اور نجد میں بسنے سے پہلے بلکہ اس سے بھی پہلے جب نسل انسانی زمین پر پیدا ہوئی، تب بھی صورت حال ایسی ہی تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ خالق کائنات اس بات سے آگاہ تھا چنانچہ وہ علّت کو معلول اور معلول کی علّت کی جگہ نہیں دے سکتا تھا۔

سورت الأنبیاء کی آیت 30 پڑھ کر انسان ورطہ حیرت میں پڑ جاتا ہے:

اَوَلَم یرَ الّذینَ کَفَرُوا اَنَّ السَّموٰاتِ وَ الاَرضَ کانَتا رَتقاً فَفَتَقنا ھُما۔ (کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین جڑے ہوئے تھے پھر ہم نے اُنھیں جدا جدا کر دیا)۔

صرف کافر ہی نہیں، جنھوں نے زمین و آسمان کو جڑے ہوئے اور علیحدہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ غیر کافر بھی اس بات سے بے خبر تھے کہ زمین اور آسمان آپس میں پہلے کیسے جڑے ہوئے تھے اور بعد میں کیسے علیحدہ ہوئے۔

خلافت یا حرصِ اقتدار

ہجری تقویم کے گیارہویں سال کے اوائل میں ایک ستارہ ڈوب جاتا ہے، وہ ستارہ جو تیئس سال قبل پہلے عرب قوم کے آسمان پر چمکا تھا۔ اُسی وقت پہلے فساد نے سر اٹھایا۔ ابھی پیغمبر اسلام کا جسد ٹھنڈا ابھی نہیں ہوا تھا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں ”منا أمیر و منکم أمیر“ (ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے) کی آواز بلند ہوئی، اور ریاست کی سربراہی کے مسئلے کی وجہ سے مہاجرین اور انصار کا خون جوش مارنے لگا۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو تاریخ اسلام طاقت کے حصول کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ کوششوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو لوگ ریاست پر قبضہ کے طلب گار تھے اُنھوں نے دین اسلام کو مقصد کی بجائے امارت اور سلطنت کے حصول کا ایک وسیلہ بنایا۔

بعثت اور ہجرت کے درمیانی تیرہ سالوں میں حضور کی دعوت خالصتاً روحانی تھی۔ اس دور کی تمام قرآنی آیات وعظ ہیں جن میں لوگوں کو ہدایت دینے، نیکی کرنے اور بدی و پلیدی سے اجتناب کا کہا گیا ہے۔

لیکن ہجرت کے بالکل اوائل میں روحانی دعوت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شرعی احکام سامنے آتے ہیں تاکہ مخالفین کے مقابلے میں مسلمانوں قوت پکڑیں اور ایک سیاسی و قومی وحدت کی بنیاد رکھی جا سکے، اور ایسے ہی ہوا۔ مساعد حالات ایک نئے معاشرے کی تخلیق اور ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کو ممکن بناتے ہیں۔

اُس تمام فرق کے باوجود جو مکّی اور مدنی ادوار کے درمیان تھا، خواہ اُس کا تعلق قرآنی مطالب کے مختلف ہونے سے تھا یا محمد کی روش اور کردار کی تبدیلی تھی، اس بات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا مقصد اسلام کا جڑ پکڑنا تھا جس کے پرچم تلے ایک ریاست قائم ہو سکے۔

دین اسلام کی اشاعت ایک ایسا محور تھا جس کے گرد حضور کی تمام تدابیر اور اقدام گردش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اُس کی خاطر طاقت کا استعمال، سیاسی قتل اور خونریزی بھی کی گئی جس کا بظاہر کوئی شرعی یا اخلاقی جواز نہیں تھا۔

لیکن حضور کی رحلت کے بعد محور تبدیل ہو جاتا ہے، دین کی بجائے اب خلافت کا حصول نقطہ محور بن جاتا ہے، اور چونکہ اسلام کی وجہ سے ہی نئی ریاست وجود میں آئی تھی، لہٰذا ریاست کی بقا اور پائیداری کے لیے اس علّت کو برقرار رکھنا ضروری تھی۔ سادہ لفظوں میں، چونکہ مذہب کے وسیلے سے ہی خلافت اور سیادت کا حصول ممکن ہوا تھا، لہٰذا مذہب کے اصولوں کو نظر انداز یا ان سے انحراف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے ابو بکر اور عمر کی خلافت کے بارہ سال اور کچھ دنوں کے دوران اسلامی اصولوں اور سُنّت رسول کی مکمل پیروی کی گئی۔ لیکن رحلتِ رسول کے زمانے سے ہم جوں جوں دور ہوتے ہیں تو مذہب کا مقصد تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ اب یہ خلافت اور ریاست کے حصول کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

رحلتِ رسول کے فوراً بعد سعد بن عبادہ اُمّت مسلمہ کی ریاست کی سربراہی حاصل کرنے کے لیے سامنے آتے ہیں۔ عمر اپنے ایک ہی ماہرانہ نشانے سے ابو بکر کو مسندِ خلافت پر بٹھا دیتے ہیں اور سعد کی تمام آرزوؤں کو خاک میں ملانے کا سبب بنتے ہیں۔ ابو بکر دو سال سے کچھ عرصہ اوپر کی خلافت کے بعد عمر کا قرض واپس کرتے ہوئے پیغمبر کی جانشینی کے لیے اُنھیں نامزد کرتے ہیں، اور اُن کو خلیفہ کے طور پر منتخب کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ بستر مرگ پر لیٹے عمر چھ آدمیوں پر مشتمل شوریٰ کو اپنے اندر سے خلیفہ چُننے کے لیے متعین کرتے ہیں۔ گو اپنے طور پر وہ خود عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں تھے۔

عثمان کا قتل، علی بن ابو طالب کی بیعت اور اُن کی پانچ سالہ خلافت کے دوران جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان جیسی تین جنگیں، عمرو بن العاص اور معاویہ کی چال اور بنو امیہ کی خلافت کا قیام، سانحہ کربلا، عبداللہ بن زبیر کو زیر کرنے کے لیے حرمت کعبہ کو پامال کرنا، بنو ہاشم کی فریاد، بنو امیہ کی خلافت

کا خاتمہ، بنو عباس کا خلافت پر قبضہ، فاطمیوں کی مغرب میں حکومت، اسماعیلیوں کی انقلابی تحریک اور وہ حالات کہ ہلاکو خان بغداد پر حملہ آور ہوا، یہ سب وہ علامات ہیں جو عربی مزاج پر غالب تھیں۔ امارت کے بخار اور طاقت کے حصول کو جانشینی پیغمبر کے عنوان کے تحت نیچے بیان کیا جارہا ہے۔

جانشینی پیغمبر

ایک ڈھانچہ جو محمد کی روحانی قوّت اور قرآنی آیات کی مدد سے وجود میں آیا تھا، اُسے اُن کی رحلت کے بعد کیسے چلنا چاہیے؟۔ کیا محمد کو اپنا جانشین خود مقرر کرنا چاہیے تھا، اور یوں وہ مسلمان کی اس نئی جماعت کو اُس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے، یا صحابہ کسی معاہدے اور اتفاق رائے سے پیغمبر کے بعد اُن کا جانشین منتخب کرتے؟۔ جس طرح رسالت ایک خدائی عطیہ تھا، کیا بعد میں آنے والی امامت و قیادت کو بھی ویسی ہی صفات سے بہرہ مند ہونا چاہیے تھا؟۔ اگر پیغمبر چاہتے کہ کسی کو اپنا جانشین مقرر کریں تو وہ کس کو اپنا جانشین مقرر کرتے؟۔ کیا وہ اپنے داماد، چچازاد بھائی اور بنو ہاشم کے سب سے ممتاز فرد کو مقرر کرتے، جس نے اُنھی کے دامن میں پرورش پائی۔ اور وہ پہلا مرد تھا جو اُن پر ایمان لایا، اور جس نے اپنے بازوِ تیغ زن سے اسلام کے فروغ کے لیے کام کیا، اور اُن کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان کی پروانہ کی؟۔ یا اس کا قرعہ اُس معزز بوڑھے کے نام نکلتا کہ اسلام کے آغاز میں جوں ہی وہ ایمان لایا تو اس سے اسلام کو شان اور وقار نصیب ہوا، اور مکّہ سے فرار کے وقت وہ ساتھی اور یارِ غار تھا۔ اور ہمیشہ ایک وفادار ساتھی اور پکا مومن رہا اور اپنی خوبصورت بیٹی کا عقد اُن سے کیا؟۔ یا اُن کی نظر مضبوط ارادے کے مالک، باتدبیر، سیاسی سوجھ بوجھ اور اسلام پر غیر متزلزل عقیدہ رکھنے والے عمر بن خطاب پر ہوتی؟۔

کیا حضور واقعی کسی کو اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتے تھے، اگر وہ کرنا چاہتے تھے تو اس صورت میں ایسے ارادے کے آثار ہمیں ہجرت کے دس سالوں میں دکھائی نہیں دیتے، آخر کیوں؟۔

یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ حضور جیسا صاحب فراست و تدبیر اور دور اندیش انسان، جس نے صِفر سے اپنے کام کا آغاز کیا اور عدم سے ایک ڈھانچے کو وجود میں لایا، اس قدر اہمیت کے حامل امر کے سلسلے میں غفلت کا شکار ہو گیا؟۔

ایک آدمی جس نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کہا تھا کہ جزیرہ نما عرب میں دو ادیان کا وجود نہیں ہونا چاہیے یعنی عربی قومیت اور دین اسلام کو ایک ہونا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس نے ایک نئی قائم ہونے والی ریاست کی قسمت کو اتفاقات اور حادثات کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا؟۔

اس قسم کے بے شمار سوالات ذہن میں سر اٹھاتے ہیں جن کا واضح اور قاطع انداز سے جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اور جو بھی کہا جاتا ہے وہ قیاس اور احتمال سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بہت زیادہ اختلافات اور انتشار جو تاریخ اسلام میں نظر آتا ہے، کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے کہ حضور نے وضاحت اور قطعیت کے ساتھ اس مشکل مسئلے کو حل نہیں کیا اور اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔

غدیر خُم کا واقعہ جو حجۃ الوداع سے واپسی کے دوران پیش آیا اور حضور نے فرمایا: ''مِن کُنت مولاَ فَھٰذا عَلی مولاہ'' (جس کا میں مولا ہوں، علی اُس کا مولا ہے)۔ شیعہ اسے علی کی خلافت کی دلیل سمجھتے ہیں، لیکن اہل سُنّت کے ہاں اسے قبولیت کی سند نہیں ملتی اور علی کو اگر وہ مولا قبول کرتے بھی ہیں تو پھر بھی وہ اسے خلافت کی دلیل کے طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ اُن کی رائے کے مطابق اسلام کی ترویج کے لیے علی بن ابو طالب کی اُن اسلامی خدمات جن کا ہر کوئی معترف تھا، کے متعلق رسول نے تعریفی فقرہ کہا تھا۔ لیکن اگر ہم چاہیں کہ اس قرینے پر علی کی خلافت کی بنیاد رکھیں تو ہمارا واسطہ ایک اور قرینے سے بھی پڑتا ہے جو ابو بکر کی خلافت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب حضور کی بیماری نے شدت اختیار کی، تو اُنھوں نے ابو بکر کو مسجد جانے کا حکم دیا کہ وہ اُن کی جگہ نماز کی امامت کریں۔ خلافت کے حوالے سے اہل سُنّت کی رائے بظاہر اہل تشیع سے زیادہ قابل قبول محسوس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وہ اس دلیل کو پیش کرتے

ہیں: ”اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ“ (آج میں نے تمہارے لئے دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی: المائدۃ۔ 3)۔

حضور نے اپنا مشن مکمل کر دیا تھا، اور قرآن میں مسلمانوں کے فرائض مقرر کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ اب اسلامی شریعت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ جس کے لیے (شیعیان کی رائے کے مطابق) کسی ایسے جانشین کی ضرورت ہو، جسے خدا کی جانب سے الہام ہوتا ہو اور جو رسول کی مانند خطا سے پاک ہو۔ بلکہ یہ کافی تھا کہ مسلمانوں کی ریاستی مسند پر ایسا شخص بیٹھے جو قرآنی احکامات کے نفاذ کے متعلق سنجیدہ ہو اور اپنی روش و کردار کے حوالے سے نبی کی پیروی کرتا ہو۔ چنانچہ صحابہ کسی بھی ایسے انسان کو خلافت کے لیے منتخب سکتے ہیں جو مسلمانوں کے انتظامی امور کو قرآن و سنت کی روشنی میں چلانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ سُنّیوں کی رائے کے ظاہری طور پر جائز لگنے کی وجہ، بعد کے واقعات یعنی، خلفائے راشدین کے دور کے حالات کو خاص انداز میں بیان کرنا ہے۔ لیکن اسلامی تاریخ کا مطالعہ بہت واضح اور غلطی کے احتمال کے بغیر اس کے برعکس کہانی کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے جھگڑے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں موجود لوگوں کے ذہن میں بنیادی خواہش اقتدار اور حاکمیت کا حصول تھا نہ کہ مسلمانوں کے امور کو قرآن و سُنّت کے اصولوں کے مطابق انجام دینے والے جانشین کی فکر کی جائے۔ وہاں مہاجرین اور انصار میں سے ہر کوئی خلافت کے حوالے سے اپنی اوّلیت کو ثابت کر رہا تھا، مہاجرین رشتہ داری کی بنیاد پر اور انصار مدد کرنے کی بنیاد پر۔ اہم بات یہ ہے کہ معززین کا یہ پہلا اجتماع جہاں خلافت کا فیصلہ ہونا تھا، وہاں بنو ہاشم کا ایک بھی فرد جیسے علی بن ابو طالب اور عباس بن عبد المطلب یعنی پیغمبر کا کوئی بھی نزدیکی ترین رشتہ دار موجود نہیں تھا۔ طلحہ بن عبید اللہ اور زبیر بن العوام، جن کا ابو بکر اور عمر بن خطاب کی طرح عشرہ مبشرہ میں شمار ہوتا ہے، علی کے گھر میں پیغمبر کو غسل دینے اور تدفین کے انتظامات کرنے میں مصروف تھے۔

جب یہ خبر علی تک پہنچی اور اُنھیں اس اجتماع کے فریقین کا پتہ چلا، اور اُنھیں یہ بتایا گیا کہ قریش اس دلیل کی وجہ سے انصار پر غالب آئے ہیں کہ انہوں نے خود کو رسول کے شجرے سے منسوب کیا ہے تو اُنھوں نے فرمایا: ”احتجوا بالشجرہ و اضاعوا الثمرہ“ (خود کو رسول کا شجرہ سمجھتے ہیں لیکن شجر کے میوے کو فراموش کر دیا ہے)۔

زبیر بن العوام نے جب سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعے کے متعلق سُنا تو طیش میں آ گئے اور اُنھوں نے کہا: ”میں تب تک تلوار کو نیام میں ڈالوں گا جب تک علی کے لیے بیعت نہ لے لوں“۔ ابو سفیان نے کہا: ”اے آلِ عبد المناف، مٹی اور غبار کا طوفان بلند ہو چکا ہے جسے خوبصورت لفظوں سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ابو بکر نے کیوں تمہارے کام میں مداخلت کی؟۔ کیا علی اور عباس اس قدر حقیر اور کمتر ہیں کہ خلافت کو قریش کی سب سے نچلی شاخ کے حوالے کر دیا گیا؟“۔ اس کے بعد وہ علی کی طرف مڑا اور کہا: ”اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ کہ میں تمہاری بیعت کروں اور اگر تم چاہتے ہو تو میں مدینے کی گلیوں کو پیادوں اور سواروں سے بھر دوں گا“۔ لیکن علی نے بیعت لینے سے انکار کر دیا۔

گویا علی بن ابو طالب ہی واحد ایسے انسان تھے جن کے پیغمبر سے خلوص اور اسلامی اساس سے وفاداری پر زمانہ جاہلیت کے عادات و اطوار غالب نہ آ سکے، جب کہ تمام دوسرے لوگ اقتدار کے حصول کے لیے کوشاں تھے۔ اسی مناسبت سے تاریخ طبری[170] اور ابن ہشام کی سیرت النبی میں درج اس قضیے کو ہم اس رائے کی تائید میں پیش کرتے ہیں:

170: تاریخ طبری یعنی ”تاریخ الرسل و الملوک“ کے مؤلف محمد بن جریر الطبری، عباسی عہد کے مشہور ایرانی تاریخ نویس، فقیہ اور مفسر قرآن تھے۔ ابو بکر خوارزمی کے بھانجے تھے۔ تمام عمر مختلف علوم کی کتابوں کی تالیف میں صرف کی۔ ان کی لکھی ہوئی ”تاریخ الرسل و الملوک“ تاریخ اسلام کی انتہائی اہم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ قرآن کی تفسیر لکھ رہے تھے، جس میں فقہا کے آپس کے اختلاف کا ذکر تھا۔ لیکن اُس میں امام احمد بن حنبل کا ذکر نہ کیا، کیونکہ یہ امام حنبل کو محدث نہیں سمجھتے تھے۔ امام حنبل کے پیروکاروں کو یہ پسند نہ آیا

"حضور کی بیماری کے آخری روز علی اُن کے گھر سے باہر آئے تو لوگ اُن کے گرد جمع ہو گئے تا کہ حضور کی طبیعت کا حال جان سکیں۔ علی نے جواب دیا: "بارئا بحمد اللہ" (اللہ کا شکر ہے کہ بہتر ہے)۔ عباس بن عبد المطلب اُنھیں کھینچ کر ایک طرف لے گئے اور کہا: "میں حضور کو جاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ تمام نشانیاں جو مرتے وقت بنو عبد المطلب کے چہرے پر ہوتی ہیں، وہ میں نے اُن کے چہرے پر دیکھی ہیں۔ واپس جاؤ اور پیغمبر سے جا کر پوچھو کہ اُن کے بعد کام کون سنبھالے گا۔ اگر جانشینی ہمیں ملی تو ہم آگاہ ہو جائیں گے اور اگر یہ کسی اور کو ملی تو وہ ہماری سفارش کریں"۔ علی نے کہا: "میں ہرگز ایسا سوال نہیں کروں گا کیونکہ اگر اُنھوں نے ہمیں اس سے محروم رکھا تو پھر کوئی ہمارے پاس نہیں آئے گا"۔

جس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ ہے کہ پہلے دو خلفاء کا زمانہ بخیر و عافیت گزرا۔ خلافت کے حصول کا اُن کا انداز جو بھی تھا، اور اس سلسلے میں جو بھی اعتراضات کیے جائیں، کہ اُنھیں صحابہ کا اجماع حاصل نہیں تھا۔ لیکن اُنھوں نے کم از کم اس اصول کو ضرور مد نظر رکھا کہ اللہ کی کتاب اور سُنّت رسول سے انحراف نہ ہونے پائے، اور دونوں خلفا نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔ اگرچہ خلافت کے نمایاں ترین دعوے دار یعنی علی بن ابو طالب نے ابو بکر کی بیعت کرنے میں چھ ماہ کی تاخیر کی، لیکن عمر کی بیعت کے سلسلے میں کسی ہچکچاہٹ یا انکار کی روایت نہیں ملتی۔

لیکن تیسرے خلیفہ کے دور میں صورت ایسی نہیں تھی، اور مذہبی روش سے اس قدر انحراف کیا گیا کہ عالم اسلام میں فساد اور سرکشی نے سر اٹھایا۔

تو اُنھوں نے نقصان پہنچانے کی خاطر طبری پر الحاد اور زندقہ کا الزام لگا دیا۔ جب طبری مرے تو اُنھیں عام قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا، چنانچہ وہ اپنے گھر کے صحن میں دفن ہوئے۔

ظاہری طور پر عثمان کی تقرری زیادہ جمہوری تھی جسے مسلمان عوام الناس کی تائید حاصل تھی۔ کیونکہ عمر نے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی کہ ان میں سے خلیفہ چنا جائے۔ یہ چھ افراد علی، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابو وقاص اور عبدالرحمن بن عوف تھے۔

یہ سچ ہے کہ پہلے عبد الرحمٰن نے اور پھر دوسرے لوگوں نے عثمان کی بیعت کی۔ لیکن یہ اس کے بعد ہوا ، جب علی نے اُن کی پیش کش کو مسترد کر دیا اور عثمان نے اُسے قبول کر لیا۔ عبد الرحمٰن نے پھر تین دن تک ایک قسم کی رائے شماری کروائی تاکہ عمومی رائے عامہ کو جانا جا سکے۔ لیکن سُنّت رسول سے انحراف بھی اسی خلیفہ کے دور میں ہوا جو اُمّت مسلمہ کے اجماع سے خلیفہ بنا تھا۔ اور اُس پر سُنّت کی خلاف ورزی کرنے کے پچیس الزامات عائد ہوئے۔ سُنّت کی حدود سے یہ تجاوز عثمان کے رشتہ داروں کے لالچ اور حرص کی وجہ سے ہوا تھا۔

عثمان ایک شریف النفس انسان تھے، لیکن اپنے رشتہ داروں کی خواہشات کے سامنے انتہائی کمزور ثابت ہوئے۔ یوں اس حوالے سے وہ عمر بن خطاب کے بالکل برعکس تھے،۔ اور بڑے صحابہ کرام کے مشوروں اور راہنمائی نے بھی اُن پر کوئی اثر نہ کیا۔

وہ خلیفہ جس کے انتخاب کو مدینہ کے مسلمانوں کی رائے عامہ اور سب سے زیادہ صحابہ رسول کی حمایت حاصل ہوئی وہ علی بن ابو طالب تھے، جنھیں اپنے چھوٹے سے دور حکومت میں تین جنگیں لڑنا پڑیں، جنھیں ہر طرف سے دھوکہ دہی، سازش اور فریب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ طلحہ اور زبیر نے بھی اُن سے منہ موڑ لیا، اور عہد شکنی کے مرتکب ہوتے ہوئے بیعت توڑ دی، کیونکہ علی نے انہیں بصرہ اور کوفہ کی گورنری دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ایسی درجنوں مثالوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ خلافت کے بارے میں سُنّیوں کی رائے اصولی طور پر درست ہے لیکن عملی طور پر یہ غلط ثابت ہوئی ہے اور اس کی شہادت تاریخی واقعات سے ملتی

ہے۔ کہ اسلامی معاشرے میں اس سے بھلائی اور نیکی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ قرآن اور سُنّت کے مطابق قرآنی احکامات کے اجرا کی بجائے یہاں دولت اور طاقت کا لالچ غلبہ حاصل کر گیا تھا۔

چنانچہ یہ سوچ دوبارہ ذہن میں سر اٹھاتی ہے، کہ اپنا جانشین مقرر کرنے کے حوالے سے حضور کسی بھی دوسری جماعت سے زیادہ صلاحیت کے مالک تھے۔ وہ انسان، جو اپنے مقام نبوّت سے قطع نظر، اپنی سوچ، اخلاقی قوت اور دوسری انسانی خوبیوں کے حوالے سے اپنی ساتھیوں پر بلاشبہ برتری رکھتا تھا، جس کا بنیادی مقصد دین اسلام کی ترویج و استحکام تھا، اور جو مردم شناسی کی قوت سے مالا مال اور اپنے ساتھیوں کی سوچوں اور کردار سے حد درجہ واقف تھا، اپنے جانشین کا تعین کرنے میں کیا وہ ہر کسی سے زیادہ اہل نہیں تھا؟۔ لیکن اپنی زندگی میں اور اپنے طاقت کے عروج پر، جب اُس کی بات کو رد کرنے کی کوئی بھی ہمت نہیں رکھتا تھا، اُس نے اس کام میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالا؟۔ کیا اُس نے اس اہم کام کو انجام دینے میں غفلت برتی؟ یا اُس نے سوچا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے؟۔ اُس کے سامنے ایک وسیع مستقبل پڑا ہے اور اس مسئلے کے حل کے لیے اُس کے پاس ابھی کافی وقت اور مواقع موجود ہیں؟۔ کیونکہ حضور کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ تریسٹھ سال کی عمر میں بیمار ہوئے اور اُن کی بیماری نے بھی طوالت اختیار نہیں کی تھی۔ چنانچہ اس بات کا بہت زیادہ امکان و احتمال ہے کہ اُنھوں نے اپنی بیماری کو مہلک نہ سمجھا ہو اور آخری دن تک اُنھیں اپنے شفایاب ہونے کی قوی امید ہو، اور اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنی بیماری کے پہلے روز اپنی بیویوں سے اجازت لی کہ وہ عائشہ کے گھر منتقل ہو جائیں، جنھیں سر درد تھا تو آپ نے از راہ مذاق فرمایا: "کیا تم نہیں چاہتی کہ مجھ سے پہلے مر جاؤ تا کہ میں تمھیں غسل دوں اور تمھارا جنازہ پڑھاؤں؟"۔ عائشہ نے طنزاً جواب دیا: "تا کہ تم بے دھڑک میرے گھر میں اپنی بیویوں کے ساتھ عیاشی کر سکو"۔

یعنی حضور کے تصور میں یہ نہیں تھا کہ وہ مرنے والے ہیں۔ وہ قرینہ جو اس مفروضے کو جواز فراہم کرتا ہے، وہ درج ذیل واقعہ ہے:

حضور نے شامی عیسائیوں سے جنگ کرنے کے لیے ایک لشکر تشکیل دیا اور اسامہ بن زید جو ایک بیس سالہ نوجوان تھا، کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا، تو آپ کو خبر پہنچی کہ اس تقرری پر مسلمانوں کے اندر ناراضگی اور ناپسندیدگی کی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئی ہیں، کیونکہ بہت سارے بزرگ اور معتبر مہاجر اور انصار اس لشکر کا حصہ تھے۔ یہ سُن کر حضور اس قدر ناراض ہوئے کہ بخار کی حالت میں اپنے سر پر ایک کپڑا لپیٹا، اور مسجد آکر منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کی ناراضگی کو نافرمانی قرار دیا اور اسامہ کی تقرری کو ہر حالت میں جائز ٹھہرایا اور یوں اس بڑبڑاہٹ کا خاتمہ ہوا۔ اس عمل سے نشاندہی ہوتی ہے کہ پیغمبر نے اپنے مرض کو ایک عارضی بیماری سمجھا تھا اور اُنھیں اپنے صحت مند ہو جانے کی امید تھی۔

قرینہ جو اس مفروضے کو تقویت بخشتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرا انتہائی اہم معاملہ، جو دین اسلام کی تقدیر کا تعین کرنے میں اہمیت اور اثر کے حوالے سے جانشین کی تقرری سے کم اہم نہیں تھا، اور جو اُنھوں نے طے نہیں کیا کہ اپنی نگرانی میں قرآن کو جمع اور مرتب کرواتے۔ قرآن حضور کی رسالت کی سند اور مسلمانوں کے لیے اخلاق و کردار کے حوالے سے ایک ضابطہ ہے جو اُس وقت تک صحابیوں اور مختلف کاتبین وحی کے درمیان بکھرا ہوا تھا اور ابھی تک اسے جمع نہیں کیا گیا تھا۔

آپ کے فرمان اور راہنمائی کی روشنی میں کی گئی قرآن کی تدوین مفسرین اور فقہا کی بہت ساری مشکلات حل کر دیتی۔ قرآن کی قرأت کے اختلافات پیش نہ آتے اور ناسخ و منسوخ کا تعین ہو جاتا۔ خصوصی طور پر قرآن کی تدوین سورتوں اور آیات کے نزول کی ترتیب کو مد نظر رکھ کر کی جاتی جیسے علی بن ابو طالب نے کی تھی۔

زید بن ثابت کہتے ہیں: ''ابو بکر نے مجھے طلب کیا اور کہا، عمر کافی عرصہ سے مجھے قرآن کو جمع اور مرتب کرنے کی تاکید کر رہے ہیں، میں اس کام سے گریز کر رہا تھا۔ کیونکہ اگر قرآن کی تدوین ضروری ہوتی تو حضور نے اس کے متعلق فرمایا ہوتا، لیکن یمامہ کی جنگ کے بعد کہ جس میں بہت زیادہ صحابی مارے جا

چکے ہیں۔ اور ہر کسی کے پاس قرآن کا کچھ حصہ تھا جو اُن کے ساتھ ہی چلا گیا، اب مجھے عمر کی رائے درست لگتی ہے"۔

ملاحظہ کریں کہ اس قدر بنیادی اور اصولی سوچ عمر کے ذہن میں آئی اور اُنھوں نے ابو بکر کو یہ کام کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن بد قسمتی سے قرآن کی تالیف مکمل ہونے میں چند سال لگ گئے، جسے عثمان کے دور میں قائم کی گئی کمیٹی نے انجام دیا۔ اس میں نزولی ترتیب کا فقدان ہے، اور اس کی تدوین کرتے وقت علی بن ابو طالب اور حتیٰ کہ عبد اللہ بن مسعود[171] کے نسخے سے بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ سورتوں کی

171: عبد اللہ بن مسعود ایک جلیل القدر صحابی ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے مفسر قرآن بھی تھے۔ اُن کے بقول اُنھوں نے رسول اللہ کے سامنے بیٹھ کر ستر سورتوں کی عبارت کی تصدیق کروائی تھی۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ نے ایک بار عبد اللہ سے کہا کہ وہ قرآن سنائیں، عبد اللہ نے جواب دیا کہ قرآن تو آپ پر نازل ہوتا ہے اور آپ مجھ سے قرآن سننا چاہ رہے ہیں، عبد اللہ کے اس جواب سے رسول اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عبد اللہ نے تمام اہم غزوات میں حصہ لیا۔ عمر بن خطاب نے اپنے دور خلافت میں تمام صحابیوں کو حج کے سوا مدینہ چھوڑنے سے روک دیا تھا، جس کے پیچھے اُن کی دور اندیشانہ سوچ یہ تھی کہ یہ لوگ جب خلافت کے دور دراز علاقوں میں جائیں گے تو عقیدت کے مارے لوگ ان کے گرد جمع ہوں گے جس سے مرکز گریز انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اُنھوں نے خود عبد اللہ کو شام بھیجا کہ وہ وہاں جا کر لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ عثمان بن عفان کے زمانے میں عبد اللہ بیت المال کے خازن تھے۔ عثمان نے اپنے رضاعی بھائی کو وہاں کا والی مقرر کیا تھا، (یہ وہی ولید بن عقبہ ہے جس کے متعلق تاریخ اسلام میں درج ہے کہ وہ رات بھر شراب پیتا اور صبح کے وقت نشے میں جھومتا ہوا مسجد آ کر نماز کی امامت کرتا۔ ایک بار اس قدر نشے میں تھے کہ سجدے سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیا اور پوچھا کہ کیا اور نماز پڑھاؤں، لوگوں کی شکایات کے باوجود عثمان نے ولید کو اس منصب سے نہ ہٹایا)۔ ولید بن عقبہ نے بیت المال سے قرضہ لیا جسے وہ واپس کرنے میں لیت و لعل سے کام لے رہے تھے۔ عبد اللہ کے تقاضوں سے تنگ آ کر ولید نے عثمان کو پیغام بھیجا جس کے جواب میں عثمان نے عبد اللہ کو لکھا کہ تم ہمارے خازن ہو اور خازن ہی بن کر رہو۔ یہ بات سن کر عبد اللہ کو غصہ آ گیا اور اُنھوں نے بیت المال کی چابیاں ولید کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا کہ میں کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا خازن ہو۔ عبد اللہ واپس پہنچے جہاں عثمان مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے جسے چھوڑ کر اُنھوں نے عبد اللہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ بد مزگی پیدا ہونے کے نتیجے میں عثمان نے اپنے غلام کو کہا کہ عبد اللہ کو اٹھا کر مسجد سے باہر پھینک دو۔ عبد اللہ انتہائی مہین اور کمزور جسم کے مالک تھے، مسجد سے باہر پھینکے جانے کے نتیجے میں اُن کی

ترتیب انتہائی الجھی ہوئی ہے۔ کم از کم ترتیب کو یوں ہونا چاہیے تھا کہ پہلے مکّی سورتیں قرآن میں جگہ پاتیں اور بعد میں مدنی سورتیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ جو کام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بہت زیادہ مکّی آیات کو مدنی سورتیں میں جمع کر دیا گیا ہے اور مدنی سورتوں کے ٹکڑے مکّی آیات میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔

حضور کا قرآن کی تدوین کے لیے قدم نہ اٹھانا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ موت نے انہیں غفلت میں آ لیا۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے آخری روز 28 صفر یا 12 ربیع الاوّل گیارہویں ہجری جو عیسوی کیلنڈر کے مطابق 18 جون 632ء بنتا ہے، تک اپنی بیماری کو مہلک نہیں سمجھا۔ آخری روز مرض نے شدت پکڑی اور وہ بے ہوش ہوئے، ہوش آنے کے بعد اُنھیں احساس ہوا کہ اب آخری وقت آ پہنچا ہے تو اُنھوں نے حاضرین سے کہا: ”اِیتونی بدواۃٍ و صحیفۃ اکتب لکم کِتاباً، لَن تَضلوا بعدہٖ ابداً“ (دوات اور کاغذ لاؤ کہ میں کچھ لکھوں تاکہ تم کبھی گمراہ نہ ہو پاؤ)۔ بدقسمتی سے حضور کی آخری درخواست کا مثبت جواب نہیں دیا گیا۔ پہلے تو لوگ حیران ہوئے اور پھر تنازعہ پیدا ہو گیا۔ ایک نے کہا، کیا یہ ہذیانی کیفیت میں بول رہے ہیں؟۔ کیا بہتر نہیں کہ ہم (اس کیفیت کو دور کرنے کے لیے) کچھ پڑھیں۔ زینب بنت جحش اور اُن کے ساتھیوں نے کہا: ”جو وہ مانگ رہے ہیں اُن کے لیے لایا جائے“۔ عمر نے کہا: ”ایسا لگتا ہے کہ بخار نے انہیں مغلوب کر لیا ہے، ہمارے پاس قرآن ہے، اللہ کی کتاب ہمیں کافی ہے“۔ تنازعہ طول پکڑ گیا۔ ایک گروہ کا کہنا تھا کہ اُنھیں خط لکھنے دیا جائے تاکہ کوئی گمراہ نہ ہو۔ دوسرا گروہ اس کے خلاف تھا اور وہ قرآن کو ہدایت کے لیے کافی کہہ رہا تھا۔ حضور نے اس جھگڑے سے تنگ آ کر فرمایا: ”اٹھو، پیغمبر کی محفل میں جھگڑا مت کرو“۔ کوئی نہیں جانتا کہ حضور جو کہ لکھنا نہیں جانتے تھے، وہ کیا لکھوانا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ اپنا جانشین مقرر کرنا چاہ رہے تھے یا قرآن میں کچھ ایسا موجود نہیں تھا جسے وہ اب

دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ عثمان تیمار داری کے لیے گئے تو عبد اللہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عبد اللہ نے وصیت کی کہ میری نماز جنازہ عثمان نہیں پڑھائے گا، چنانچہ اُن کی نماز جنازہ عمار بن یاسر نے پڑھائی۔

لکھوانا چاہ رہے تھے؟۔ کیا وہ عرب قوم کے لیے آئندہ کی پالیسی لکھوانا چاہ رہے تھے یا قرآن میں موجود کسی حکم کو نسخ فرمانا چاہ رہے تھے؟۔ اگر کوئی اہم بات تھی جس سے اسلام کا مستقبل متاثر ہو سکتا تھا تو اُنھوں نے وہ بات زبانی کیوں نہ کہہ دی؟۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا مناسب جواب نہ ہونے کی وجہ سے یہ معمہ کبھی حل نہیں ہو گا۔

دوسری طرف عمر جیسے مضبوط اور کھرے آدمی نے اسلام اور پیغمبر اسلام سے تعلق اور وابستگی کے باوجود قلم اور کاغذ لانے سے کیوں روکا، اور اس بات پر اصرار کیا کہ پیغمبر اپنی آخری وصیت کا اعلان نہ کریں اور "کفانا کتاب اللہ" (ہمیں خدا کی کتاب کافی ہے) کے پیچھے کیوں پناہ لی؟۔ کیا یہ سچ ہے کہ وہ حضور کے آخری کلمات کو حضور کے درد اور ہیجان کی کیفیت کا نتیجہ سمجھ رہے تھے یا اُنھیں ڈر تھا کہ کہیں حضور اپنے جانشین کا اعلان نہ کر دیں؟۔ کیا اپنی سیاسی سمجھ بوجھ، اپنی حقیقت پسندانہ فراست اور عمیق سوچ کی وجہ سے اُنھوں نے اس احتمال کو ممکن جانا ہو کہ زندگی کے آخری لمحات میں کہیں حضور خلافت اور مسلمانوں کی ریاست علی کے حوالے نہ کر دیں؟۔ اور اس صورت میں اقتدار کی ڈور اُن کے ہاتھوں سے نکل جائے؟۔ کیونکہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت پیغمبر کی وصیت پر عمل کرے گی اور یوں معاشرے میں اُن کی فعالیت اور حرکت، مسائل اور اُن کے حل کے میدان کا دائرہ اثر تنگ اور محدود ہو جائے گا۔ یہ شیعیان کا عقیدہ ہے اور وہ شائد اتنے زیادہ غلط بھی نہیں ہیں، وگرنہ پیغمبر کی آخری خواہش کی مخالفت کرنے کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی۔

عمر اسلام کے بنیادی اراکین میں سے ہونے کے علاوہ پیغمبر کے معتبر ترین اور با اثر ترین صحابیوں میں سے ایک تھے اور اسلام کے سیاسی معاملات میں حضور کے ساتھی اور مددگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک زیرک سیاستدان، دور اندیش انسان اور ہر معاملے میں صاحب رائے و نظر تھے اور شائد

اُنھوں نے اپنی فراست سے دریافت کر لیا ہو گا کہ اگر پیغمبر نے کسی کو اپنا جانشین مقرر کرنا ہے تو وہ ابو بکر اور علی میں سے ایک ہو گا۔

علی خود بھی آزاد سوچ رکھنے والے اور صاحب ارادہ انسان تھے۔ بنو ہاشم کے ممتاز فرد، پیغمبر کے داماد، صف اوّل کے مجاہد اور کاتب وحی تھے۔ مزید بر آں وہ کسی کا بھی اثر قبول نہیں کرتے تھے۔ لیکن ابو بکر عمر کے ایک شفیق اور گہرے دوست تھے۔ ہجرت کے پہلے سال سے ہی اُن کی ابو بکر کے ساتھ دوستی اور آنا جانا دوسرے اصحاب کے مقابلے میں زیادہ تھا اور اکثر امور پر وہ ہم خیال اور متحد ہوا کرتے تھے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک نے خلیفہ بننا ہے تو علی کے مقابلے میں اُن کی ترجیح ابو بکر تھے۔

ابو بکر اتنے با اثر نہیں تھے اس کے علاوہ وہ طبعاً ملائم اور ٹھنڈے مزاج کے مالک تھے لہٰذا اقتدار کافی حد تک عمر کے ہاتھ میں ہونا تھا۔ اور ایسی صورت کہ علی اگر خلیفہ ہوتے جس کی پشت پر پورا بنو ہاشم تھا اور اکثر بزرگ صحابہ بھی اُن کی عزت کرتے تھے، تو وہ متن میں نہیں بلکہ حاشیے کی جگہ پر ہوتے[172]۔

یقینی طور پر ایک اور اہم نکتہ عمر کی حقیقت پسندانہ سوچ اور دور اندیشی سے بچ نہیں سکتا تھا اور وہ ابو بکر کی عمر تھی جو ساٹھ سال سے اوپر تھی۔ اپنی اس عمر کی وجہ سے جہاں وہ انتہائی محترم ٹھہرتے تھے وہیں عمر کو امید تھی کہ اُن کے بزرگ ہونے کی وجہ سے وہ خلیفہ بننے میں کامیاب ہو جائیں گے جب کہ اُن کے مقابل علی کی عمر صرف بتیس سال تھی۔ چنانچہ ابو بکر کی خلافت اُن کی سیاسی خواہشات کے لیے زیادہ قابل ترجیح اور بہتر امکانات لیے ہوئے تھی۔

172: اُو (عمر) در حاشیہ قرار می گیر د نہ متن۔ اوپر فارسی کے اس فقرے کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس فقرے سے مراد یہ ہے کہ اگر علی خلیفہ بن جاتے تو عمر کو سیاسی و سماجی حالات و معاملات میں مرکزی حیثیت حاصل نہ ہوتی جو ابو بکر کے خلیفہ ہونے کی صورت میں انہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ علی کی خلافت میں عمر کی حیثیت ثانوی ہوتی۔

یہ وہ ملاحظات ہیں جو حضور کی وصیت لکھنے کی خواہش اور درخواست پر عمر کی فکر مندی کی توجیہ و تفسیر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاندان ہاشم میں نبوت اور خلافت دونوں کا اکٹھا ہو جانا اتنا سادہ امر نہیں تھا جسے آسانی سے قبول کیا جا سکتا، اور دوسروں کی جاہ طلبانہ امنگوں پر امید کا دروازہ بند کر دیا جاتا۔

ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کا اپنا جانشین مقرر کرنے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہے تھے۔ لیکن عمر نہیں چاہتے تھے کہ وہ گومگو کی کیفیت میں رہیں اور پہلے سے طے شدہ کسی ناگہانی صورت حال کا انہیں سامنا کرنا پڑے۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے اپنے اس احتمال کو بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ممکن ہے حضور اپنا جانشین مقرر کرنا چاہ رہے ہیں۔ بلکہ اُنھوں نے یہ تاثر دیا کہ حضور بخار کی شدت اور شدید درد کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں، اور وہ اس حالت میں قرآن میں کسی قسم کا اضافہ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں، قرآن جو تب نازل ہوا ہے جب وہ صحت مند تھے اور اُس میں تمام احکامات شامل ہیں۔

یہاں فوراً ایک دوسری بات ذہن میں آتی ہے کہ اگر حضور کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنا جانشین مقرر کریں تو اُنھوں نے اسے زبانی بیان کیوں نہیں فرمایا؟۔ اختلاف پیدا ہو جانے کے بعد، اور قلم، دوات اور کاغذ لانے پر عمر کی طرف سے جب مخالفت کا سامنا ہوا تو کم از کم اپنے ارادے جو شیعیان کے مطابق علی کی خلافت پر تقرری تھا، کا زبانی اعلان کر دیتے۔ خصوصاً جب کہ حاضرین مجلس کی تعداد بھی کم نہیں تھی، حضور کا آخری فیصلہ اور ارادہ ایک دم سے تمام مسلمانوں میں پھیل جاتا، چنانچہ اُنھوں نے اسے زبانی کیوں نہیں فرمایا؟۔

بظاہر یہ سوال ایک معمے کا رنگ اختیار کر لیتا ہے جس کو حل کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن ایک اہم بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ بہت عرصہ سے حضور پر ایک سوچ غالب آچکی تھی۔ جس میں تیئیس سالوں میں روز بروز شدت پیدا ہوئی تھی جو اس حد تک جا پہنچی کہ اُسے حضور کی شخصیت کا

حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ تھی کہ اسلام کی بنیاد پر ایک ایسا نیا معاشرہ تخلیق کیا جائے جو عرب قومیت کے ساتھ یکجائی اختیار کر جائے۔

حضرت محمد اپنی ذاتی فراست اور انتہا درجے کی مردم شناسی کی صلاحیت کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کے رویوں اور رجحانات سے بخوبی واقف تھے۔ خصوصی طور پر عمر کی شخصیت، اُن کی اخلاقی قوت، تدبیر اور دور اندیشی سے وہ آگاہ تھے اور واقعات کے سلسلے میں اُن کی حقیقت پسندی اور دینی معاملات میں اُن کی استواری اور غیر متزلزل ایمان سے واقف تھے۔ ابو بکر اور عمر کے حُسن روابط اور گہری دوستی کا بھی حضور کو علم تھا۔ عمر اسلام قبول کرنے کے زمانے سے ہی حضور کے قریبی ترین دوستوں میں سے تھے، حتیٰ کہ کئی مواقع پر انہوں نے اپنی حقیقت پسندانہ سوچ کی وجہ سے ایسے فیصلے اور تدابیر جو اسلام کی ترویج کے لیے مفید تھے، حضور کو سجھائے اور اُن پر عمل کرنے کے لیے اصرار کیا۔ دوسرے لفظوں میں ابو بکر کے برعکس عمر محض ایک فرمانبردار پیروکار ہی نہیں تھے بلکہ وہ خود صاحب رائے تھے اور اپنی رائے سے حضور کو آگاہ کرتے تھے اور حضور اُن کی رائے کو صائب سمجھتے ہوئے اکثر اُس پر عمل کرتے تھے۔

سیوطی کی کتاب "الإتقان في علوم القرآن" میں "وہ جو قرآن میں صحابہ کی زبان میں اور تجویز پر نازل ہوا ہے" کے عنوان کے تحت ایک باب موجود ہے، اور اس کا زیادہ حصہ عمر سے متعلق ہے۔ حتیٰ کہ وہ مجاہد بن جابر سے نقل کرتے ہیں: "كان عمر يرى الرأي فينزل به القرآن" (عمر کوئی مشورہ دیتے تھے اور بعد میں اسی سے مطابقت رکھنے والی آیت نازل ہو جاتی تھی)۔

خود عمر یہ سمجھتے تھے کہ قران کی تین آیات اُن کی رائے کے مطابق نازل ہوئی ہیں: حجاب، بدر کے قیدیوں اور مقام ابراہیم کے متعلق[173]۔ اس ضمن میں مفسرین اور علمائے حدیث و سیرت نے بہت زیادہ لکھا ہے جس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ عمر ایک ذہین، صاحب رائے و نظر شخص ہونے کے علاوہ حضور کے معتمد تھے۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حضور کے ساتھیوں میں عمر جیسی خصوصیات کے مالک پانچ آدمی نہیں تھے۔ چنانچہ اگر ایسا آدمی حضور کی وصیت لکھنے کی درخواست کی مخالفت کرے تو واضح ہوتا ہے کہ ایسا کسی نیت یا مقصد کے تحت ہوا ہے۔ اور اگر حضور زبانی علی کو جانشین مقرر کر دیتے تو ممکن ہے کہ حضور کی وفات کے بعد ابو بکر، عمر اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے اس تقرری کو مخالفت کا سامنا ہوتا۔ عمر اسلام کے طاقتور ارا کین میں سے ایک تھے اور اگر ابو بکر بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتے تو حضور کے مشن کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔

اپنی زندگی میں مقام نبوت کی وجہ سے حضور کے پاس لا محدود شان اور اختیار تھا۔ پیغمبر ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے، حتیٰ کہ وہ اُسامہ بن زید کو لشکر کا سپہ سالار مقرر کر دیں اور ایک ہی جھڑکی سے سب کو اُن کی جگہ پر بٹھا دیں۔ اور احتجاج کی آوازیں لوگوں کے سینوں میں ہی گھٹ کر رہ جائیں، لیکن اُن کی موت کے بعد کیا ہو گا؟۔ جب وہ نہیں رہیں گے تو قبائلی اختلافات کو کون دور کر پائے گا؟۔ کون ہو گا جو بدامنی کے سیلاب کو روکے گا اور سیادت و امارت کے حصول کی خواہش کو سُلا پائے

173: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اپنے رب کے موافق ہوا تین باتوں میں، ایک مقام ابراہیم میں نماز پڑھنے میں (جب میں نے رائے دی کہ یا رسول اللہ! آپ اس کو مصلٰی بنایئے ویسا ہی قرآن میں اترا "وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ": البقرۃ۔ 125)، دوسرے عورتوں کے پردے میں، تیسرے بدر کے قیدیوں میں۔(صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابہ)۔

گا؟۔ اس طرح اسلام کا بنیادی اور حتمی مقصد جو ایک اسلامی معاشرے کا قیام تھا، چند دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ اور کیا عرب پھر دوبارہ اُنھی تنازعات اور قبائلی دشمنیوں کا شکار نہیں ہو جائیں گے ؟۔

شائد اسی قسم کے تحفظات حضور کے ذہن میں پیدا ہوئے ہوں گے اور اس وجہ سے اُنھوں نے خاموشی اختیار کی اور حاضرین کو چلے جانے کا کہنے پر اکتفا کیا۔ حضور کے خاموش رہنے اور خلیفہ کے تعین سے صرف نظر کرنے کے متعلق کچھ اور احتمالات بھی فرض کیے جاسکتے ہیں۔

علی بن ابو طالب میں ایسے فضائل اور اچھائیاں تھیں کہ دوست و دشمن اُس کا اعتراف کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بُت پرستی نہیں کی اور نو سال کی عمر میں ایمان لائے تھے۔ انہوں نے تمام اہم غزوات میں شرکت کی، احد کی جنگ میں حضور کو موت سے بچایا تھا، اور جنگ خندق میں عظیم بہادر عرب عمرو بن عبدود کو مارا۔ جنگ خیبر میں اہم قلعے ناعم کو فتح کیا۔ ہجرت کی رات حضور کے بستر پر سوئے اور یوں اپنے آپ کو موت کے نشانے پر رکھا۔ دشمنوں کو ہلاک کرنے کی تعداد میں وہ سب صحابہ سے بازی لے گئے، اور صراحت، فصاحت، شجاعت اور بہت شدت سے نبی کی پیروی کرنا اُن کی صفات تھیں۔ وہ خاندان بنو ہاشم کے سب سے نمایاں اور ممتاز شخص تھے۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ وہ حضور کے جوان ترین صحابی تھے اور اُن کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ کیا اُن کی خلیفہ کے طور پر تقرری اقرباپروری نہ ہوتی جس سے دوسروں میں قبائلی حمیت نے سر نہیں اٹھانا تھا جس سے مسلمانوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑتا؟۔ علی میں دوسری خوبیاں اور فضائل بھی تھے اور شائد ان کے یہ فضائل اور خوبیاں ہی اُن کی ترقی میں حائل اور ریاست کے راستے میں پڑے پتھر کی مانند رکاوٹ تھے۔

ایسے لوگوں پر، جو اقتدار کی خاطر فساد اور جھگڑے سے گریزاں نہیں تھے، حکومت کرنے کے لیے نرمی، درگزر کی خصوصیات کے علاوہ ماتحتوں کی ضروریات اور خواہشات کا دھیان رکھنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ خصوصیات حضور میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ فتح مکّہ کے موقع پر اُنھوں نے بہت

سارے دشمنوں کے قتل سے صرف نظر کیا اور ہوازن سے حاصل کیے گئے مال غنیمت قریشی سرداروں کے درمیان تقسیم کیا جو حال ہی میں ایمان لائے تھے۔ لیکن اس طرح کے فیصلہ کن معاملات میں غیر موزوں اور نامناسب مطالبات سے نمٹنے وقت علی انتہائی بے لچک تھے۔ چنانچہ جب خلیفہ سوم نے عبیداللہ بن عمر کے مسئلے پر علی سے مشورہ چاہا تو علی نے بغیر کسی ہچکچاہٹ یا تامل کے اسلامی قانون کے مطابق اسے ہرمزان کے قتل کی وجہ سے قصاص کا مستحق قرار دیا۔ لیکن عثمان نے اُن کی رائے پر عمل نہ کیا، اور ہرمزان کے ناحق بہائے گئے خون کی دیت ادا کر دی، اور عمر کے بیٹے کو موت سے نجات دلا کر عراق روانہ کر دیا۔ یمن کی جنگ میں بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگا، مجاہدین کا تقاضا تھا کہ مال غنیمت وہیں اُن کے درمیان تقسیم کیا جائے۔ لیکن علی نے اُن کے مطالبے پر کان نہیں دھرے اور تمام مال غنیمت کو جوں کا توں حضور کو بھیج دیا۔ تاکہ وہ خود عادلانہ طور پر اسے تقسیم کریں تاکہ یمنی جنگجوؤں کی شکایات کی وجہ سے علی پر کوئی الزام نہ لگ سکے۔

حضور علی کی روح اور فضائل سے آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ علی میں رواداری اور برداشت نہیں ہے۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے ہیں وہ اُس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ رویہ گو اپنے طور پر قابل ستائش ہے لیکن یہ ایسے لوگوں کے لیے موافق نہیں ہے جن کے دین اور عقیدے میں ذاتی اغراض اور طمع کی آمیزش ہو۔ اس وجہ سے لوگ اُن کی امارت وسیاست سے فکر مند رہتے ہیں اور جوں ہی حضور زندگی کے منظر نامے سے غائب ہوتے تو وہ ہنگامے اور چپقلشیں شروع ہو جاتیں جس سے اصل مقصد ہی ختم ہو جاتا۔

علی کے مختصر دور خلافت میں یہ تشویش پیدا ہوئی، کیونکہ علی ایک دن کے لیے بھی مسلمانوں پر فاسقین کی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے معاویہ کو اپنے خلاف اکسایا اور دو اہم صحابیوں کی بھی ناراضگی مول لی جس کے نتیجے میں وہ مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔

وجہ کچھ بھی ہو لیکن رسول کی رحلت کے وقت خلافت کا معاملہ حل نہیں ہو سکا تھا۔ شائد یہ بات بھی حضور کی سمجھداری دور اندیشی پر دلالت کرتی ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک جماعت کو دوسری جماعت کے خلاف کھڑا کر دیں۔ بلکہ اقتدار اور خلافت کی جانب کا سفر فطری انداز میں طے ہو، اور بقائے اصلح کے اصول کے تحت نتیجہ بر آمد ہو تا کہ کم از کم اس سے اسلام تو باقی رہے۔

عصری تاریخ میں پیش آنے والا ایک ایسا واقعہ ذہن میں آتا ہے، اور وہ لینن کا لکھا ہوا وہ خط ہے جو اُس نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو لکھا جسے لینن کے وصیت نامہ کا نام دیا گیا۔ لینن بستر مرگ پر لیٹا ہوا تھا، اور مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ مجبوراً خط لکھا اور اُس میں دو اہم ممبران یعنی سٹالن اور ٹراٹسکی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اُن کا نام تجویز کیا۔ اور اپنی نئ قائم کردہ ریاست کے لیے اُن دونوں کو ناگزیر قرار دیا۔ لیکن ساتھ ہی اپنی تشویش کا ذکر بھی کیا کہ مستقبل میں ان دونوں کے درمیان کس قسم کے اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں ۔ حتیٰ کہ اُن دونوں کی کمزوریوں اور خامیوں کو چھپانے کی بجائے اُن کی طرف بھی اشارہ کیا۔ لیکن جانشینی کے اس مشکل مسئلے پر لینن نے بھی خاموشی اختیار کی اور اس کا فیصلہ بقائے اصلح کے قانون کے حوالے کر دیا۔

اسلام سے قبل عرب اپنے قبیلے اور نسب پر فخر کرتے تھے، حتیٰ کہ دوسروں کے سامنے اپنے اجداد کی وجہ سے شیخیاں بگھارتے تھے۔ ڈینگیں مارتے وقت صرف فضائل یا خوبیوں کا ہی ذکر نہیں ہوتا تھا، بلکہ اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے طاقت، قتل وغارت حتیٰ کہ دوسروں کے ناموس کو پائمال کرنے کا ذکر بھی فخریہ انداز میں کیا جاتا تھا۔ اسلامی تعلیمات نے اس اصول کو رد کیا اور لوگوں کے لیے ایمان و تقویٰ کو وجہ امتیاز قرار دیا۔ لیکن بد قسمتی سے یہ 25 ہجری سے آگے نہ چل سکا۔

عثمان کے دور خلافت میں تقویٰ و زہد کی جگہ اقربا پروری نے لے لی۔ ابو ذر غفاری[174] اور عمار بن یاسر[175] خوار ہوئے اور حکم بن العاص اور معاویہ کو مسند اقتدار پر جگہ ملی۔

بنو امیّہ کی خلافت کے دوران اسلام کے تمام اچھے اصول کلی طور پر فراموش ہوئے، اور تفاخر کی بنیاد نسبت و قوم کا اصول رائج ہو گیا۔ یعنی وسیع تر سیاق و سباق میں اس بار عرب قومیت پر فخر کا آغاز ہوا، اور اپنی روحانی تشنگی کو مغلوب اقوام کی قیمت پر سیر اب کیا گیا۔ عرب کے خشک اور بنجر صحرا کے لوگوں نے دنیا کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا۔ اُن لوگوں پر غلبے نے جو ابھی کل تک اپنی شان، امارت اور دنیا پر حکومت کرنے کی وجہ سے مشہور تھے، عربوں کو غرور کی ایک قسم کی مستی اور نشہ بخشا۔ وہ اپنے آپ کو مغلوب اقوام سے برتر سمجھتے تھے اور اُنھیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اُنھیں مذہبی اور سماجی حقوق کے حوالے سے برابر نہیں سمجھتے تھے۔

174: ابوذر کا اصل نام جُندب بن جنادہ تھا۔ قبیلہ بنو غفار سے تعلق تھا۔ دور نبوی میں انتہائی سادگی سے زندگی گزاری۔ شیخین کے زمانہ میں بھی اپنی روش جاری رکھی۔ تیسرے خلیفہ کے زمانہ میں معاشی ناہمواری کے خلاف آواز اٹھائی، عثمان نے پہلے اُنھیں معاویہ کے پاس شام بھیجا، وہاں بھی ابوذر نے خاموشی اختیار نہ کی۔ ابوذر کو واپس مدینہ بلا لیا گیا۔ بعد میں عثمان نے ابوذر کو صحرائے ربذہ جلاوطن کر دیا، جہاں وہ کسمپرسی کے عالم میں مر گئے۔ حج کے سلسلے میں آتے ہوئے کچھ لوگ وہاں سے گزرے، اُنھوں نے ابوذر کو وہیں صحرا میں دفن کر دیا۔

175: ایک دن لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، کہ حضرت عثمان نے بیت المال کے جواہرات میں سے کچھ لے لیا ہے۔ اور اپنے گھر کے لیے کسی کا زیور بنا لیا ہے۔ لوگ اس بات پر ناراض ہوئے اور حضرت عثمان پر اعتراضات کیے۔ حضرت عثمان غصے میں آئے اور خطبہ دیتے ہوئے کہا: ہم اس خراج کے مال سے اپنی ضروریات کے مطابق ضرور لیں گے، کچھ لوگ ناراض ہوتے ہیں تو ہوں۔ اس پر حضرت علی نے کہا: آپ کو اس سے روکا جائے گا۔ حضرت عمار بن یاسر نے کہا: میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ سب سے پہلا ناراض میں ہوں۔ حضرت عثمان نے کہا: مجھ پر تیری یہ جرأت، لونڈی کے بچے، پکڑو اس کو۔ چنانچہ وہ پکڑے گئے، حضرت عثمان نے انہیں اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ (حضرت عثمان، ڈاکٹر طٰہٰ حسین)۔

قبیلہ بنو سلیم کے ایک ایرانی موالی نے اسی قبیلہ کی ایک عورت سے شادی کی۔ **محمد بن بشیر** مدینہ گیا، اور مدینہ کے والی ابراہیم بن ہشام بن مغیرہ سے شکایت کی۔ والی نے ایک اہلکار بھیجا کہ ایرانی شخص کو دو سو کوڑے مارے جائیں، اُس کے سر اور چہرے کے بال اور ابرو مونڈ دیے گئے اور عورت کو طلاق دلوائی گئی۔ **محمد بن بشیر** نے اس کی مناسبت سے ایک قصیدہ لکھا جو ابولفرج اصفہانی[176] کی مشہور کتاب ''الأغاني'' میں درج ہے۔ اُن میں سے چند اشعار دیئے جا رہے ہیں۔

قضيت بسنة وحكمت عدلاً ۔۔ ولم ترث الحكومة من بعيد

وفی الماءتین للمولی نکال ۔۔ وفی سلب الحواجب والحدود

اذا کافئتهم ببنات کسی ۔۔ فهل يجد الموالی من مزيد

فای الحق انصف للموالی ۔۔ من اصهار العبيد الی اعبيد

(تم نے روایت اور عدل کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ تمھیں حکومت کسی غیر سے ورثے میں نہیں ملی۔ اُس موالی کو دو سو کوڑوں، ابرو اور داڑھی مونڈھ کر ایک مثالی سزا دی۔ کیا کسریٰ کی بیٹیاں اُن کے لیے کافی نہیں جو یہ موالی مزید چاہتے ہیں۔ موالی کس چیز کے مستحق ہیں، ایک غلام کی شادی غلام سے)۔

176: ابوالفرج اصفہانی ایک مصنف اور ادیب تھے۔ عربی ادب میں وہ ابن درید، ابن الابناری اور محمد بن جریر الطبری کے شاگرد تھے۔ اُن کی مشہور کتاب ''كتاب الأغاني'' ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے ''مقاتل الطالبین''، ''الاماء الشواعر'' اور ''الدیارات'' نامی کتابیں لکھی ہیں۔

نمونے کے طور پر ابن قتیبہ [177] کی کتاب "عیون الأخبار" سے ایک عبرت انگیز قصہ بیان کرتے ہوئے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

ایک عرب قاضی کے پاس گیا اور کہا: میرا باپ مر گیا ہے اور اُس نے اپنی جائیداد دو بھائیوں اور ایک ہجین [178] کے درمیان تقسیم کی ہے، ہر ایک کا کتنا حصہ ہو گا؟۔ ہجین کے لفظ کا اطلاق اُن بیٹوں پر ہوتا تھا، جو ایک غیر عرب ماں (یا لونڈی) سے پیدا ہوئے ہوں، اُنھیں دوسرے بیٹوں کے مقابلے میں حقیر اور کمتر سمجھا جاتا تھا۔

قاضی نے جواب دیا: سیدھی بات ہے کہ تمام بھائیوں کو ایک تہائی ملے گا۔

عرب نے کہا: آپ کو شائد ہمارے مسئلے کی سمجھ نہیں آئی۔ ہم دو بھائی اور ایک ہجین ہے۔

قاضی نے کہا: ہر کسی کو برابر کا حصہ ملے گا۔

عرب سخت غصے میں کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہجین ہماری برابری کرے؟۔

قاضی نے کہا: خدا کا یہی حکم ہے۔

ہجری کی ابتدائی صدیوں کی تاریخ میں سیکڑوں ایسی کہانیاں دیکھی جا سکتی ہیں، جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ اسلام دوسری اقوام پر اقتدار حاصل کرنے اور اقتدار مسلط کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں جو احکامات اور تعلیمات درج ہیں، اُن پر عمل نہیں کیا گیا، اور زمانہ جاہلیت کا غرور اور بالا دست ہونے کا احساس اسلامی تاریخ میں مسلسل ظاہر ہوتا رہا۔ اور انسان کی فضیلت کا یہ معیار "انّ أکرمکُم

177: ابن قُتیبہ مروزی دینوری ایک عالم دین اور ادیب تھے۔ وہ ایرانی النسل تھے اور کوفہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا باپ مرو کا رہائشی تھا۔ انہوں نے دس جلدوں پر محیط "عیون الأخبار" لکھی۔

178: ہجین کا اصل معنی حرام زادہ یا کنیز کا بیٹا ہوتا ہے۔

عِندَاللہِ اَتقاکُم "(اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے) غیر عربوں کے سلسلے میں فراموش کر دیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ شعوبیہ[179] کا ظہور ہوا۔ اگر محمد بن عبد اللہ کے اسلام اور بعد میں ابو بکر و عمر و علی کی روش کی پیروی کی جاتی تو شعوبیہ ہر گز پیدا نہ ہوتے۔

179: شعوبیہ یا شعوبیان وہ گروہ تھا جو عربوں پر عجمیوں کی برتری کا داعی تھا۔ بنو امیہ کے دور میں عرب نسل کی برتری کی پالیسی بہت عام ہو گئی تھی۔ عربوں کے لیے خاص کام مخصوص کیے جاتے تھے اور دوسری اقوام کے لیے تحقیر اور اہانت معمول کی بات بن چکی تھی۔ شعوبیوں کی اکثریت ایرانیوں پر مشتمل تھی جو اس پالیسی کی مخالفت کرتے تھے۔ عباسی خلافت کے زمانے میں اُنھیں اپنے خیالات اور عقائد کو پھیلانے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے عربوں پر ایرانیوں کی فضیلت اور برتری کے متعلق کتابیں، رسائل اور نظمیں لکھنا شروع کیں اور اپنی نسل پر فخر اور عربوں کی تحقیر کا آغاز کر دیا۔ خصوصی طور پر انہوں نے دوسری سے چوتھی صدی ہجری تک اپنے افکار کی بہت شدت سے تبلیغ کی۔ متوکل کے ندماء میں سے "خریمی سغدی"، "متوکلی" جیسے ایرانی النسل ادیبوں اور شاعروں اور "بشار بن برد طخارستانی" نے کافی کتابیں لکھیں۔ معروف شعوبی مؤلف "سعید بن حمید بختکان"، جو ایرانی اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا، نے "انتصاف العجم من العرب" اور "فضل العجم علی العرب" کے عنوان سے دو کتابیں لکھیں۔ شعوبیوں نے بہت زیادہ کام کیا ہے جو عام کتب خانوں میں عام ملتا ہے۔

مال غنیمت

مغربی مفکرین کا ایک حصہ اسلام کو ایک مقامی واقعہ سمجھتا ہے اور اس کے بہت سارے احکامات کو ترقی یافتہ معاشروں کے لیے نامناسب خیال کرتا ہے۔ جیسے کہ اُن کا کہنا ہے: دن میں پانچ مرتبہ وضو کرنا، نماز پڑھنا اور ہر نماز کے لیے مسجد جانا، قمری مہینوں کو سال کا ماخذ قرار دینا اور ایک مہینہ روزے رکھنا، یعنی پورا دن، طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک ہر قسم کے اہم عمل سے اجتناب کرنا، جب کہ کُرّہ زمین کے اونچے عرض البلد کی وجہ سے بعض ممالک میں دن کا دورانیہ کبھی بیس گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ اور کبھی چار گھنٹوں کا، اور چند جگہوں پر سورج غروب ہی نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ رکھنے کی تلقین کرنے والے کو صرف حجاز، اور وہ بھی صرف ساتویں صدی کے حجاز کے ماحول کا ہی پتہ تھا اور وہ دنیا کی دیگر جگہوں سے بالکل بے خبر تھا۔

اسی طرح سود پر قرضہ دینے اور کٹوتی کی ممانعت اقتصادی نمو اور سرمایہ کاری کے لیے سازگار نہیں ہے۔ غلامی کی اجازت اور انسانوں سے جانوروں جیسا سلوک، وراثت میں مرد اور خواتین کے مابین عدم مساوات منطق کے خلاف ہے، حالانکہ عورتیں مردوں سے زیادہ وراثت کی حقدار ہیں، کیونکہ وہ معاشرے کے پیداواری عمل میں حصہ نہیں لیتیں اور دولت پیدا نہیں کرتیں۔ عورتوں کی گواہی کو مرد سے آدھا قرار دینا انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

چور کا ہاتھ کاٹنا اور دوسری بار چوری کی صورت میں ایک پاؤں کاٹنے سے اپاہج، غیر فعال اور بے کار لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جو معاشرے کے لیے سود مند نہیں ہے۔ تعدّدِ ازدواج، لونڈیوں کی لا

محدود تعداد اور شوہر والی عورتوں جو قیدی کے طور پر ہاتھ لگیں سے مباشرت کی اجازت[180]، زنا کے متعلق یہودی شریعت کے احکام کی تائید اور اُنھیں اختیار کرتے ہوئے سنگساری کا حکم دینا انسان کے بنیادی حقوق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایک شخص کو موت کے بعد اپنی املاک کے متعلق فیصلے سے روکنا اور اموال کی تقسیم کو ایک تہائی تک محدود رکھنا بنیادی طور ملکیت کے اصول بلکہ اسلامی شریعت کے اصول کے منافی ہے کہ جہاں فرمایا گیا ہے: "النّاس مسلطون علی اموالھم و انفسھم" (انسان کو اپنے لوگوں اور املاک پر حق ہوتا ہے)۔

اس قسم کے عیوب کی وجہ سے اُنھوں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایسا مذہب آفاقی اور دائمی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ مشاہدات سے ثبوت ملتا ہے کہ ان میں سے بیشتر احکامات جیسے زنا کی سزا سنگساری، چور کے ہاتھ کاٹنا یا آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان کے قصاص جیسے قوانین پر بہت سارے اسلامی ممالک میں عمل نہیں ہوتا[181]۔ مزید یہ کہ تمام اسلامی ممالک میں بنکوں نے سود کا لین دین شروع کر دیا ہے۔ تو اب مغربی مفکرین چبھتے ہوئے طنزیہ انداز میں حج کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ایک بُت خانے کو بیت اللہ کا نام دیا گیا ہے اور چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی کے بت پرستوں کی سیاہ پتھر کو چومنے کی رسم کو

180: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے دن مقام اوطاس کی طرف ایک لشکر روانہ کیا تو وہ لشکر اپنے دشمنوں سے ملے، ان سے جنگ کی، اور جنگ میں ان پر غالب رہے، اور اُنھیں قیدی عورتیں ہاتھ لگیں، تو ان کے شوہروں کے مشرک ہونے کی وجہ سے بعض صحابہ کرام نے ان سے جماع کرنے میں حرج جانا، تو اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں یہ آیت نازل فرمائی: "والمحصنات من النساء إلا ما ملكت أيمانكم" (اور (حرام کی گئیں) شوہر والی عورتیں مگر وہ جو تمھاری ملکیت میں آ جائیں: سورت النساء-24) تو وہ ان کے لیے حلال ہیں جب ان کی عدت ختم ہو جائے۔ (سنن ابی داود، کتاب النکاح)۔

181: یاد رہے کہ دشتی نے "23 سال" نامی اس کتاب کو ایرانی میں اسلامی حکومت بننے سے تقریباً دس سال پہلے لکھا تھا۔ ایرانی انقلاب کی کامیابی اور اللہ کی حکومت قائم ہونے کے نتیجے میں قصاص کے قانون کا پھر سے اجراء ہو گیا۔ دشتی اس امر کی پیش بینی نہیں کر سکے اور وہ نہیں جان پائے کہ جن عقائد کے خلاف اُنھوں نے قلم اٹھایا ہے، ایک دن وہ اُنھی عقائد کے پیروکاروں کے ہاتھوں گرفتار ہوں گے۔

"شعائر اللہ" کہا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ حج کے تمام مناسک شریعت کے منافی ہیں کہ جو شرک کی مخالف ہے اور اس بات کی دعوے دار ہے کہ لوگوں کو زمانہ جاہلیت کے تمام اوہام و خرافات سے نجات دلانا چاہتی ہے۔ وہ اسے ایک قسم کی نسل پرستی قرار دیتے ہیں اور اس بات کی مدعی ہیں کہ وہ مذہب دائمی و آفاقی ہو سکتا ہے جو انسانیت کی فلاح اور بھلائی کی طرف انسان کی راہنمائی کرے اور ہر قسم کے مُلکی، قومی اور نسلی تعصب سے اجتناب کرے۔

وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بہترین حل یہ ہوتا ہے کہ گہرے کھڈے کو پُر کیا جائے اور معاشرے میں جو فساد اور شر موجود ہے اُس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا جائے۔ ایک ایسی سرزمین جہاں قتل، راہزنی، دوسروں کے حقوق، مال اور ناموس کی پامالی رائج اور معمول کی بات تھی، وہاں اس قسم کے شدید عمل کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ قصاص، چور کے ہاتھ کاٹنے، زانی کو سنگسار کرنا جیسی سخت سزائیں ہی اس کا واحد علاج تھا۔ غلامی اُس دور کی تمام متمدن اقوام، اور اُن سے پہلے کی تمام اقوام میں خاص طور پر آشوریوں، کالدیوں اور رومیوں میں عام رہی ہے، لیکن اسلام میں بہت سے گناہوں کے کفارہ کے بدلے میں، غلام کو آزادی دی جاتی ہے۔

جیسا کہ پندرہویں باب "اسلام میں عورت" میں ذکر کیا گیا ہے کہ قبل اسلام کی عورت کی کوئی قدر یا حیثیت نہیں تھی، حتیٰ کہ وہ مرنے والے کے ترکے کے طور پر وارث کو منتقل ہوتی تھی۔ عورت کے متعلق اسلامی قوانین ایک طرح کا انقلاب اور ترقی پسندانہ تبدیلی ہے۔ یہ بات مناسب نہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں جاری ہونے والے احکامات اور قائدانہ طرز عمل کو انیسویں یا بیسویں صدی کے افکار اور معیار پر تولا جائے۔ مثلاً محمد سے یہ توقع کی جائے کہ غلامی کے سلسلے میں وہ ابراہیم لنکن جیسا کردار ادا کرتے۔

ان میں سے کئی اعتراضات کا جواب الٹے سوالیہ دلائل سے دیا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ فکر اور عقیدہ کی آزادی جیسے اہم ترین مسئلے کی بھی یوں توجیہ کی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں دوسری اقوام کو مغلوب کرنے کے بعد اسلام قبول کرنے یا جزیہ دینے کا انتخاب دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کے روشن خیالات کے مطابق یہ فعل مناسب یا عادلانہ نہیں ہے کہ لوگوں کو تلوار کے زور پر دین اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اور آج کے انسان کی سوچ اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ خداوند تعالیٰ جزیرہ نما عرب کے عربوں کو دوسرے لوگوں کو ہدایت دینے پر مأمور کرے۔ علاوہ ازیں اگر خدا کو شام، مصر اور ایران کے لوگوں کو مسلمان بنانے کی اس قدر خواہش تھی تو کیا یہ راستہ آسان نہیں تھا کہ اُنھیں "يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ" (جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے: فَاطِر۔8) والی آیت کے مطابق خود سیدھا راستہ دکھاتا۔ خود قرآن میں بھی اسی روش کو مطلوب اور پسندیدہ ٹھہرایا گیا ہے اور "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ" (جو ہلاک ہو دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیے دلیل سے جیے: الأنفال۔42) کے فقرے کے واضح معنی یہ ہیں کہ تلوار کی نوک سے لوگوں کو ہدایت نہیں دی جاسکتی:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین)۔

یہ قرآنی نصّ ہے اور اس کی شہادت کے طور پر قرآن سے اسی مفہوم و مطالب کی دسیوں آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ اور یہ بات ہمیں اس حیرت انگیز نتیجے کی طرف لے جاتی ہے کہ یہ اصول، ایمان لاؤ یا جزیہ ادا کرو کا اصول جزیرہ نما عرب کے باسیوں کے لیے اپنایا گیا تھا۔ یہ فتح خیبر اور خصوصی طور پر فتح مکّہ اور قریش کے ایمان لانے کے بعد کی بات ہے کہ حضور نے چاہا کہ جزیرہ نما عرب کو ایک سیاسی وحدت کی شکل دی جائے اور اسی وجہ سے ایک مستند حدیث کے مطابق فرمایا گیا تھا کہ جزیرہ نما عرب میں دو

مذاہب نہیں ہونے چاہیے[182]۔ فتح مکّہ کے بعد سورت التّوبَۃ کی آیت 28 نازل ہوتی ہے: "إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ"۔ جس میں فرمایا گیا ہے: "مشرک تو پلید ہیں تو اس سال کے بعد وہ خانہ کعبہ کا پاس نہ جانے پائیں"۔ اسی سورت کے مضمون سے جو چند اور نکات سامنے آتے ہیں، وہ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ حضور اسلام کے جھنڈے تلے عربوں کی واحد سیاسی وحدت تشکیل دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو قابو کرنے کے لیے سختی سے پیش آنے اور تشدد کے استعمال کا ذکر اسی سورت میں ملتا ہے:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ

(یہ بدّو کفر و نفاق کے معاملے میں بہت میں زیادہ سخت ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو احکام اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں ان سے واقف نہ ہوں)۔

سورت الشُّعَرَاء کی آیت 198: "وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَى بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ" (اور اگر ہم اسے کسی عجمی پر نازل کرتے)، میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ غیر عرب لوگوں نے قرآن اور اس کے مندرجات کو بہتر طور پر سمجھا اور اسے پہلے قبول کر لیا۔ مغربی مفکرین نے جو سب اعتراضات وارد کیے ہیں اُن میں سے دو موضوع ایسے ہیں جن کا تقریباً جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ایک یہ کہ عقلی طور یہ بات ناقابل فہم اور ناقابل تصدیق ہے کہ خدا نے حجاز کے عربوں کو تلوار تھما کر لوگوں کی تہذیب و تربیت پر مأمور کیا کہ وہ

182:: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر میں زندہ رہا تو انشاءاللہ جزیرہ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال باہر کر دوں گا"۔ (سنن ترمذی)۔ حضور کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا، لیکن عمر بن خطاب نے اپنے دور میں یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرہ عرب سے جلاوطن کر کے حضور کی اس خواہش کو پورا کیا۔

دنیا کو وحدانیت سکھائیں۔ چونکہ اس دعوے پر یقین کرنا مشکل ہے لہذا ہم دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں کہ اقتصادی عوامل کی وجہ سے وہ دنیا کو فتح کرنے نکلے۔

پہلے اعتراض کے جواب میں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ تلوار کے زور پر اسلام قبول کروانے کا طریقہ کار صرف عرب کے لیے مخصوص تھا اور جیسا کہ تاریخی واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طریقہ کار کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کہ اسلام اپنے پاؤں جما پاتا۔ لیکن دوسرے اعتراض کے بارے میں مثبت نقطہ نظر اور تاریخی واقعات کی کھوج سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مالِ غنیمت عربوں کو عرب کی حدود سے باہر کھینچ لے گیا۔

پچھلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضور کی وفات سے لے کر بعد کے تمام تاریخی واقعات ریاستی اقتدار اور حاکمیت کی خواہش کے نتیجے میں رونما ہوئے، اسی طرح دوسروں کی دولت حاصل کرنے کی خواہش نے عربوں کو دنیا فتح کرنے کی طرف راغب کیا۔ ایک خشک اور بنجر زمین پر ان متشدد لوگوں کا گزارہ بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ اُن کی سرحدوں کے اُس پار زرخیز اور سرسبز زمینیں، ضروریاتِ زندگی سے بھرے آباد شہر، مختلف نعمتیں اور آسائشیں موجود تھیں جو نظروں کو خیرہ کرتی تھیں۔ لیکن افسوس کہ یہ سرسبز آباد زمینیں طاقتور ایرانی اور رومی حکومتوں کی تھیں اور بے چارے مٹھی بھر، خالی ہاتھ اور بیابان میں رہنے والے ان لوگوں کے پاس اُنھیں حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن اسلام نے ان کے نفاق اور کوتاہ بینی کا خاتمہ کیا، اُن کی اندرونی جھگڑوں کو ختم کرکے اُنھیں اسلام کے جھنڈے تلے جمع کیا جس سے بکھرا ہوا ہجوم ایک طاقتور وحدت کی صورت میں سامنے آیا اور یوں ایک ناممکن ممکن میں تبدیل ہوگیا۔

یہ غریب لوگ جو خود سے کمزور ایک قبیلے پر حملہ کرتے اور اُن کے دو تین سو اونٹ چھین کر اپنے لالچ کی پیاس بجھاتے تھے۔ اب وہ ایک ایسی طاقتور وحدت بن چکے تھے جو بہت بڑے غنائم، زرخیز اور نعمتوں

سے معمور زمینوں، سفید اور خوبصورت عورتوں، مال و دولت اور بے شمار مویشیوں کو حاصل کر سکتے تھے

یہ لوگ جو چھوٹے سے فائدے کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے تھے اور اپنی مادی اور روحانی تشنگی کو سیر اب کرنے کے لیے موت سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ اب اسلام کے جھنڈے تلے وہ بے شمار غنائم کے حصول کی طرف گامزن تھے اور اس اقدام کے دوران وہ اگر قتل کریں تو جنت میں جائیں گے اور اگر قتل ہو جائیں تو بھی جنت میں جائیں گے، اس عقیدے نے اُن کی اہم روحانی پیاس کو سیر اب کیا۔ کیونکہ یہ فخر اور بالادستی کے بھوکے تھے۔ قبیلہ تمیم نے تغلب پر، یا اوس نے خزرج پر، یا ثقیف نے بنو غطفان پر حملے پر فخر کرنے کی بجائے اب ان سب نے مل کر شام اور عراق کی جانب رخ کر لیا تھا۔

بنیادی طور پر مال غنیمت اسلام کے جڑ پکڑنے اور مسلمانوں کی جمعیت کی مضبوطی کی اساس تھی۔ جیسا کہ بارہویں باب میں "مستحکم معیشت کا قیام" کے عنوان کے تحت ذکر ہو چکا ہے۔ سریہ نخلہ یعنی قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹنے نے ہجری کے دوسرے سال مسلمانوں کی حیثیت کو سنبھالا دیا۔ اس کے بعد بنو قینقاع کے مال پر قبضہ اور اس کے بعد بنو نضیر اور بنو قریظہ کی تمام جائیداد کے ہاتھ لگنے سے مسلمانوں کی معاشی صورت حال کو بہت استحکام ملا۔

سورت الفتح کی آیت 15 میں عربوں کی مال غنیمت کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس کی طرف یوں ذکر کیا گیا ہے:

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ

(جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو)۔

اور قرآن میں خدا نے بہت واضح انداز میں مسلمانوں سے "مَغَانِمَ كَثِيْرَةً" کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ یہ عرب کہتے ہیں: "چلو ہم بھی اُس کے پیچھے چلتے ہیں اور مال غنیمت حاصل کرتے ہیں"۔ اسی جنگ میں حضور نے بنو غطفان جو کہ خیبر کے یہودیوں کے حلیف تھے، کو مال غنیمت میں حصہ دینے کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ وہ یہودیوں کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں۔

ہجرت کے دس سالوں میں اس قسم کے درجنوں واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جن میں عربوں کا مال غنیمت کے حصول کے سلسلے میں جوش و خروش نظر آتا ہے۔ قبیلہ ہوازن کی شکست کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے وقت قریشی سرداروں اور انصار کے درمیان ناراضگی کا ذکر پچھلے ایک باب میں ہو چکا ہے۔ ایسے واقعات عربوں کی مال غنیمت کے سلسلے میں سوچوں اور عادات پر بخوبی روشنی ڈالتے ہیں اور ساتھ ہی حضور کی اپنی قوم کی سوچوں سے آگاہی اور ادراک کو واضح کرتے ہیں۔

ایک اہم نکتہ جس کا اضافہ کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ حضور کا اِن وسائل کا حصول، قافلوں کو لوٹنے کی اجازت دینے یا یہودیوں کا قلع قمع کرنے کا مقصد عربوں کی مال اندوزی کی حرص سے برتر تھا۔ وہ ایک سیاسی آدمی تھے اور اہل سیاست کے نزدیک اگر مقصد ناپسندیدہ نہ ہو تو اُس کے لیے تمام ذرائع استعمال کیے جاسکتے ہیں یعنی "الغایات تبرر المبادئ" (مطلوبہ نتائج کسی بھی فعل کا جواز ہیں)۔

وہ چاہتے تھے کہ اسلام اپنے پاؤں جمائے۔ وہ شرک اور نفاق کو ختم کر کے اسلام کے جھنڈے تلے ایک عرب ریاست کی تشکیل کے خواہاں تھے. چنانچہ اس ارفع و عظیم مقصد کے حصول کی خاطر تمام اقدامات جائز تھے۔ ان حملوں اور غزوات کے نتیجے میں اُن وقتوں میں ایک چھوٹی سے جماعت وجود میں آئی۔ ایسا ذاتی فوائد کے حصول کے لیے نہیں کیا گیا تھا۔

حضور خود بہت ہی قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے، حتیٰ کہ بنو قریظہ کے علاقے پر قبضہ کرنے کے دوران جب بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگا، تو آپ کی بیویوں نے زیادہ نفقہ دینے کا مطالبہ کر دیا۔ لیکن

حضور نے اُن کے مطالبے کو پورا نہ کیا، اور اُنھیں اُسی نفقے پر قناعت کرنے یا طلاق لینے میں انتخاب کرنے کا کہا۔

حضور کی پیروی میں بڑے صحابیوں نے بھی قناعت کی زندگی بسر کی اور دولت کے لالچ کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا۔ لیکن اُن کی رحلت کے بعد خصوصی طور پر جب اسلامی فتوحات جزیرہ نما عرب سے باہر تک جا پہنچیں اور مال غنیمت کی کثیر تعداد مدینہ پہنچی تو مال و دولت کے لالچ نے اکثریت پر غلبہ پا لیا۔

دوسرے خلیفہ عمر نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اُنھوں نے سرکردہ مہاجرین، انصار اور مدینہ میں وظیفہ کے دوسرے حقداروں کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم میں اعتدال اختیار کیا، اور اس میں عدل و انصاف سے کام لیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ حضور کی طرز زندگی سے دور ہوں اور وہ خود بھی ایک زاہدانہ زندگی گزارتے تھے۔

سالم نامی آزاد کردہ غلام کہتے ہیں: ”خلافت کے دوران عمر کے لباس یعنی ٹوپی و عمامہ سے جوتوں تک کی قیمت چودہ درہم سے زیادہ نہیں بڑھی تھی جب کہ خلافت سے پہلے وہ چالیس درہم کا لباس پہنا کرتے تھے“۔

اس ضمن میں اُن کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ طبری نے لکھا ہے: ”خلافت کے آخری ایام میں لوگ اُن سے تنگ آئے ہوئے تھے اور اس عدم اطمینان کی خبر اُن کے کانوں تک پہنچی۔ ایک روز وہ منبر پر گئے اور بہت سخت تقریر کی: ”میں نے اسلام کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے، اب یہ توانا ہو چکا ہے اور قریش اب یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا مال خدا کے بندوں کے منہ سے نکال لیں لیکن جب تک خطاب کا بیٹا زندہ ہے ایسا نہیں ہو گا۔ میں راستے میں کھڑا ہو کر قریش کو روکوں گا کہ وہ راہِ راست سے منحرف نہ ہوں اور جہنم کی آگ میں داخل نہ ہوں“۔

اسی باب میں طبری دوبارہ لکھتے ہیں: ”سر کردہ مہاجرین اُن کی اجازت کے بغیر مدینہ نہیں چھوڑ سکتے تھے اور اگر کسی کو اجازت دی تو وہ کم عرصے کے لیے حجاز کے سفر کی تھی۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ ان کے مفتوحہ علاقوں میں جانے سے اسلامی معاشرے کی وحدت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی سر کردہ صحابی چاہتا تھا کہ باہر کسی جنگ میں حصہ لے، تو عمر اُسے کہتے تھے کہ رسول کی ہمراہی میں جو جنگیں تم نے لڑی ہیں وہ تمھارے لیے کافی ہیں۔ تمھارے لیے بہتر ہے کہ نہ تم بیرونی دنیا دیکھو اور نہ دنیا تمھیں دیکھے“۔

روشن خیال مصری دانشور ڈاکٹر طٰہٰ حسین عمر کی سخت گیری کی وضاحت اور توضیح کرتے ہوئے ”الفتنة الکبریٰ“ میں لکھتے ہیں: ”عمر قریش کے سلسلے میں بہت فکر مند تھے کیونکہ وہ اپنے لوگوں کی ذہنیت سے واقف تھے کہ یہ انتہا درجے کے جاہ طلب اور مال کی حرص میں مبتلا ہیں۔ قریش اپنے آپ کو دوسرے قبائل سے اشرف سمجھتے تھے کیونکہ کعبہ کے امور کی تولیت اُن کے پاس تھی۔ خانہ کعبہ عرب قبائل کا قبلہ اور اُن کے مشہور بتوں کا مسکن تھا۔ در حقیقت قریش ان عربوں کے دینی عقائد اور عادات کو استعمال کرتے تھے اور یوں وہ امیر ترین قبیلہ بن چکے تھے۔ مکّہ کے اطراف میں امن و امان کی وجہ سے تجارت پروان چڑھی جس سے وہ اس میدان میں غالب حیثیت اختیار کر گئے۔

عمر جانتے تھے کہ کعبہ اُن کے قبیلے کے لیے وقار کا باعث اور مال کمانے کا ذریعہ ہے وگرنہ یہ بتوں پر عقیدہ نہ رکھتے۔ اور اب جب کہ یہ اسلام لا چکے ہیں تو اس لیے کہ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا، اور محمد کی فتح کے بعد یہ مسلمانوں کے ڈر سے مسلمان ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ یہ مسلمانوں کی جمعیت میں شامل ہونے کو بھی ایک قسم کا جواء اور مخاطرہ (Risk) سمجھتے تھے۔ لہٰذا ایسے منفعت جو اور موقع پرست لوگوں کو کھلا میدان نہیں دینا چاہیے تھے“۔

عمر کے قتل کے بعد کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنے روشن خیال اور صائب نظر انسان تھے۔ اگرچہ اُن کی وصیت کی وجہ سے عثمان نے اُن کے مقرر کردہ عمال کو اپنے عہدوں پر بحال رکھا اور ایک سال بعد اُن میں تبدیلیاں لائے۔ لیکن اپنی خلافت کے آغاز میں ہی اُنھوں نے مہاجرین اور انصار کے لیے بخشش اور نوازشوں کے سلسلے میں بیت المال کے دروازے کھول دیئے اور ان کے وظائف میں سو گنا اضافہ کر دیا۔

اگرچہ خلیفہ سوم نے اپنی ذاتی زندگی میں اپنے پیشرو دونوں خلفاء کی روش سے تجاوز نہیں کیا اور بیت المال سے اپنے لیے کسی خصوصی استفادہ کو روا نہیں رکھا۔ لیکن اُن کی ناجائز عنایات نے لوگوں کے سینوں میں حرص و طمع کی آگ کو بھڑکایا۔ اور زہد اور دنیاوی مال سے بے اعتنائی کے اصول کا خاتمہ کر دیا۔

عمر مقتدر ترین خلفاء میں سے ایک ہونے کے علاوہ پہلے خلیفہ تھے جنھیں مسلمانوں نے "امیر المؤمنین" کا خطاب دیا۔ اس کے باوجود جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ اُن کے عمامہ سے لے کر جوتوں تک کے لباس کی قیمت 14 درہم سے زیادہ نہیں تھی۔

علی بن ابو طالب کا زہد بھی بدیہی ہے جس پر دوست و دشمن کا اتفاق ہے۔ اُن کے لباس پر اس قدر پیوند لگے ہوتے تھے کہ اُن پیوندوں کو دیکھ کر خود حضور شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے بھائی عقیل جو قرض کی ادائیگی کے لیے بیت المال سے مالی امداد کا تقاضا کر رہے تھے، کو اس غصے اور درشتی سے جواب دیا کہ وہ مجبور ہو کر اُن کے دشمن معاویہ بن ابوسفیان سے جا کر مل گئے۔ اور یہ عربوں کی مال کی حرص اور لالچ کی ایک اور مثال ہے۔

سعد بن ابو وقاص جو بزرگ ترین صحابہ میں سے ایک، عشرہ مبشرہ میں سے ایک، جن کا شمار اسلام لانے والے اوّلین لوگوں میں ہوتا ہے، وہ اُن چھ لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں عمر بن خطاب نے خلافت کا

تعین کرنے والی شوریٰ میں جگہ دی تھی، چنانچہ فطری طور پر وہ خلافت کے امیدوار تھے۔ انہیں فارس کا جنگجو بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ فاتح عراق تھے۔ عمر کے دور خلافت میں وہ کوفہ اور مدائن کے حاکم رہے۔ تاہم جب اُنھوں نے 55 ہجری میں مدینہ میں اپنے عقیق نامی محل میں وفات پائی تو اُنھوں نے اپنے پیچھے دو سے تین لاکھ درہم کا ترکہ چھوڑا۔

اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ابن سعد اُسی بزرگ صحابی کے بیٹے تھے جو 61 ہجری میں عبید اللہ بن زیادہ کی جگہ رے کے حاکم مقرر ہوئے۔ لیکن ابن زیادہ نے انہیں پابند کیا کہ وہ اُس لشکر کی قیادت کریں گے جسے حسین بن علی کا راستہ روکنا ہو گا اور اُنھیں یزید بن معاویہ کی بیعت پر مجبور کرنا ہو گا وگرنہ اُن سے جنگ کرنا ہو گی۔ ابن سعد شروع میں اس مہم کو قبول کرنے سے گریزاں تھے اور رات کو اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے۔ اور ہر کسی نے اُنھیں اس کو قبول کرنے سے روکا اور کہا: سعد بن ابو وقاص جیسے معتبر صحابی کے بیٹے کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ نواسہء رسول کے ساتھ لڑائی کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن چونکہ ابن زیادہ اس مسئلے پر بہت سنجیدہ تھا اور اُس نے حتمی طور پر ابن سعد سے کہا کہ وہ اُسے حسین بن علی سے جنگ کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔ اُنھیں رے کی حکومت کی امید میں مجبوراً یہ قبول کرنا پڑا۔ اور جب اُن کا سامنا حسین بن علی سے ہوا تو اُنھوں نے خود کو صلح جوئی اور نصیحتوں تک محدود رکھا اور تین روز تک کوشش کی کہ حسین بن علی یزید کی خلافت کو تسلیم کرتے ہوئے بیعت کر لیں۔ اور جب یہ مذاکرات طوالت اختیار کر گئے اور ابن زیادہ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اسلامی حمیت اور شرافت ابن سعد کے مزاج پر غلبہ حاصل نہ کر لے۔ اور وہ حسین بن علی سے نہ مل جائیں تو اُس نے شمر ذی الجوشن کو حکم دیا۔ کہ اگر حسین سے جنگ کرنے میں ابن سعد تساہل سے کام لے تو وہ اُسے لشکر کی سالاری سے برطرف کر کے خود لشکر کی سالاری سنبھال لے۔

ابن سعد نے جب یہ دیکھا تو اپنے باپ کی اسلامی خدمات کو فراموش کر دیا، اور رسول کے خاندان کے احترام کو ایک طرف پھینک دیا۔ اور نواسہ ءرسول کی طرف پہلا تیر پھینکا، اور ہر قسم کے دینی و اخلاقی اصول اور حق و باطل کے فرق پر رے کی حکومت کو ترجیح دی۔

طلحہ بن عبید اللہ ایک اور بزرگ صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے۔ اسی لیے خلیفہ کا فیصلہ کرنے کے لیے عمر کی وصیت کے مطابق جب شوریٰ تشکیل ہوئی تو فطری طور طلحہ بھی خلافت کے امیدوار تھے۔ عمر کی موت کے وقت طلحہ مدینہ میں موجود نہیں تھے چنانچہ اُن کی غیر موجودگی میں شوریٰ تشکیل ہوئی اور خلیفہ کا انتخاب بھی اُن کی رائے کے بغیر ہوا۔ جب وہ مدینہ واپس آئے تو اُنھوں نے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عثمان کی بیعت نہیں کی۔ عثمان خود اُن کے گھر گئے اور کہا کہ اگر تم خلافت چاہتے ہو تو میں خلافت چھوڑنے کو تیار ہوں۔ طلحہ نے اپنا ارادہ بدل لیا اور عثمان کی بیعت کر لی۔ اس کے بدلے عثمان نے اُنھیں بیت المال سے پچاس ہزار درہم کا قرضہ دیا لیکن بعد میں اس رقم کو واپس نہیں لیا گیا اور اسے بزرگی اور بیعت کرنے کے معاوضے میں شمار کر لیا گیا۔

اس کے بعد طلحہ عثمان کے قریبی ترین اور مخلص دوستوں میں سے ایک ہو گئے۔ حد یہ کہ اُن کے درمیان ایک بیع اور شرائی (خرید و فروخت) کا قول ہوا ، جس کے مطابق اگر طلحہ کی عراق میں کوئی جائیداد یا سرمایہ ہو اور طلحہ اُسے مصر یا حجاز منتقل کرنا چاہتے ہوں تو عثمان ایسا کر دیتے تھے۔ اور اگر وہ اپنی املاک کو خلافت اسلامی کے کسی علاقے میں تبدیل کرنا چاہتے تھے تو عثمان ایک دم سے ایسا کر دیتے تھے۔ جب عثمان کی خلافت کے خلاف آواز بلند ہوئی تو یہی طلحہ تھے جنھوں نے اُن کا ساتھ دیا، لیکن جوں ہی عثمان کی مخالفت نے زور پکڑا تو یہ وہی طلحہ تھے جنھوں نے عثمان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور عبرت انگیز بات یہ ہے کہ جب عثمان کے گھر کا محاصرہ ہوا تو وہ بھی باغیوں کے ہمراہ اور ہمنوا تھے۔ شائد اسی وجہ سے جیسا کہ میں نے کہیں پڑھا ہے، جنگ جمل میں مروان بن حکم جو خود بھی علی کے دشمنوں میں

سے تھا، کے ہاتھوں طلحہ قتل ہوئے۔ قتل کے بعد مروان نے کہا۔ میں عثمان کے خون کا اب کسی سے مطالبہ نہیں کرتا۔

اگرچہ قبول اسلام سے پہلے طلحہ امیر نہیں تھے اور عمر بن خطاب کی خلافت کے آخر میں بھی وہ متوسط الحال تھے۔ موت کے وقت اُن کے ترکہ کا تخمینہ تین کروڑ درہم لگایا جاتا ہے۔ جن میں دو کروڑ بیس لاکھ درہم، دو لاکھ دینار نقد اور باقی غیر منقولہ جائیداد اور مویشی تھے۔ ایک اور روایت میں اُن کے ہاں چمڑے کے 100 تھیلے بر آمد ہوئے اور ہر ایک میں تین قنطار[183] خالص سونا تھا۔

زبیر بن العوام بھی معزز صحابی، عشرہ مبشرہ میں سے ایک، حضور کے پھوپھی زاد بھائی اور دوسرے حوالوں سے بھی حضور سے منسوب تھے۔ بہت زیادہ جنگوں اور غزوات میں شرکت کی اور حضور انہیں اپنا حواری کہتے تھے۔ وہ بھی اُن چھ لوگوں میں سے تھے جنہیں عمر بن خطاب نے خلافت کے لیے نامزد کیا اور شوریٰ کا رکن متعین کیا۔ خلیفہ سوم نے اُنھیں بھی بیت المال سے چھ لاکھ درہم دیئے۔ وہ خود نہیں جانتے تھے کہ اتنی بڑی رقم کو لے کر وہ اس کا کیا کریں گے۔ اُن کے بعض دوستوں نے اُن کی راہنمائی کی کہ اس رقم کو وہ مختلف شہروں میں گھر اور جائیداد خرید کر صرف کریں۔ چنانچہ مرتے وقت اُن کے فسطاط، بصرہ اور کوفہ میں کئی گھر اور بڑی جائیدادیں تھیں۔ مدینہ میں بھی اُن کے گیارہ گھر تھے جن میں کرایہ دار رہتے تھے، اور تخمینے کے مطابق انہوں نے تین کروڑ باون لاکھ سے پانچ کروڑ بیس لاکھ کی جائیداد چھوڑی۔ طبقات ابن سعد[184] میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ زبیر یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی اپنا سرمایہ اُن کے پاس بطور امانت رکھے۔ کیونکہ اپنے فرط زہد کی وجہ سے وہ ڈرتے تھے کہ کسی

183: ایک قنطار سو رطل کا ہوتا ہے۔

184: طبقات ابن سعد کے مؤلف محمد بن سعد البصری ہیں۔ وہ مشہور مسلمان مورخ محمد بن عمر واقدی کے شاگرد تھے۔ محمد بن سعد کا انتقال 823ء میں ہوا

حادثے کی وجہ سے وہ مال ضائع ہو جائے، جس سے کسی انسان کے ساتھ زیادتی ہو جائے۔ اور اگر کوئی اصرار کرے تو وہ اُن کا مال بطور قرض لیتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اُس سرمائے کو اپنے مال کے طور استعمال کر کے منافع حاصل کر سکتے تھے۔ اور اُن کی موت کے بعد اُن کے ورثاء قرض کی رقم واپس کرنا تھی۔ اُنھوں نے اپنی موت کے وقت دو لاکھ درہم کا قرض چھوڑا جو اُن کے بیٹوں نے چکایا۔

عبد الرحمٰن بن عوف بھی عشرہ مبشرہ اور خلیفہ کے تعین کرنے والی عمر کی شوریٰ کے اراکین میں سے ایک تھے، حضور کی لطف و عنایت سے بہرہ مند ہونے کے علاوہ ابو بکر و عمر کے بھی معتمد تھے۔ پیشے کے لحاظ سے تاجر اور کامیاب انسان تھے۔ وہ نہ صرف بے بضاعت نہیں تھے بلکہ بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے جو دولت چھوڑی، وہ مدینہ کے بازار میں خرید و فروخت سے تناسب نہیں رکھتی تھی۔ اُن کی موت کے وقت اُن کی چار بیویاں تھیں اور ہر بیوی کو اسّی ہزار سے ایک لاکھ دینار ورثہ میں ملے، اور پچاس ہزار طلائی دینار، ایک ہزار اونٹ اور تین ہزار بکریاں جنھیں اُنھوں نے خدا کی راہ میں صدقہ کرنے کی وصیت کی۔[185]

185: صحابہ نے جائیداد اور مال اچھا خاصا پیدا کر لیا تھا۔ خود حضرت عثمان کے خازن کے پاس جس دن آپ کی شہادت کا اندوہناک واقعہ پیش آیا تھا، ڈیڑھ لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم تھے۔ اور وادی قریٰ اور جنین وغیرہ میں آپ کی جائیداد دو لاکھ دینار کے لگ بھگ تھی۔ اور آپ نے بہت سے اونٹ اور گھوڑے چھوڑے تھے۔ حضرت زبیر کے ایک ترکہ کی قیمت پچاس لاکھ دینار تھی اور آپ نے ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار لونڈیاں چھوڑی تھیں۔ حضرت طلحہ کی عراق سے روزانہ آمدنی ایک ہزار دینار تھی اور سراۃ کے نواح میں اس سے بھی زیادہ تھی اور آپ ایک ہزار اونٹوں اور دس ہزار بکریوں کے مالک تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے ترکہ کا چوتھا حصہ چوراسی ہزار تک پہنچا تھا اور حضرت زید بن ثابت نے سونے اور چاندی کے ڈلے چھوڑے تھے جو کلہاڑیوں سے کاٹے جاتے تھے اور ایک لاکھ کی جائیداد بھی چھوڑی تھی۔ حضرت زبیر نے اپنی عمارتیں بصرہ، مصر، کوفہ اور اسکندریہ میں بنوا رکھی تھیں۔ اسی طرح حضرت طلحہ نے اپنا گھر کوفہ میں بنوا لیا تھا اور مدینہ میں بھی ایک پرانا گھر تھا جسے تڑوا کر از سر نو چونے، اینٹوں اور ساگوان کی لکڑی سے بنوا لیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے اپنا گھر نہایت بلند و وسیع سنگِ سرخ سے بنوایا تھا جس کے اوپر کنگرے تھے۔ حضرت مقدار نے اپنا گھر مدینے میں تعمیر

تیسرے خلیفہ کے زمانے میں حکیم بن حزام جیسے لوگ کم یاب ہو گئے تھے جنھوں نے بیت المال سے ایک بھی دینار قبول نہ کیا اور جب مہاجرین اور انصار میں وظیفے تقسیم ہو رہے تھے تو اُنھوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ ابو ذر غفاری نے معاویہ کے سامنے یہ آیت شریف پڑھی:

اَلَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّھَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَھَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَبَشِّرۡھُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ۔ (جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کے رستے میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو اس دن عذاب الیم کی خبر سُنا دو: التّوبَۃ۔ 9)۔

اُن کا ماننا تھا کہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ چاندی اور سونے کو ذخیرہ نہ کریں۔ بلکہ اُسے خدا کی راہ میں خرچ کریں۔ اُنھیں ایک غیر مطلوب اور شر انگیز انسان قرار دیا گیا اور عثمان کی اجازت سے معاویہ نے اُنھیں شام سے مدینہ بھیج دیا۔ اور یہی کلمہ حق اُنھوں نے جب خلیفہ سوم کے سامنے ادا کیا تو انہیں کوڑوں سے پیٹا گیا اور بعد میں ایک ویران صحرا میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں رسول کے اس زاہد و مومن صحابی نے جان آفرین کے سپرد کی۔

چند محدود لوگوں کے علاوہ ہر کوئی دولت کی خاطر جدوجہد میں مصروف تھا، اور دولت کا لالچ ہر کسی کے مزاج پر غالب آ گیا تھا۔ حتیٰ کہ "جناب" نامی ایک بے حسب و نسب اور بیکار آدمی جو مکّہ میں سامان ڈھونے اور حمالی[186] کا کام کیا کرتا تھا۔ جب وہ کوفہ میں مرا تو اُس کی صندوقچی میں سے چالیس ہزار درہم

کرایا اور اس کے اندر اور باہر چونے کا پلاستر کرایا۔ اسی طرح علی بن منبہ نے پچاس ہزار اشرفیاں چھوڑیں اور جائیداد وغیرہ چھوڑی جو تین لاکھ درہم کے لگ بھگ تھی۔ (مقدمہ: ابن خلدون)۔

186: قُلی، باربرداری کا کام کرنے والا

نکلے۔ جنگجوؤں کو مال غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا، اور امن کے وقتوں میں اُنھیں ملنے والے وظائف نے اُنھیں امیر بنا دیا تھا۔

عبد اللہ بن سعد بن السرح کی قیادت میں جب شمالی افریقہ (تیونس) کے خلاف لشکر کشی ہوئی تو ہر سوار کو تین ہزار مثقال (ایک مثقال = 4.7 گرام) اور ہر پیادہ جنگجو کو ایک ہزار مثقال خالص سونا دیا گیا۔۔

اس قسم کی سینکڑوں مثالیں اور شہادتیں ہیں جو اسلام کی معتبر کتابوں میں درج کی گئی ہیں۔ جو اس بات کا واضح اظہار کرتی ہیں کہ عرب لوگ لوٹ مار، زرعی املاک پر قبضہ کرنے اور کنیزوں کے حصول میں کس قدر مصروف تھے، اور اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے کسی قسم کی بہادری حتیٰ کہ شقادت اور بے رحمی سے بھی گریز نہیں کیا[187]۔

187: عرب ایک وحشی قوم ہے جن میں وحشت کے علّت و اسباب محکم ہیں، جو ان کی گھٹی میں پڑے ہیں اور ان کی طبیعت ثانیہ بن چکے ہیں اور اِنھیں بہت پیارے ہیں، کیونکہ اِنھیں آزادی میسر ہے کہ ان کی گردن میں کسی حکومت کا پٹہ نہیں۔ اور یہ عادتیں معاشرہ کے خلاف اور معاشرتی زندگی کے متضاد ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی عادت ہے کہ یہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتے، ہر طرف لوٹ مار کرتے ہیں جو امن و سلامتی کے موجب تمدن کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر اُنھیں پتھر اس لیے چاہئیں کہ اُس پر دیگیں رکھ کر پکائیں۔ اس ضرورت کو پوری کرنے کے لیے وہ عمارت ڈھا دیتے ہیں، مکان منہدم کر دیتے ہیں اور اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے پتھر اکھاڑ کر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح خیمے گاڑنے کے لیے اُنھیں لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے جہاں سے موقع پاتے ہیں چھتیں اکھاڑ کر لے جاتے ہیں۔ لہٰذا اِن کا وجود تعمیر کے منافی ہے اور تخریب پسند ہے اور تعمیر ہی معاشرے اور آبادی کی بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ لوٹ مار ان کا ذریعہ معاش ہے اور اِن کا زرق اِن کے نیزوں کے نیچے ہے اور لوٹنے کے سلسلے میں ان کے ہاں کوئی حد مقرر نہیں ہے کہ اس پر رُک جائیں، بلکہ جب بھی ان کی نگاہ کسی کے مال، برتنے کی چیز یا کسی سامان پر پڑتی ہے اُسے لوٹ لیتے ہیں۔ جب ان کے غلبہ و اقتدار کا مدار لوٹ کھسوٹ پر ہے تو اگر اِن کے ہاتھوں حکومت آ جائے تو لوگوں کا مال اور جانیں اِن سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ لامحالہ آبادی اُجڑے گی اور معاشرہ خراب ہو گا۔ نیز یہ صنعت کاروں سے جبریہ کام کراتے ہیں اور ان کی نگاہ میں اُن کے کام کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس لیے صنعت کاروں کو اُن کی محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا اور صنعت و حرفت ہی معاش کا اصلی ذریعہ ہے۔ پس جب لوگوں کے کام اور محنت کی بے قدری ہوتی ہے اور صنعت و حرفت والوں کو ناحق بیگار کرنا پڑتی ہے تو اہل حرفہ کی توجہ اس طرف سے اٹھ جاتی ہے اور ہاتھ رک جاتے ہیں، امن و

شریعت اسلامی کے نفاذ کی آڑ میں عرب طاقت، جائیداد اور برتری کے لیے کوشاں تھے اور اُنھوں نے اس عظیم اصول ”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ “ (خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے: الحُجرَات۔ 13) کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ قدرتی طور پر اس قسم کی روش اپنا ردعمل پیدا کیے بغیر نہیں رہتی۔ دوسری اقوام خصوصی پر ایرانیوں نے اس استبداد کے آگے سر نہیں جھکایا۔ انہوں نے عربوں کی نسلی برتری، لالچ اور دولت اندوزی کی بجائے اسلام کے مقدس اور انسانی اصولوں کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ انہیں شعوبیہ کہا گیا اور یہاں تک کہ ان کو زندقہ کے برابر سمجھا گیا۔

مجھے یاد ہے کہ چند سال پہلے مصر میں ”الزندقہ و شعوبیہ“ کے عنوان کے کتاب لکھی اور شائع کی گئی۔ بیسیوں صدی میں قاہرہ یونیورسٹی کے ایک استاد نے اس کا مقدمہ لکھا اور اس کتاب میں کوشش کی گئی کہ ایرانیوں کے اپنی نسل و قوم کی طرف رجحان کو ایک قسم کا زندقہ اور اسلام کے اصولوں سے انحراف کے طور پر بیان کیا جائے۔ جب کہ عربوں کا حضور کی بنیادی تعلیمات سے ہٹ جانے کا کوئی تذکرہ نہیں

سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور آبادی اجڑنے لگتی ہے۔۔۔ مثلاً یمن ان کی قرار گاہ بنا اور بربادی کے گھاٹ اُترا، سوائے چند شہروں کے عراق کا بھی یہی حال ہے کہ پارسیوں کے زمانے میں کیسا سرسبز تھا اب کیسا اُجڑا ہے، ادھر شام بھی ویران ہے، یہی حال مغربی افریقہ کا ہے؛ تمام ملک ویرانی کی بھینٹ چڑھا حالاں کہ بنو بلال بنو سلیمہ کی آمد سے پہلے سارا علاقہ آبادی سے بھرپور تھا، شہروں اور قریوں میں مٹی ہوئی آبادی کے آثار و علامات اور اجڑے گھروں کے کھنڈر اب بھی زبان حال سے اگلی آبادی کا پتہ دے رہے ہیں۔ عرب سیاستِ ملکی میں تمام اقوام سے دور تر اور ناآشنا ہیں، ان کی پوری ہمت اس بات پر جمی ہے کہ کسی صورت سے لوگوں کا مال لوٹ کھسوٹ کر لے جائیں۔ جب وہ اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں تو اہل ملک سے نظریں پھیر لیتے ہیں، نہ اُن کی مصلحتوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، نہ اُن کو ارتکاب فساد سے روکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں پر جرمانے کرتے ہیں صرف اس لالچ سے کہ کسی راستے ان کو فائدہ پہنچے، بکثرت مال و دولت جمع ہو سکے۔ ان کے حاکم رعایا کو خوب نچوڑتے ہیں، رعیت بربادی کا نشانہ بنتی ہے اور آبادی گھٹنے لگتی ہے۔ نقل ہے کہ ایک اعرابی حجاز سے عبدالملک کے پاس آیا، عبدالملک نے اعرابی سے حجاج بن یوسف کا حال پوچھا، اُس نے گویا حجاج بن یوسف کی تعریف کرتے اور حسن انتظام کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں اُس کو تنہا ظلم کرتے ہوئے چھوڑ آیا ہوں، گویا عرب میں اگر صرف حاکم ہی ظلم و ستم کرتا ہو تو یہ اُس کے حسن انتظام کی دلیل ہے۔ (مقدمہ: ابن خلدون)۔

ہے۔ جنھوں نے فرمایا تھا: ”اِنَّ اللہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ“ (بے شک اللہ انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا حکم کرتا ہے: النّحل۔90)۔

وہ اُنھیں امیر المؤمنین کہتے تھے، جو گردن تک فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے تھے، اور شراب کے حوضوں میں غسل کیا کرتے تھے[188]۔ انسانیت کے اصولوں اور پیغمبر کی انسانوں کو دی گئی راست بازی اور تقویٰ کی تعلیمات کے برعکس، بنو امیہ عربوں کا دوسری مسلمان اقوام پر اور عرب قبائل میں بنو امیہ کا دوسرے قبائل پر غلبہ چاہتے تھے۔

188: آج کل ارباب اصلاح یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہیں کہ تمام قدیم اقوام نے عورت کو ذلت اور پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ مسلمانوں نے اُسے اُس گڑھے سے نکال کر عزت و توقیر کے مقام پر فائز کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے اگرچہ بے حد تلخ اور ناگوار ہے کہ جہاں کہیں ہماری حکومتیں قائم ہوئیں اُس ملک میں بردہ فروشی کا کاروبار چمک اٹھا۔ بغداد، سامرہ، دمشق و حلب، قاہرہ اور قرطبہ جہاں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے مرکز تھے وہاں بردہ فروشی کے لیے بھی رسوائے زمانہ تھے۔ ان کے بازاروں میں کنیزیں بھیڑ بکریوں کی طرح بکتی تھیں۔ گاہک اُنھیں ٹٹول ٹٹول کر خریدتے جیسے قصاب بھیڑوں کو خریدتا ہے۔ خلفاء اور سلاطین کے محلات میں سینکڑوں کنیزیں موجود تھیں جو اطراف و جوانب کے ملکوں سے درآمد کی جاتی تھیں۔ یہ کنیزیں اپنے آقاؤں کی ہوا و ہوس کی تسکین بھی کرتی تھیں اور مجالس ناؤنوش میں ساقی گری اور ارباب نشاط کے فرائض بھی ادا کرتی تھیں۔ بنو امیہ کے عہد میں مکہ، مدینہ اور طائف میں موسیقی اور رقص سیکھنے کے لیے بڑی درس گاہیں قائم ہو گئیں جہاں بردہ فروش کنیزوں کو تعلیم دلوا کر گراں قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔ ترکستان کے مفتوحہ علاقوں سے ہر سال ہزاروں حسین اور نوخیز لڑکیاں بطور خراج بغداد بھیجی جاتی تھیں۔ الحمرا میں آج بھی دالانِ بکر موجود ہے جس میں عیسائی سلاطین کی طرف سے خراج میں بھیجی ہوئی ایک سو کنواری لڑکیاں ہر سال رکھی جاتی تھیں۔ ان حالات کے پیش نظر یہ معلوم کر کے چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ 37 خلفائے عباس میں صرف دو خلیفہ ایسے تھے جو کنیزوں کے بطن سے نہیں تھے۔ یعنی سفاح اور امین الرشید۔ باقی سب کنیز زادے تھے۔ عرب بردہ فروش بربر اور حبش کے علاقوں پر حملہ کر کے ہر سال ہزاروں عورتیں جبراً اٹھا لاتے تھے اور اُنھیں مختلف شہروں میں بیچتے تھے۔ 19 ویں صدی تک تمام مسلم ممالک میں یہ سلسلہ جاری تھی تا آنکہ اہل مغرب نے بردہ فروشی کو خلاف قانون قرار دے کر اس کا خاتمہ کیا۔ اب دنیا بھر کے ممالک میں بردہ فروشی کو جرم سمجھا جاتا ہے۔ (اقبال کا علم الکلام۔ سید علی عباس جلالپوری)۔

وہ جو امیر المؤمنین کہلاتے تھے، علی بن ابو طالب جو زاہد، متقی، عالم اور رسول اللہ کی صحابی تھے، کے خلاف منابر پر کھڑے ہو کر نامناسب الفاظ استعمال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ عباسی خلیفہ المتوکل یعنی عباس بن عبد المطلب کی اولاد نے اپنے دربار میں علی بن ابو طالب کے بھیس میں ایک مسخرہ رکھا ہوا تھا، جو ناچنے کے علاوہ اُن کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ اور حسین بن علی کی قبر پر ہل چلایا اور وہاں پانی چھوڑ دیا، تاکہ پیغمبر کی دلیر ترین اولاد کے آثار کو مٹا دے۔

ایرانی واضح سوچ اور جذبے سے اپنی تشخیص پر ثابت قدم رہے اور انہوں نے فاسقوں، اسراف کے مرتکب اور پیغمبر کی تعلیمات سے منحرف لوگوں کو امیر المؤمنین کے لقب کا مستحق نہیں گردانا۔

خلاصہ

اسلام کا ظہور، ترقی، پھیلاؤ اور غلبہ تاریخ کے انوکھے واقعات میں سے ایک ہے۔ تاریخی واقعات کی علّت و معلول کو سمجھنے کے لیے دقیق و جامع اور ہمہ جہت جانچ پڑتال کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ خفیہ اور آشکار پہلوؤں سے واقفیت ہو سکے اور سبب یا اسباب اور نتائج کے باہمی تعلق کو واضح کیا جا سکے۔

بہت زیادہ منابع اور دستاویزات مہیا ہونے کی وجہ سے روشن خیال محققین کے لیے تاریخ اسلام کے متعلق اس قسم کی بحث کو انجام دینا چنداں مشکل نہیں ہے بشرطیکہ اُنھیں اجتہاد میں ملکہ حاصل ہو اور استخراج سے کافی دلچسپی ہو۔ اور اس کے علاوہ اُن کا دامن تعصب اور غرض سے پاک ہو۔ اس قسم کی تحقیق کے لیے ضمیر کی تختی کو صاف ہونا چاہیے اور اُس میں کسی قسم کے مذہبی عقائد اور والدین کی ہدایات کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے۔ اس مختصر سی کتاب میں کوئی اہم اور قابل ذکر تحقیق پیش نہیں کی گئی، زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن تئیس سالوں پر محیط تمام واقعات کی مختصر سی منظر کشی کی کوشش کی گئی ہے۔ جن کا خلاصہ درج ذیل عبارت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

1: ایک یتیم بچہ جسے چھ سال کی عمر میں اُس کے اپنے چھوڑ گئے۔ باپ کی دیکھ بھال اور ماں کی محبت سے محروم اپنے ایک رشتہ دار کے گھر میں رہا۔ اُن نعمتوں اور وقار سے محروم رہا جو اُس کے ہم عمروں کو نصیب تھیں۔ پورا دن مکّہ کے بنجر صحرا میں اونٹوں کو چرانے میں اُس کی زندگی گزر رہی تھی۔ اُس کی روح حسّاس اور ذہن روشن تھا اور اُس کا مزاج تخیلات کی طرف مائل تھا۔ صحرا میں پانچ چھ سال تنہائی کی زندگی نے اُس کے اندر خواب و بصیرت کی پرورش کی۔ محرومی اور دوسروں کے احساس برتری نے اُس کے اندر پیچیدگی کو جنم دیا جس نے اُسے راستہ سجھایا۔ پہلے وہ اپنے ہم عمروں اور رشتہ داروں کی طرف

متوجہ ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے امیر لوگوں کے پاس جاتا ہے اور وہیں سے وہ اُن کی امارت کے سبب دریافت کرتا ہے۔ کہ اُن کی امارت کی وجہ کعبہ کی تولیت تھی جو عربوں کے مشہور بتوں کا مسکن تھا۔

اپنی اس طرزِ فکر میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اہلِ کتاب اور مکّہ میں فہم و ادراک کے مالک جو لوگ بھی موجود تھے، وہ بے جان بُتوں کی پرستش کو خرافات سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں کا وجود اُس کے لیے ایک ساتھی کی مانند تھا جس سے اُسے اپنے ضمیر کے اندر چھپے ہوئے سوالوں کا جواب ملا۔

مختلف سالوں میں شام کی جانب کیے گئے سفروں نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک دنیا کھول دی تھی۔ کہ اُس کی اپنی قوم کے لوگوں کی زندگیاں اور عقائد وہاں کے مقابلے میں کتنے حقیر اور کمتر تھے۔ اہلِ کتاب لوگوں کی عبادت گاہوں کا رخ کرنے، اُن کے پیشواؤں سے بات کرنے، انبیاء کی کہانیوں اور اُن کے عقائد سے آگاہی نے اُسے اپنا عقیدہ استوار کرنے میں مدد دی۔

2: خدا کے بارے میں سوچنا، اور جو اُس نے یہودیوں اور عیسائیوں سے سنا تھا، وہی اُس کی سوچوں کے دائرے کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ اُس نے بعد میں ایک دولت مند عورت سے شادی کی جس نے اُسے تلاش معاش سے بے نیاز کر دیا۔ ورقہ بن نوفل سے مسلسل صحبت نے ان سوچوں کو شیفتگی اور جنون (Obsession) کی شکل میں راسخ کر دیا اور اُس کی زندگی ایک غیور اور جبّار خدا کی سوچوں سے لبریز ہو گئی۔

اُس کا خدا اُن لوگوں سے بہت ناراض ہوتا تھا جو اُس کے علاوہ کسی اور کی پرستش کرتے تھے۔ عاد و ثمود کے لوگوں کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، اُس کی وجہ بھی یہی تھی۔ کہیں اُس کے اپنے لوگوں کو بھی ایسے بھیانک انجام کا سامنا نہ کرنا پڑے، پس اُسے اُنھیں ہدایت دینے میں جلدی کرنا ہو گی۔

یہ مسلسل سوچیں اور پریشان کُن خواب آہستہ آہستہ آپس میں گھل مل جاتے ہیں اور وحی اور الہام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جنھیں خدیجہ اور اُن کا چچازاد بھائی "سچے خوابوں" اور خدائی الہام کی نشانی قرار

دیتے ہیں۔ وہ ہود اور صالح کی مانند کیوں نہیں ہو سکتا؟ پیغمبر کیوں صرف بنی اسرائیل سے اٹھیں گے اور اُن کے چچازادوں کے ہاں پیغمبری کا ظہور نہیں ہو سکتا؟۔

اس روحانی سفر بلکہ روحانی بحران اور اپنی سوچوں سے مغلوب ہو کر چالیس سال کی عمر میں وہ اپنے لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔

3: ایسے موجودات جو خود مخلوق اور انسان کی صناعی کا نتیجہ ہیں، اُن کی پرستش احمقانہ عمل اور باطل ہے جو ہر سمجھدار انسان پر عیاں ہے۔ چنانچہ اُسے چاہیے کہ ہر انسان کو ان خرافات سے نجات دلائے، اور یوں فطری طور پر لوگ اس کی طرف رجوع کریں گے، اور خاص طور پر کہ چند لوگوں جن کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، نے اُس کی تائید و تصدیق کی ہے۔ چنانچہ اب ہچکچانے کا وقت نہیں رہا، اور "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ" (اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ: الشُّعَرَاء۔ 214) پر عمل کرنے کا مرحلہ آچکا ہے۔

لیکن اُس کی روح کو ہر روز استہزا اور تضحیک کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کی سادہ اور مؤمن روح اس اہم نکتہ کو نہیں سمجھ پائی تھی کہ اچھی سوچوں اور درست مطالب کو بھی لوگوں کی قبولیت کی ضرورت ہوتی ہے، اور لوگ اپنی عادات و رسوم کے تابع ہوتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اُس کی دعوت ایک ایسے ڈھانچے کو منہدم کرنے پر تلی ہوئی تھی جو قریش کے سرداروں کی شان اور وقار کا باعث تھی۔ اس لیے اُس کے خلاف کھڑے ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُس کے خلاف سب سے پہلا کھڑا ہونے والا خود اُس کا چچا تھا جس نے چیخ کر کہا: "تبّالک یا محمد" (اے محمد! تم تباہ ہو جاؤ)، کیا ایسی فضول باتوں کے لیے تم نے ہمیں اس اجتماع میں طلب کیا ہے؟۔

4: ابوجہل نے ایک روز شریق بن اخنس سے کہا، ہمارے اور بنو عبدالمطلب کے درمیان ایک مستقل رقابت اور دشمنی تھی۔ اب جب کہ ہر حوالے سے ہم اُن تک پہنچ چکے ہیں تو وہ ایک (خود ساختہ) پیغمبر

لے کر آ گئے ہیں تا کہ ہم پر اپنی برتری قائم رکھ سکیں۔ یہی باتیں ہمیں پچاس سال بعد یزید سے منسوب ان اشعار میں سنائی دیتی ہیں: ”لعبت ھاشم للملک فلا خبر جاء و لا وحی نزل“ (بنو ہاشم اقتدار کے مزے لے رہے تھے، نہ کوئی فرشتہ آیا اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی)۔

ابو جہل اور شریق کے درمیان ہونے والی گفتگو مخالفین کے طرزِ فکر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ غریب اور یتیم محمد نے اپنی صاحب حیثیت بیوی کے زیرِ سایہ زندگی بسر کی، قریش کے معزز سرداروں کے مقابلے میں اُن کا کوئی مقام یا شخصیت نہیں تھی۔ اُن کی دعوت اگر قبولیت پا لیتی تو اس سے قریش کے خطابات اور عظمت مکمل طور پر اگر ختم نہ بھی ہوتی تو کم از کم پھر بھی ان کی حیثیت حضور کے مقابلے میں ثانوی ہو جاتی، اور بنو عبد المطلب قریش کے دوسرے اشراف پر فوقیت حاصل کر جاتے۔ لیکن اتفاق سے بنو عبد المطلب نے بھی حضور کی پیروی نہ کی، حتیٰ کہ ابو طالب اور اُن کے دوسرے چچا بھی نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے قریش کے ساتھ کسی قسم کے اختلافات ہوں یا اُن سے تعلقات ٹوٹ جائیں۔

شائد محمد کو اگر آغاز میں ان صعوبتوں، لوگوں کے اپنے عقائد سے چمٹے رہنے، اس مخالفت اور ڈھیٹ پن کا جن سے اُن کا مکّہ کے تیرہ سالوں کی دعوت کے دوران سامنا ہوا، پہلے سے اندازہ ہوتا تو وہ اس میدان میں یوں لاپرواہی اور آسانی سے قدم نہ رکھتے۔ اور اگر وہ قدم رکھتے بھی، تو ورقہ بن نوفل، امیہ بن ابو الصلت اور قس بن ساعدہ کی مانند صرف اپنی باتیں کہنے پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے راستے پر چلتے جاتے۔

لیکن قرائن، شواہد اور بعثت کے بعد پیش آنے والے واقعات سے پتہ چلتا ہے، کہ محمد اُن لوگوں میں سے تھے، جو اپنی سوچوں کے متعلق بہت راسخ اور دُھن کے پکے ہوتے ہیں۔ اور اپنی منزل تک پہنچنے میں رکاوٹوں اور مشکلات سے نہیں ڈرتے ہیں۔ محمد اپنے عقیدے سے مسخّر ہو چکے تھے اور اپنے آپ کو لوگوں کی ہدایت پر مأمور سمجھتے تھے، اور تقریباً تیس سالوں سے یہ فکر اور عقیدہ اُن کے ذہن میں راسخ ہو چکا تھا۔ ایمانی قوّت کے علاوہ اُن میں دیگر خوبیاں بھی تھیں اور وہ بے نظیر فصاحت تھی جو ایک ان

پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ شخص کے ہاں ہونا حیرت انگیزی کا باعث تھی۔ اسی گرم اور فصیح زبان میں اُنھوں نے لوگوں کو فضیلت، صداقت اور انسانیت کی دعوت دی اور غریبوں اور لاچاروں کی مدد کرنے کے لیے کہا۔ صداقت، راست بازی، تقویٰ اور عفت کو نجات کا ذریعہ قرار دیا اور گزرے ہوئے لوگوں، انبیا اور اسلاف کی عبرت انگیز باتیں بتائیں۔

5: دعوتِ اسلام یقینی طور پر مکہ کی صورتحال پر ایک ردعمل تھا۔ بُت پرستی سے بیزار لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ دولت مند اور طاقتور کے سامنے غریب اور مسکین لوگوں کا طبقہ تھا، اسی طبقے کی اسلام کی طرف پیش رفت سے اسلام کو کامیابی ملی۔

محروم اور مظلوم طبقہ تاریخی پہیے کی تمام حرکت کا باعث رہا ہے۔ لیکن طاقتور بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے۔ اُنھوں نے غریب اور بے آسرا مسلمانوں کی ایذارسانی بلکہ اُن پر تشدد کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اُنھوں نے محمد سمیت، ابوبکر، عمر اور حمزہ جیسے چند لوگوں سے تعرض نہیں کیا کیونکہ اُن کے رشتہ دار موجود تھے۔ لیکن مسکین و عاجز طبقہ جن کی بنیادوں پر ایک نئے دین کے ہرم (Pyramid) کی تشکیل ہونی تھی، کا معاملہ مختلف تھا۔ اسی وجہ سے تیرہ سالوں کی مسلسل دعوت کے باوجود محمد ایک سو یا اس کے لگ بھگ تعداد سے زیادہ پیروکار پیدا نہیں کر سکے اور یہ امر ہمیں ایک عجیب اور غیر متوقع نتیجے کی سمت لے جاتا ہے، کہ نہ محمد کی دعوت کی سچائی، نہ اُن کی زاہدانہ روش، نہ اُن کی فصاحت گفتار، نہ اُن کا آخرت کے حوالے سے ڈرانا اور نہ اُن کی انسانی اور اخلاقی تعلیمات مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہوئی تھیں اور یوں یہ خوبیاں اسلام کے پھیلاؤ میں مناسب اور مؤثر انداز سے مددگار ثابت نہیں ہو پائیں۔

5: اسلام کے جڑ پکڑنے اور اس کے پھیلاؤ کی سب سے اہم وجہ تلوار کی طاقت، بے دریغ قتل اور وحشیانہ عمل تھا۔ اور اس بات کا بھی اضافہ کر دینا چاہیے کہ اس روش کی ایجاد یا ابتدا محمد نے نہیں کی تھی بلکہ اس

کا سرچشمہ عربوں کے رواج اور روایات تھیں۔ نجد و حجاز کے عربوں کے ہاں زراعت اور صنعت نہیں تھی۔ اُن کے ہاں کوئی شہری اور انسانی قوانین تھے اور نہ آسمانی۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنا اور لُوٹ لینا ایک عام اور معمول کی بات تھی۔ سال میں چار مہینوں کے لیے وہ جنگ کو اس لیے حرام قرار دیتے تھے کہ ستانے کے علاوہ اپنی طاقت کو بحال کر سکیں۔ دوسروں کے مال و ناموس پر قبضہ کرنے سے اُنھیں صرف یہی ایک ہی چیز روکتی تھی کہ دوسرا چوکس اور اپنے دفاع کے لیے تیار ہے۔

چنانچہ مدینہ ہجرت اور اوس و خزرج کی حمایت و مدد ملنے کے بعد اسی اصول کا اطلاق ہوا۔ قافلے لوٹنا غالباً اس اصول کے نفاذ کے علاوہ کچھ نہیں تھا، اور مدینہ اور آس پاس کے یہودی اس کا بڑا اور یقینی ہدف تھے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے قیام کا آغاز جس کا قانون ساز، عمل درآمد کروانے والا اور سپہ سالار اللہ کا رسول تھا، یہیں سے ہوتا ہے

6: قبل اسلام کے زیادہ تر عرب سطحی، مادی اور اپنے فوری احساسات کے اسیر ہوا کرتے تھے۔ ایک شعر سُن کر وجد میں آجاتے تھے، کسی ناپسندیدہ جملے کو سُن کر قتل پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اُن کے روزمرہ کے امور محسوسات سے معلوم ہونے والی چیزوں تک محدود تھے اور روحانیت و عرفان کی دنیا اور ہر اُس چیز سے دور تھے جس کا تعلق مابعد الطبیعات سے تھا۔ طاقت اور تشدد کے تابع اور انصاف و حقانیت سے روگرداں تھے۔

لوٹ مار کا لالچ اُنھیں ہر طرف کھینچ لے جاتا تھا۔ ایک یورپی عالم کے قول کے مطابق جب اُنھیں اپنا لشکر مغلوب ہوتا نظر آتا تھا، تو کبھی کبھار بھاگ کر وہ غالب لشکر میں شامل ہو جاتے تھے (ایسے نادر لوگ اور مستثنیات ہر جماعت میں تھیں اور ہیں)۔

ایسا معاشرہ جس میں حکومت اور نظام موجود نہیں ہوتا، وہاں نظم و ضبط رکھنے کے لیے صرف طاقت کا توازن اور ایک دوسرے کا خوف ہی کام آتا ہے۔ اسی لیے ہر قبیلہ اور ہر خاندان اپنے مال، عورتوں اور اولاد کے دفاع کے لیے ہر لمحہ چوکس اور آمادہ رہتا تھا۔

عرب تفاخر اور خود ستائی کے مارے ہوئے لوگ تھے، اپنی اور اپنے قبیلے کی تعریف کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنی خامیوں اور برائیوں پر بھی فخر کرتے تھے۔ وہ اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے، اور اپنی کوتاہیوں کی طرف صرف نظر کرتے تھے۔

اگر کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر کرتے تو دوسری صبح اُسے اشعار کی صورت بیان کرتے اور خود ستائی کے جوش میں اُس بے چاری عورت کو رسوا کرتے۔ اُن کی بدوی سادگی اور پسماندگی اُن کے مزاج پر اس قدر غالب تھی کہ اُن کی یہ سادگی جانوروں کی سادگی اور اپنی جبلت کے تحت عمل کرنے کی یاد دلا دیتی تھی۔

روحانیت اور مابعد الطبیعاتی علوم سے دوری کی تصویر بدوی زندگی میں واضح نظر آتی تھی، اور یہ رویہ اسلام قبول کرنے کے سالوں بعد بھی ہمیں عرب علماء خصوصی طور پر امام حنبل کے پیروکاروں میں نظر آتا ہے جو ہر قسم کے عقلی موضوع کو کفر اور زندقہ کہتے تھے۔

7: ہجرت کے دس سالوں کے دوران پیش آنے والے واقعات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت محمد نے اسلام کے فروغ کی بنیاد اُن کی اُنھی قومی خصوصیات پر رکھی۔ کبھی شکست کا ازالہ کرنے کے لیے کسی کمزور قبیلے پر حملہ کر دیا جاتا تھا تاکہ اسلام کے وقار میں کمی نہ ہونے پائے۔ ہر فتح کا نتیجہ چھوٹے قبیلے کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں نکلتا یا کم از کم اُس قبیلے سے دوستی اور عدم جارحیت کا پیمان ہو جاتا۔ مال غنیمت کا حصول اسلام کے فروغ کے مؤثر ترین عوامل میں سے تھا۔ یہاں تک کہ مال غنیمت کے ہاتھ لگنے کے شوق سے جہاد کا حکم بھی آسانی سے قبول اور جاری ہو گیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد خدا نے

سورت الفَتْح میں مسلمانوں سے بہت زیادہ غنائم کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن نقد مال کا وعدہ "جَنّاتٍ تَجْرِي مِن تَحتِهَا الأَنْهارُ" کے وعدوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوا۔

اگرچہ ابھی تک ایسے درست اور قابل اعتماد اعداد و شمار مرتب نہیں ہوئے جو محمد کے سچے دوستوں کو موقع پرست مسلمانوں سے علیحدہ کر سکے لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور کی رحلت کے وقت نوے فیصد لوگ ڈر یا مصلحت کے تحت مسلمان ہوئے تھے۔ عرب قبائل میں ارتداد اور ارتداد کے خاتمے کی جنگیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔

خود مدینہ جو ایمان کا مرکز اور اسلام کا منبع شمار ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگوں میں علی بن ابو طالب، عمار بن یاسر اور ابو بکر جیسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ان لوگوں کے ایمان لانے اور حضور کی مطلق پیروی کے وجہ دنیاوی مقاصد اور سوچ بھی تھی۔ چنانچہ جب ریاست کے اقتدار کے حوالے سے مہاجرین اور انصار کے درمیان تنازعہ کھڑا ہوا جس سے حضور کے جسد کی تدفین بھی تین دن تک مؤخر ہو گئی۔ اُس وقت علی، طلحہ اور زبیر فاطمہ کے گھر جمع تھے اور اقتدار کے خواہش مندوں کے جوش و خروش سے بے خبر تھے۔ ابو بکر، عمر اور ابو عبیدہ بن جراح سمیت چند دیگر لوگ عائشہ کے گھر پر تھے کہ ایک شخص وہاں آیا اور اُنھیں کہا: "انصار کے لوگ سعد بن عبادہ کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ اقتدار کی رسی تمہارے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے تو جلدی کرو"۔ عمر نے ابو بکر سے کہا: "چلو اٹھو انصار کے لوگوں کے پاس چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں"۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد بن عبادہ نے اُن کی طرف منہ کر کے کہا: "ہم اسلام کا لشکر ہیں، ہم نے پیغمبر کی مدد کی، اسلام ہمارے زور بازو سے استوار ہوا ہے۔ البتہ تم مہاجروں کی جماعت کا بھی اس میں حصہ ہے اس لیے ہم تمہیں اپنوں کے طور پر قبول کرتے ہیں"۔ عمر بہت غصے کے عالم میں اٹھنا چاہ رہے تھے کہ ابو بکر نے اُن کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے فطری وقار اور پُر سکون انداز سے کہا: "آپ نے انصار کی شان میں جو کہا ہے ہم اسے قبول کرتے ہیں۔ لیکن یہ

حق قریش کا ہے کہ وہ دوسرے عرب قبائل سے برتر ہیں"۔ اس کے بعد اُنھوں نے عمر اور ابو عبیدہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: "ان دونوں میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو"۔

عمر جو ایک حقیقت پسند، فطری طور پر مدبّر اور دور اندیش تھے، اس تجویز سے متاثر نہیں ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ اس انتخاب کے شور اور ابلتے ہوئے جذبات میں ابو بکر کا انتخاب ہی اس مسئلے کا واحد حل ہو سکتا ہے۔ کہ وہ پیغمبر کے یار غار تھے اور بیماری کے دنوں میں حضور نے اُنھیں مسلمانوں کی ادائیگی نماز کی امامت کے لیے مامور کیا تھا اور وہ دوسرے مہاجرین کے مقابلے میں زیادہ سن رسیدہ اور محترم تھے۔ چنانچہ وہ ایک دم سے اٹھے اور ابو بکر کو کہا کہ ہاتھ آگے بڑھاؤ، اور وہاں سب موجود لوگوں کے سامنے بیعت کر لی۔ فطری طور پر تمام مہاجرین نے اُن کی پیروی کی۔ انصار نے بھی اس نشانے کا شکار ہونے کے نتیجے میں بیعت کر لی۔ کھیل یک طرفہ ہو گیا ہے اور شکوک و تذبذب کی جگہ نہیں بچی، یہ دیکھ کر سعد بن عبادہ کو اُس کی جگہ سے نیچے گھسیٹ لیا گیا اور چند ساتھیوں کی مدد سے اُس بے چارے بوڑھے کو اس قدر مارا گیا کہ وہ وہیں مر گیا[189]۔

189: تاریخی حوالوں کے مطابق سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد کی موت نہیں ہوئی تھی، بلکہ تاریخ طبری کے مطابق بیعت کے دوران لوگوں نے سعد کو روند ڈالا۔ کسی نے کہا کہ سعد کو بچاؤ۔ عمر نے کہا: "اللہ اس کو ہلاک کرے، اس کو قتل کر دو"، اور سعد کے سرہانے آ کھڑے ہوئے۔ سعد نے عمر کی داڑھی پکڑ لی۔ عمر نے کہا: "اسے چھوڑو، اگر اس کا ایک بھی بال بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہیں رہے گا"۔ سعد بیمار تھے۔ اُنھوں نے کہا: "اگر مجھے میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے آدمیوں سے بھر دیتا کہ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے ہوش اُڑ جاتے"۔ اس مجلس میں بشیر بن مُنذر نے تلوار نکالی اور عمر پر جھپٹے۔ ابو بکر کی بیعت ہو جانے کے بعد سعد بن عبادہ جتنا عرصہ بھی مدینہ میں رہے، وہ کسی سے بولتے نہیں تھے۔ مسجد نبوی میں آ کر نماز پڑھنے کے بعد خاموشی سے گھر چلے جاتے تھے۔ عمر بن خطاب کے دور خلافت میں مدینہ چھوڑ کر شام کے شہر حران منتقل ہو گئے۔ ایک دن بیٹھے پیشاب کر رہے تھے کہ اُنھیں کہیں سے ایک زہر میں بجھا تیر آ لگا جس سے اُن کی وہیں موت واقع ہو گئی۔ عمر بن خطاب کے بقول کسی جن نے سعد کو تیر مارا ہے۔ افواہ ہے کہ عمر نے سعد کو قتل کروایا تھا۔

عمر پھر اس بات کو بھی جانتے تھے کہ علی کے بیعت نہ کرنے کا لازمی نتیجہ بنو ہاشم کے بیعت نہ کرنے کی صورت میں نکلے گا۔ اور ابو بکر کی خلافت تب تک مستحکم نہیں ہو گی جب تک انہیں بنو ہاشم کی بیعت اور حمایت نہ ملے۔ چھ مہینے وہ اُن کے ہاں آتے جاتے رہے اور ابو بکر کی بیعت کرنے پر اصرار کرتے رہے ، جس کے بعد علی نے سر جھکا دیا اور ابو بکر کی خلافت کو قبول کر لیا۔

8: اگر بعثت سے لے کر ہجرت تک کے تیرہ سال ہم تاریخ اسلام سے نکال دیں تو تاریخ اسلام محض جبر کی تاریخ اور طاقت کے حصول کی سر گزشت ہے۔ جب تک رسول کریم زندہ رہے، اُن کا مقصد دین اسلام کی توسیع اور بت پرستوں کو اسلام قبول کروانا تھا لیکن اس کے بعد اقتدار اور امارت کے حصول کے لیے ہی مسلسل کوششیں ہوتی رہیں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ عمر نے کیسے زبردستی سے ابو بکر کی خلافت کو یقینی بنایا۔ ابو بکر نے بستر مرگ پر خلافت کی خلعت عمر کو سپرد کی اور اُن کی سفارش کی وجہ سے عمر بغیر کسے تنازعہ کے رسول کریم کی مسند خلافت پر براجمان ہو گئے۔ جنھوں نے دس سال سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد علی، عثمان، عبد الرحمن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص پر مشتمل ایک شوریٰ بنائی تاکہ وہ اپنے درمیان سے کسی کو خلیفہ چُن لیں۔

شوریٰ آپس میں ملی، لیکن حاضرین میں سے کسی نے بھی دوسرے کو خلیفہ نامزد نہیں کیا کیوں کہ اُن میں سے ہر کوئی خود خلیفہ بننا چاہتا تھا۔ مجبوراً عبد الرحمٰن نے خلافت کی نامزدگی سے خود کو دستبردار کر دیا۔ لیکن پھر بھی کوئی نہیں بولا اور نہ اپنی رائے دی۔ چنانچہ عبد الرحمٰن نے اجلاس کو تین دن کے لیے ملتوی کر دیا تاکہ وہ مہاجرین اور انصار کی رائے سے بھی واقف ہو جائیں۔

عبد الرحمٰن نے ان تین دنوں کے دوران شوریٰ کے اراکین سے رائے چاہی یہاں تک کہ انہوں نے عثمان سے پوچھا: ” اگر آپ کو خلافت نہ ملے تو آپ ان چار دیگر افراد میں کس کو پیغمبر کے جانشینی کے

طور پر مناسب خیال کرتے ہیں؟"۔ تو عثمان نے علی کو اوّلین پسند اور خلافت کا مستحق قرار دیا۔ یہی سوال علی سے کیا گیا، تو علی نے باقی چاروں میں سے عثمان کو خلافت کا مستحق قرار دیا۔

تین دن بعد یہ مسجد نبوی میں جمع ہوئے۔ اور یہ بات تقریباً ہر کسی کو معلوم تھی، کہ ان دو افراد یعنی علی و عثمان میں سے کوئی ایک خلیفہ بنے گا۔

عثمان اپنی نرم مزاجی، حیا اور سخاوت کے حوالے سے معروف تھے اور علی اپنی بہادری، تقویٰ اور دینی اصولوں کے معاملات میں سختی کی وجہ سے مشہور تھے۔ دنیادار لوگ جو عمر کے دور خلافت کی شدت اور سختیوں سے تھک چکے تھے، وہ ڈرے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر علی خلیفہ بن گئے تو وہ عمر کی روش کو جاری رکھیں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے عمرو بن العاص سے درخواست کی جو رات کے وقت علی کے پاس گئے اور اُن سے کہا: " عبدالرحمٰن پہلے آپ کے پاس آئے گا اور خلافت کی پیشکش کرے گا، لیکن یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے، کہ اسے فوراً قبول کرلیں۔ بلکہ آپ کی خلافت کے استحکام اور استواری کا تقاضاہے کہ عبدالرحمٰن اپنی پیشکش کو دوہرائے"۔

وہ دن آ پہنچا تو عبدالرحمٰن منبر رسول پر بیٹھے اور پہلے علی کو مخاطب کر کے کہا: "آپ پیغمبر کے چچازاد بھائی، اُن کے داماد، پہلے ہونے والے مسلمان اور سب سے بڑے مجاہد ہیں، اگر آپ وعدہ کریں کہ اللہ کی کتاب، رسول کی سُنّت اور شیخین کے طریقہ پر عمل کریں گے تو میں آپ کی خلافت کی بیعت کرتا ہوں۔ علی نے فرمایا: "میں اللہ کی کتاب اور سُنّت رسول کا وعدہ کرتا ہوں لیکن میں اپنے طریقے سے کام کروں گا"۔

عبدالرحمٰن نے فوراً ہی عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "علی کے بعد آپ خلافت کے جائز امیدوار ہیں، اگر خدا کی کتاب، سُنّت رسول اور شیخین کے طریقوں پر آپ عمل کریں گے تو میں آپ کی بیعت کرتا ہوں"۔ عثمان نے ایک دم سے اسے قبول کرلیا اور یوں خلافت عثمان کے پاس چلی گئی۔

اس واقعے کو تاریخ طبری میں جس طرح سے بیان کیا گیا ہے، اُس کو یہاں نقل کرنے سے باریک بین لوگوں کو اُن وقتوں کے معاشرتی حالات، ریاستی اقتدار کی خواہش اور چند معتبر صحابیوں کے ذہنوں پر عمر کی سخت گیری سے رہائی پانے کے چھائے احساس سے آگاہی ہو گی۔

”جب عمر کا انتقال ہو گیا تو صحرا میں مقیم تمام اہم لوگ تعزیت کے لیے مدینہ آئے تو عبد الرحمٰن نے اس سلسلے میں سب کی رائے پوچھی۔ ہر کسی نے جواب دیا: عثمان بہتر ہے۔

پھر رات کو ابو سفیان عمرو بن العاص کے گھر گئے اور کہا: ”آج رات عبد الرحمٰن میرے گھر آئے تھے اور کہا کہ اب معاملہ دو افراد کے گرد گھوم رہا ہے، عثمان اور علی، اور میں نے عثمان کی خواہش کی“۔ عمرو نے کہا: ”وہ میرے گھر بھی آئے تھے اور میں نے بھی عثمان کی خواہش کی تھی“۔

ابو سفیان نے کہا: ” پھر ہم کیا کریں؟ کیونکہ عثمان ایک نرم مزاج آدمی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس معاملے میں ناکام نہ ہو جائے اور علی اپنی ذہانت کی وجہ سے کامیاب ہو جائے“۔

ابو سفیان اُس رات عمرو بن العاص کے ہاں رہے اور پوچھتے رہے کہ ہم کیا کریں کہ خلافت عثمان کو مل جائے۔ عمرو بن العاص اُسی رات علی کے گھر گئے اور کہا: ” تم جانتے ہو کہ میری تمھارے ساتھ بہت پرانی دوستی ہے اور میری خواہش تمہاری طرف ہے۔ سب اس سے خارج ہو گئے ہیں، بات اب تمھارے اور عثمان کے مابین ہے۔ آج رات عبد الرحمٰن اہم لوگوں کے پاس گئے اور اُن سے پوچھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسے چاہتے ہیں؟ کچھ لوگ تمھیں چاہتے ہیں اور کچھ عثمان کو۔ پھر وہ میرے پاس آئے تو میں نے اُنھیں بتایا کہ میں تمھیں پسند کرتا ہوں اور اب اسے لیے تمھارے پاس آیا ہوں کہ تمھیں ایک مشورہ دوں جسے تم اگر مان لو تو خلافت کل تمہاری ہے“۔ علی نے کہا: ” آپ جو بھی فرمائیں گے مجھے منظور ہے“۔ اُنھوں نے کہا: ”پھر مجھ سے عہد کرو کہ کسی کو یہ نہیں بتاؤ گے“۔ علی نے وعدہ کیا اور تجویز قبول کر لی۔

عمرو نے کہا: "یہ عبد الرحمٰن بہت ہی سمجھدار اور دانا انسان ہے، کل وہ جب تمہارے سامنے خلافت پیش کرے تو تم اپنی خواہش کا اظہار نہ کرنا۔ جب وہ تمھارے اندر خلافت کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ اور تامل پائے گا، تو وہ اس سے خوش ہو گا، اور اگر تم نے جلدی دکھائی اور اپنے شوق کا اظہار کر دیا، تو وہ تم سے منہ پھیر لے گا"۔ علی نے کہا میں ایسا ہی کروں گا۔

پھر اُسی رات وہ عثمان کے گھر گئے اور اُنھیں کہا: "میں تمھیں ایک نصیحت کرتا ہوں جسے تم اگر قبول کر لو تو کل تمھیں خلافت مل جائے گی، اور اگر قبول نہ کیا تو خلافت علی کو مل جائے گی"۔ عثمان نے کہا: "کہو مجھے منظور ہے۔ عمرو نے کہا: "عبد الرحمٰن ایک سچا اور کھرا آدمی ہے اور سیدھی بات کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ کل جب خلافت تمھیں پیش کی جائے، تو دھیان رہے کہ ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کرو۔ اور اگر کوئی شرط رکھے تو یہ نہ کہنا کہ میں اسے پورا نہیں کر سکتا۔ جو کچھ وہ کہے اُسے ایک دم سے قبول کر لینا، کہنا کہ میں ایسا ہی کروں گا"۔ اس کے بعد عمرو گھر چلے آئے۔

دوسرا روز آن پہنچا۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد عبد الرحمٰن منبر پر چڑھے۔ منبر پر کھڑے ہو کر اُنھوں نے کہا: "آپ سب جانتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ وہ کسی کو اپنا جانشین مقرر کریں۔ وہ اس کام کے ثواب یا گناہ سے خود کو آزاد رکھنا چاہتے تھے۔ یہ بوجھ اُنھوں نے ہم پانچوں کے کندھوں پر رکھا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس دوڑ سے باہر نکال لیا ہے، اور سعد و زبیر نے اپنا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے بخش دیا ہے۔ اب یہ بات علی اور عثمان کے مابین ہے، آپ جس کا انتخاب کرتے ہیں میں اُس کی بیعت کر لوں گا۔ اور اس سے پیشتر کہ آپ اس مجلس سے گھر جائیں، ہر کسی کو پتہ ہو کہ اگلا امیر المؤمنین کون ہے؟"۔ ایک گروہ نے کہا کہ وہ علی کو چاہتے ہیں، دوسرے گروہ نے اختلاف کیا اور کہا کہ وہ عثمان کو چاہتے ہیں۔ سعد بن زید نے کہا: "ہمارے نزدیک آپ بہتر ہیں اور ہم آپ کو پسند کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو بیعت کے لیے پیش کریں گے تو کوئی بھی اس کی مخالفت نہیں کرے گا"۔ عبد الرحمٰن نے کہا: "اس کا وقت گزر چکا ہے، اس بات کو ختم کر دو اور اب یہ دیکھو کہ ان دونوں

میں سے کون بہتر ہے"۔ عمار بن یاسر نے کہا: "اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو تو علی کی بیعت کریں۔ مقداد نے کہا: "یاسر درست کہہ رہا ہے، اگر آپ علی کی بیعت کریں گے تو کسی کو اختلاف نہیں ہو گا"۔ عبد اللہ بن سعد بن السرح جو عثمان کا رضاعی بھائی تھا اور ایک بار مرتد ہو چکا تھا اور بعد میں دوبارہ اسلام قبول کیا، لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور عبد الرحمٰن کو کہا: "اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی بھی خلاف نہ اٹھ کھڑا ہو تو عثمان کی بیعت کریں"۔

عمار[190] نے عبد اللہ کو گالی دی اور کہا: "اوئے مرتد! تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ اور تمہارا اسلام سے کیا تعلق ہے کہ مسلمانوں کے امیر کے متعلق ہونے والی باتوں میں بولو؟"۔ بنو مخزوم کے ایک شخص نے عمار کو کہا: "اوئے غلام، اوئے لونڈی کے بیٹے، قریش کی معاملات سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"۔

اس کے بعد لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے اور شور شرابا اور افراتفری پھیل گئی۔ سعد بن ابن و قاص اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا: "اے لوگو اس مسئلے کو جلدی نپٹاؤ، پیشتر اس کے کہ کوئی فساد ہو جائے"۔ تو عبد الرحمٰن کھڑے ہو گئے اور کہا: "خاموش ہو جاؤ، تاکہ میں وہ فیصلہ سناؤں جسے میں درست سمجھتا ہوں۔ لوگ چپ ہو گئے۔ عبد الرحمٰن نے کہا: "علی کھڑے ہو جاؤ"۔ وہ اُٹھے اور عبد الرحمٰن کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ عبد الرحمٰن نے علی کا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ سے تھام لیا اور اپنے دائیں ہاتھ کو

190: عمار بن یاسر کے والد یاسر بن عامر یمن کے بنو قحطان قبیلے سے تھے۔ اُن کی ماں سمیہ بنت خیاط تھیں۔ دونوں میاں بیوی بنو حذیفہ کے غلام تھے۔ بعد میں بنو مخزوم کے عمرو بن ہشام نے اُنھیں خرید لیا۔ جب میاں بیوی اور بیٹے نے اسلام قبول کیا تو اُنھیں بہت سی اذیتوں کا سامنا ہوا، جن میں تپتی ریت پر لٹانا، چھاتی پر بھاری پتھر رکھنے جیسے مظالم تھے۔ عمار بن یاسر کے والد ان اذیتوں کی وجہ سے مر گئے۔ اُن کی والدہ سمیہ کو عمرو بن ہشام نے قتل کر دیا۔ سمیہ کو اسلام کی پہلی شہید خاتون کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سورت العَنکبوت کی دوسری آیت عمار کی والدہ کی موت کے متعلق ہے۔ "کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیے جائیں گے اور اُن کی آزمائش نہیں کی جائے گی"۔

یوں اوپر اٹھایا گویا علی کے ہاتھ میں دینے والے ہیں اور کہا: ”کیا تم خدا کی قسم کھا کر یہ عہد کرتے ہو کہ مسلمانوں کے معاملات کو قرآن، سُنّت رسول اور اُن دو خلفاء کے طریقوں کی مانند نبھاؤ گے جو پہلے ہو گزرے ہیں؟“۔

علی کو عمرو بن العاص کے وہ لفظ یاد آئے جو اُنھوں نے رات کو کہے تھے۔ اُنھوں نے عبد الرحمٰن کو کہا: ”یہ کام اس شرط پر مشکل ہے، کیا کوئی خدائی کتاب کے احکامات اور پیغمبر کی سُنّت کو مکمل طور پر جانتا ہے؟ لیکن جس قدر میرا علم ہے اور میرے پاس طاقت و اہلیت ہے، میں کوشش کروں گا اور اس کو بہتر طور پر نبھانے کی توفیق دینے کے لیے خدا سے دعا مانگوں گا“۔

عبد الرحمٰن نے اپنے بائیں ہاتھ کو علی سے ہٹا لیا اور اپنے دائیں ہاتھ کو وہیں رکھا اور علی سے کہا: ”ان شرائط کے سلسلے میں ایسی سُستی اور کمزوری؟۔ اے عثمان آؤ“۔ عثمان اٹھے اور آگے آئے۔ عبد الرحمٰن نے عثمان کا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں تھاما اور کہا: ”اے عثمان! کیا تم خدا کی قسم کھا کر یہ عہد کرتے ہو کہ اُمّت کی اس ذمہ داری کو خدائی کتاب کے احکامات، سیرت پیغمبر اور اُن دو خلفاء کے طریقوں کے مطابق نبھاؤ گے؟“۔ عثمان نے کہا: ”مجھے قبول ہے“۔

عبد الرحمٰن نے اپنے دائیں ہاتھ کو جو علی کو نہیں دیا تھا، جلدی سے عثمان کے ہاتھ میں دے دیا اور بیعت کر لی اور کہا ”بارک اللہ لک فیما صیّرہ الیک“ (اللہ نے جسے تم سے نوازا ہے اُس میں برکت دے)۔ لوگ اٹھے اور اُنھوں نے بیعت کر لی، اور علی حیران رہ گئے اور عبد الرحمٰن کو کہا: ”خدعتمونی خدعة“ (تم لوگوں نے مجھے دھوکا دیا ہے)۔

علی کا خیال تھا کہ جو بات عمرو بن العاص نے اُن سے کہی تھی، یہ عبد الرحمن، عثمان، سعد اور زبیر سے طے کرنے کے بعد کہی تھی۔ چنانچہ حیرانی کے اسی عالم میں وہ واپس جا رہے تھے۔ جب اُنھوں نے واپس مڑ کر دیکھا، تو عبد الرحمٰن نے کہا: ”اے علی کہاں جا رہے ہو، بیعت نہیں کرو گے؟۔ خدا نے کہا ہے: ”

فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ "(پھر جو عہد کو توڑے تو عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہے: الفتح۔10)۔ کیا میں نے اپنے آپ کو اسی لیے دستبردار نہیں کر لیا تھا کہ میں جو بھی فیصلہ کروں گا وہ تمھیں منظور ہو گا؟۔ کیا عمر نے یہ نہیں کہا تھا کہ جو عبد الرحمٰن کی رائے کا احترام نہ کرے اُسے قتل کر دیا جائے؟"۔ علی نے جب یہ بات سُنی، تو واپس پلٹے اور بیعت کر لی۔ اُس روز ظہر کی نماز کے بعد بیعت مکمل ہو گئی اور عثمان نے نماز کی امامت کروائی"۔

طبری کے بقول ابو سفیان نے عمرو بن العاص سے مل کر خلافتِ عثمان کے لیے منصوبہ بندی کی تھی۔ کیونکہ وہ علی کے خلیفہ بننے سے ڈرتے تھے۔ یہ وہی ابو سفیان تھے جو بارہ سال پہلے ابو بکر کے خلیفہ بننے سے اس قدر طیش میں آئے تھے کہ علی کو بیعت کی پیشکش کی تھی اور یہ کہا تھا کہ میں مدینہ کی گلیوں کو قریشی جنگجوؤں سے بھر دوں گا۔ لیکن اب علی اور عثمان کے درمیان فیصلے کا وقت آیا تو اُنھوں نے عثمان کو علی پر ترجیح دی جن کے زیرِ سایہ اُنھیں عروج مل سکتا تھا اور علی کے تقویٰ سے انہیں ڈر لگتا تھا۔

یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ عمر کے بعد اگر علی خلیفہ بنتے تو اسلام کا سنہری دور زیادہ طول پکڑتا۔ اختلافات سر نہ اٹھاتے، اسلام کے اصولوں سے انحراف واقع نہ ہوتا، مال و زر کے متلاشی لوگ عثمان کی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر نہ پہنچتے اور بیشتر حوادث جو خلافت معاویہ اور اموی سلسلے کا باعث بنے، واقع نہ ہوتے۔

9: حضور کی رحلت کے بعد اُن کے ساتھیوں کو دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ایک گروہ اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو اُن کی نبوت پر ایمان رکھتا تھا اور دوسرا گروہ نبی ہونے کے علاوہ اُنھیں ایک ریاستی ڈھانچے کے خالق کے طور پر بھی تسلیم کرتا تھا۔ ان لوگوں نے اس ڈھانچے کے قیام کے لیے معاونت کی، اور اپنے آپ کو اس ڈھانچے کا وارث سمجھتے ہوئے اس کی بقا اور حفاظت کو اپنی ذمہ

داری سمجھتے تھے اور یہ دونوں گروہ اس ڈھانچے کی تعظیم و تکریم اور شان و شوکت کے متعلق ہم خیال تھے۔

بغیر کسی شک کے کہا جاسکتا ہے کہ عمر اُنھی میں سے ایک تھے۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے مسجد کے اندر تلوار نکال کر لوگوں کو ڈرایا تھا کہ محمد مرے نہیں بلکہ وہ موسیٰ کی مانند چالیس دنوں کے لیے غائب ہو گئے ہیں۔ لیکن ابو بکر نے ہاتھ میں قرآن اٹھا کر اُنھیں کہا: "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" (تم بھی مر جاؤ گے اور یہ بھی مر جائیں گے: سورت الزمُّر۔30)۔ اس کے بعد وہ منبر پر چڑھے اور کہا: "اگر محمد کی پرستش کرتے ہو تو محمد مر چکے ہیں اور اگر خدا کی پرستش کرتے تو خدا ہرگز نہیں مرا۔"

اس کے بعد انہوں نے سورت آل عمران کی آیت 144 پڑھی:

وَما مُحَمَّدٌ اِلاّ رَسُولٌ قَد خَلَت مِن قَبلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِن ماتَ اَو قُتِلَ انقَبَلتُم عَلَى اَعقابِكُم

(اور محمد تو ایک رسول ہے اس سے پہلے بہت رسول گزرے پھر کیا اگر وہ مر جائے یا مارا جائے تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے)۔

مہاجرین اور انصار کے جھگڑے کے دوران عمر نے بہت مہارت اور حوصلے سے خلافت کو قابو کیا۔ اور بہت مہارت سے اُسے ابو بکر کے سپرد کیا اور اس کے بعد اُنھیں مرتدوں سے جنگ کرنے کی ترغیب دی۔ اور مرتدین کو گھٹنوں کے بل جھکانے کے لیے کسی بھی بے رحمانہ عمل سے دریغ نہیں کیا۔

ذہن میں بے اختیار یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا عمر کے نزدیک دین اسلام کی روح مقصود بالذات تھی یا اسلامی خلافت؟۔ یہ اسلامی ریاست جو وجود میں آئی تھی اسے کسی بھی صورت ختم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ نوزائیدہ ریاست و حکومت جسے محمد وجود میں لائے تھے اور جس نے عرب قبائل کی جاہلانہ اور حقیر صورت حال کو ختم کیا تھا، کو برقرار رہنا چاہیے۔ ان صحرا نشین عربوں کے اختلاف اور چھوٹی چھوٹی نظریاتی تقسیم ختم ہو جائے گی، اور اسلام کے پرچم تلے ایک نیا معاشرہ ابھرے گا۔

چنانچہ ارتداد کی جنگوں سے فارغ ہونے کے بعد عمر نے اُن لوگوں کو ایک ایسے طاقتور لشکر میں تبدیل کر دیا، جس کی پہلے نظیر نہیں ملتی۔ عمر نے جو اپنی حقیقت پسندی، دور اندیشانہ سوچ اور عربوں کی ذہنیت سے واقف تھے، اُنھیں ایران اور روم سے جنگ کے لیے بھیج دیا۔ وہ جانتے تھے کہ زراعت، صنعت اور تجارت سے نا آشنا یہ قبائل آرام سے نہیں بیٹھیں گے، اور ان کے وجود کے اندر چھپی ہوئی توانائی خارج ہونے کا راستہ ڈھونڈتی رہے گی۔ یہ لوگ فخر کے مارے اور جنگجو ہیں، اور عورتوں اور مال کی جستجو میں رہتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ اس بے قابو توانائی کو ایک بڑے ہدف کی طرف موڑ دیا جائے۔ ان عربوں کی مال و زن کے حصول کی خواہش کو سرحدوں کے باہر موڑ دینا زیادہ سود مند تھا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اُن کا اس تدبیر کو اختیار کرنا ایک مناسب فیصلہ تھا۔

10: ایران اور روم کے درمیان پے در پے جنگوں نے دونوں کے معاشرتی اور سیاسی تانے بانے کو کمزور کر دیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور مؤثر عنصر جزیرہ نما عرب کے شمال میں عربوں کی موجودگی تھی جو پچھلی دو تین صدیوں سے آہستہ آہستہ شام، اردن اور شام کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے وہاں ایران و روم کی سرپرستی میں حکومتیں تشکیل دیں تھیں۔ یہ لوگ خصوصی طور پر ان کے نچلے طبقے کے لوگ، مسلمان لشکر کے مددگار تھے۔ عمر کی دنیا کو فتح کرنے میں کامیابی میں ان لوگوں کو اصل سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ شائد اُنھوں نے ہی عمر کو ایسا کرنے کی ترغیب دی ہو گی، کیوں کہ اسلام ایک ایسے وسیلے کی شکل اختیار کر گیا تھا جو عرب قومیت کو بڑھاوا دینے کا حامی تھا۔ یہ فتوحات ایک ایسی رزمیہ داستان تھی، جس نے نہ صرف دوسروں پر فتح پانے اور بے شمار مال غنیمت حاصل کرنے کی پیاس کو بجھایا، بلکہ ذلّت، بیچارگی اور غیروں کی اطاعت سے بھی رہائی دلائی تھی۔

11: اس بات میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں نے خلوص دل سے اسلام قبول کیا تھا اور اپنے ایمان اور جہاد کے فرض کی ادائیگی کے لیے کچھ لوگ شام اور عراق کی جانب روانہ ہوئے تھے۔ لیکن شہادتوں اور اسلامی تاریخ کے دوران پیش آنے والے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان فتوحات کا مقصد دوسروں پر

غلبہ حاصل کرنا تھا۔ دنیاوی مال کے حصول نے زہد اور دنیا سے بے نیازی کو ایک تنگ دائرے میں محصور کر دیا۔ مسلمانوں اور حتیٰ کہ معزز صحابیوں نے بھی ان فتوحات سے بے شمار مال و دولت حاصل کیا۔

طلحہ اور زبیر معزز صحابی ہونے کے علاوہ عشرہ مبشرہ کا حصہ اور دونوں اُسی شوریٰ کے رکن تھے جسے عمر نے خلیفہ کا تعین کرنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔ ان دونوں مومنین نے موت کے وقت تیس سے چالیس ملین درہم نقد اور مکّہ، مدینہ، مصر اور عراق میں جائیدادیں چھوڑی تھی۔ ان دونوں نے عثمان کے قتل کے بعد علی کی بیعت کر لی تھی لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ عثمان کی مانند علی سخاوت اور بخشش کے طریقے پر عمل نہیں کر رہا، تو اُنھوں نے علی کے خلاف خروج کیا۔

عائشہ، پیغمبر اسلام کی چہیتی بیوی جن کا شمار اسلام کی محترم ترین ہستیوں میں ہوتا ہے، چند ایک حفاظ میں سے ایک ہونے کے علاوہ احادیث کی بہت ثقہ راوی تھیں۔ اُمّت کے اجماع کے خلاف کہ اُنھوں نے علی کو خلافت کے لیے منتخب کیا تھا، عثمان کے قتل کے بہانے جنگ جمل شروع کی کیونکہ علی نے مسلمانوں کے بیت المال سے اُنھیں عثمان کی مانند نہیں نوازا تھا۔ اور شائد ''إفك'' کے مسئلے پر بھی علی نے اُن کی خواہش کے برعکس رائے دی تھی۔ صفین، جمل اور نہروان کی جنگوں کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھی کہ علی عثمان کی روش اور نرمی کو جاری نہیں رکھ سکے۔ چنانچہ تمام وہ لوگ جو عمر کے بعد عثمان کی خلافت کے دوران بہت عروج حاصل کر گئے تھے، وہ علی کی پرہیزگارانہ روش سے بہت زیادہ ناخوش تھے۔ خصوصی طور پر ان کا مقابلہ معاویہ سے ہوا جس نے اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے کسی چیز سے دریغ نہیں کیا۔

12: جب تک حضور زندہ رہے، انہوں نے قرآنی آیات کی طاقت، تدبیر، سیاست اور آخر میں تلوار اور دھمکیوں سے مال و زر کے بھوکے اور روحانی دنیا سے بیگانے ان لوگوں پر اسلام نافذ کیا۔ لیکن اُن کی رحلت کے بعد اُن کے جانشینوں نے اُن کا نام استعمال کیا اور عربوں کی قومی سلطنت استوار کی۔

اور یہ وہ وقت تھا جب محمد کے نام کو کبریائی، معجزات اور مافوق الفطرت کام سرانجام دینے کے دعووں کے پردے سے ڈھانپ دیا گیا۔ محمد جنھوں نے اپنے تمام دورِ رسالت میں خود کو خدا کا ایک بندہ کہا، مرنے کے بعد وہ بشریت کی صف سے خارج ہو گئے، اور اُنھیں خدائے مقدس کے مقام پر فائز کر دیا گیا۔

ہر معتبر اور محترم شخصیت کی موت کے بعد اُس کی ذات سے کچھ مخصوص داستانیں منسوب ہو جاتی ہیں۔ انسان کتنا ہی محترم کیوں نہ ہو، وہ بشر ہوتا ہے اور لامحالہ اُس میں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ اُسے بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے، سردی اور گرمی اُس پر اثر کرتی ہے، جنسی خواہش ہوتی ہے اور عین ممکن ہے کہ اُنھیں انجام دینے میں وہ انکساری اور اعتدال کی حدود سے آگے نکل جائے۔ صعوبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرتے وقت وہ کمزوری کا اظہار بھی کرنے لگتا ہے۔ دوسروں کی مخالفت اور دشمنی کے وقت اُس کے اندر غصہ اور کینہ بھی پیدا ہوتا ہے، اور شائد مخالفین کے دلائل اور رشک کی وجوہات بھی اُس پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ لیکن تمام وہ باتیں جو اس اختلاف کا باعث بنیں، مرنے کے بعد بھلا دی جاتی ہیں اور اُس کے اچھے کام، اُس کے دماغ اور فکر کی زرخیزی باقی رہتی ہے یا اُنھیں یاد رکھا جاتا ہے۔

فطری طور پر ایسی صورت حال جب کہ اس مذہب کے بانی جس کے تابع اور ماننے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہو، اس رویے کا حجم بہت بڑا اور اس کی سطح بہت اونچی ہوتی ہے۔ جنگ خندق میں قریش نے عیینہ بن حصن کو محمد کے پاس بھیجا، کہ اگر سال کی کھجوروں کی پوری فصل محاصرہ کرنے والوں کو دے دی جائے تو قریش اور بنو غطفان واپس چلے جائیں گے۔ پھر قریش کے ایلچی نے کہا: ”اچھا اگر پوری

نہیں دیتے تو آدھی دے دو تو ہم واپس لوٹ جائیں گے"۔ حضور جو قبائل کے اتحاد کی وجہ سے ڈرے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے مدینہ کے گرد خندق کھودی تھی، نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ لیکن جب صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو اوس کے سردار سعد بن معاذ نے پوچھا: "کیا اس پیشکش کو قبول کرنے کے سلسلے میں وحی نازل ہوئی ہے؟"۔ پیغمبر نے فرمایا: "نہیں، لیکن چونکہ تمام عرب قبائل متحد ہو چکے ہیں اور اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ یہودیوں کے تعاون سے مدینہ میں داخل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس تدبیر سے ہم اُنھیں واپس لوٹا دیتے ہیں اور پھر ہم یہودیوں پر حملہ کریں گے"۔ سعد نے کہا: "یہ لوگ کفر اور جاہلیت کے زمانے میں بھی ہم سے ایک کھجور حاصل نہیں کر سکے۔ اب جب کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور خدا بھی ہمارے ساتھ ہے، ہم اس ننگ کو قبول نہیں کریں گے اور اِنھیں تاوان نہیں دیں گے۔ ان کے لیے جواب تلوار کی دھار ہے"۔ حضور نے اُن کی یہ بات مان لی اور تاوان دینے سے انکار کر دیا۔[191]

13: رسالت کی تیئیس سالہ تاریخ میں کئی بار اس سے ملتے جلتے واقعات پیش آئے۔ کہ کسی صحابی نے حضور کو رائے دی یا حضور نے اُن صحابیوں سے مشورہ طلب کیا۔ اور اُن لوگوں نے پوچھا کہ اس بارے میں خدا کا کیا حکم ہے تو حضور نے فیصلے کو اُن کی رائے پر چھوڑ دیا۔

191: نبی کریم نے عیینہ بن حصن بن بدر کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر تو مناسب سمجھے تو میں تم لوگوں کے لیے انصار کے تہائی پھل مقرر کر دوں تو کیا غطفان کو جو تیرے ساتھ ہیں واپس کر دے گا۔ اور احزاب (متفرق گروہوں) کے درمیان نا اتفاقی کرا دے گے۔ عیینہ نے آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر آپ میرا حصہ مقرر فرما دیں تو میں کر دوں گا۔ نبی کریم نے سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ کے پاس قاصد بھیجا اور اُنھیں اس کی خبر دی۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ کسی بات پر اللہ کی طرف سے مأمور ہیں تو اللہ کے امر کو جاری کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں کسی بات پر مأمور ہوتا تو تم دونوں سے مشورہ نہ لیتا، یہ میری رائے ہے جس کو میں تم دونوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اُنھیں تلوار کے سوا کچھ نہ دیں۔ (تاریخ الرسل والملوک: محمد بن جریر الطبری)۔

لیکن اُن کی رحلت کے بعد اُن کی تمام بشری کمزوریوں کو فراموش کر دیا گیا، اُن کا ہر کام کمالیت کا نمونہ اور ارادہِ خداوندی کا مظہر قرار پایا۔ حکام نے ہر معاملے اور ہر مشکل میں اُن کے طرز عمل اور کردار کا حوالہ دیا۔ سادہ لوح مومنین نے اُن عظیم دنوں کی بڑی سے بڑی تصویر کشی کی اور ہر کسی نے اپنی شان بڑھانے کے لیے اس جملے کا سہارا لیا کہ اُس نے حضور سے فلاں بات سنی تھی۔

قرآن کے قوانین اور احکام پوری طرح واضح اور طے کردہ نہیں ہیں۔ چنانچہ مومنین کو پیغمبر کے کردار اور طرز عمل اپنے فرائض سے طے کرنا چاہییں۔ نماز قرآن میں واضح طور پر واجب ہوئی ہے۔ لیکن اس کا انداز اور تعداد پیغمبر کے طرز عمل سے معلوم ہونا چاہیے۔ اس وجہ سے حدیث اور سُنّت کا آغاز ہوا جس میں اس انداز سے روز بروز اضافہ ہوا، کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں احادیث کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی۔ اور سینکڑوں لوگ اسلامی ریاست کے مختلف علاقوں میں گئے تا کہ احادیث کو جمع کر سکیں[192]۔ محدثین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جنھیں اسلامی ریاست میں بہت اعتبار اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، اُنھیں ہزاروں احادیث زبانی یاد تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابن عقدہ کو، جن کا انتقال 332 ہجری میں ہوا، ڈھائی لاکھ احادیث بمعہ اسناد یاد تھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک بڑا پتھر نہ

192: ہنگری کے اِگناز گولڈ زیہر کے مطابق ”لوگ اس بات کو اہم نہیں سمجھتے تھے کہ موجودہ حالات میں کیا چیز مناسب یا درست تھی، بلکہ رسول اللہ یا صحابہ کرام نے اس معاملے کے متعلق کیا فرمایا تھا یا اس سے کیسے نپٹا تھا۔ اور اس کے متعلق ان کے پاس کون سے مناسب اعمال کا علم یا روایات پہنچیں“۔ لہٰذا کسی بھی مخصوص حالت میں اخلاقی راہنمائی کے لیے یا کسی فعل کے جائز یا مستحسن ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے فلسفہ اخلاقیات کی بجائے پیغمبر اسلام کے فرمودات، احادیث کی اسناد، صحت اور اسماء الرجال کو اہمیت دی جانے لگی۔ چنانچہ کسی بھی اخلاقی جواز کی بجائے اہمیت اس بات کی ٹھہری کہ راوی کون ہے اور وہ کس قدر قابل اعتبار ہے۔ یوں عقلیت پسندی کی جگہ احادیث کی اہمیت بڑھ گئی۔

مارنے کی علامت ہوتا ہے[193] اور اتنی زیادہ احادیث کا موجود ہونا بذات خود اُن کے عدم صحت کا ثبوت ہے۔

اس امر کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے کہ لوگوں نے اپنے ذمہ داری کی ادائیگی سے کیوں پہلو تہی کی، اور احادیث جمع کرنے کے اس قدر درپے ہوگئے کہ انسانی عقل اور تفکر کی وقعت ہی ختم ہوگئی؟۔ ابن تیمیہ نے کہا کہ محمد کے حوالے کے علاوہ جو بھی چیز ہم تک پہنچی ہے، وہ وجود نہیں رکھتی، یا حسن بن محمد اربلی[194] جیسے دانش مند، جن کا انتقال 660 ہجری میں ہوا، کا کہنا ہے: "صدق اللہ و کذب ابن سینا" (اللہ سچا ہے اور ابن سینا جھوٹا ہے)۔

14: یہ بات معقول اور ناقابل تردید ہے کہ ہم زمان و مکان کے لحاظ سے گیارہویں صدی اور حجاز کے ماحول سے جتنا زیادہ دور ہوتے ہیں، معجزات کا حجم بڑھتا جاتا ہے۔ اعتقاد اور تخیل کو بروئے کار لایا گیا، اور ایک انسان جو اخلاقی اور فکری خوبیوں سے آراستہ تھا جن سے وہ تاریخ کا دھارا بدلنے کے قابل ہوا، اُسے ایک ایسی مخلوق میں تبدیل کر دیا گیا جو صرف داستانوں میں پائی جاتی ہے۔

15: ایران نے شکست کھائی۔ پے درپے شکست کھائی۔ قادسیہ اور نہاوند میں شکست کھائی۔ شرمناک اور دردناک شکست کھائی۔ ایسی شکست جس کے سامنے سکندر کی فتوحات اور منگولوں کی یلغار بھی دھندلا جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ حقیقت ایک بار پھر ثابت ہو جاتی ہے کہ کوئی بھی ملک جس کے منتظم

193: فارسی کی کہاوت ہے: "سنگ بزرگ نشانہ نزدن است" بڑا پتھر اٹھانا نہ مارنے کی علامت ہے۔ بھاری پتھر سے کسی کو مارا نہیں جاسکتا۔ کسی کو مارنے کے لیے ہمیشہ چھوٹا پتھر ہی اٹھایا جاتا ہے، جسے پھینکنے میں آسانی ہو۔

194: اربل: عراق کے قریب ایک شہر۔ حسن بن محمد بن احمد بن نجا اور لقب عزالدین اربل میں پیدا ہوئے۔ 660 ہجری میں دمشق میں وفات پائی۔ وہ اندھے تھے اور بزرگان دین کو بہت برا بھلا کہتے تھے۔ تاریخ اربل کے نام سے ایک کتاب اُن سے منسوب ہے۔

باتدبیر اور جرنیل اہل نہ ہوں، تو وہ غیر مسلح اور غیر تربیت یافتہ مٹھی بھر عربوں کے ہاتھوں بھی سب کچھ کھو بیٹھے گا۔

ایران نے شہر کے بعد شہر اور صوبے کے بعد صوبے میں ہتھیار ڈالے اور وہ مجبور ہو گئے کہ یا تو اسلام قبول کرلیں یا ذلیل ورسوا ہو کر جزیہ دیں۔ کچھ لوگ جزیہ دینے سے بچنے کے لیے اور کچھ موبدوں کے ناجائز تسلط سے رہائی کے لیے مسلمان ہو گئے۔ اسلام کا سادہ دین جو کلمہ شہادت ادا کرنے سے مکمل ہو جاتا ہے، عام ہو گیا۔ خصوصی طور پر جب تلوار کی دھار اُن کی گردن کے پیچھے تھی۔

ایرانی اپنے قومی شیوے کے مطابق فاتحین سے قربت پیدا کرنے کے لیے خود آگے بڑھے۔ اور اُن کی اطاعت وخدمت کی۔ اپنی تمام ذہانت، فکر اور بصیرت کو نئے آقاؤں کے حوالے کیا۔ اُن کی زبان سیکھی اور اُن کے طور طریقے اختیار کیے۔ فاتح قوم کی لغات کی تدوین کی اور اُن کے صرف ونحو کو درست کیا۔ اور اپنے فاتحین کے ہاں ملازمت حاصل کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی اطاعت، انکساری یا ذلت قبول کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ مسلمانی کے حوالے سے وہ عربوں سے بھی آگے بڑھ گئے حتیٰ کہ اپنے پرانے دین اور طور طریقوں کی بھی تحقیر کرنے لگے اور اسی طور عربوں اور اُن کے بزرگوں کے وقار کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ وقار کا عنصر، جوانمردی، سیادت کی صلاحیت اور عظمت اُنھیں صرف عربوں کے ہاں نظر آئیں۔

ہر بدوی شعر، ہر جاہلانہ تمثیل اور زمانہ جاہلیت کے عربوں کا ہر بے سروپا فقرہ حکمت اور معرفت کی تجرید کا نمونہ اور زندگی کا اصل قرار پایا۔ اُنھوں نے اسی بات پر اکتفا کر لیا کہ وہ فلاں قبیلے کے موالی یا فلاں امیر کے دستر خوان کے کاسہ لیس ہیں۔ اور فخر کرتے تھے کہ کسی عرب نے اُن کی بیٹی سے شادی کی ہے اور شیخی بگھارتے تھے کہ اُنھوں نے اپنا عربی نام رکھا ہے۔ اُنھوں نے اپنی تمام فکر وفراست کو فقہ ،حدیث، الہیات اور عربی ادب کے لیے استعمال کیا جس سے اسلامی تعلیمات کا ستر فیصد مواد پیدا ہوا۔

یہ لوگ شروع میں ڈر کی وجہ سے مسلمان ہوئے لیکن دو تین نسلوں کے بعد مسلمانی کے حوالے سے یہ عربوں سے بھی آگے نکل گئے۔ حکومتی مشینری کے نزدیک ہونے کے لیے اِنھوں نے چاپلوسی اور کاسہ لیسی سے اس حد تک کام لیا کہ ایک مشہور وزیر آئینہ اس لیے نہیں دیکھتا تھا کہ اُسے آئینے میں کہیں ایک عجمی کی شکل نظر نہ آ جائے۔ حاکم اور گورنر بننے کی امید میں اِنھوں نے پہلے عرب امرا کی فرمانبرداری کی تا کہ اِنھیں اُن کے خوان سے لقمے نصیب ہو سکیں لیکن آہستہ آہستہ یہ سلسلہ اس حد تک چلا گیا کہ اِنھیں اپنی شناخت پر شبہ ہونے لگا۔ اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ایرانیوں نے اپنے آپ کو صفر اور حجاز کو تمام خدائی نعمتوں کا واحد سرچشمہ تصور کیا۔

خرافات، غیر عقلی سوچوں اور معجزات کے حجم میں اضافے کا ماخذ شائد یہی نکتہ ہے۔ اگر مکّہ اور مدینہ کے حالات اور مکّہ کے تیرہ اور مدینہ کے دس سالوں کے واقعات کی اپنی ذہن میں تصور کشی کر سکتے تو یہ اس نتیجے پر نہ پہنچتے جس کا ذکر محمد باقر مجلسی[195] نے بحار الانوار میں کیا ہے۔

”روایت ہے کہ عید کے دن حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین، اپنے جدّ بزرگوار، حضور سے عید کے لباس کا تقاضا کر رہے تھے۔ جبرائیل نازل ہوئے اور دو سفید لباس پیش کیے۔ حضور نے فرمایا: عید کے روز بچے رنگین لباس پہنتے ہیں جب کہ تم حسن اور حسین کے لیے سفید لباس لائے ہو!۔ جبرئیل بہشت سے ایک طشت اور کوزہ لے آئے اور کہا: میں پانی ڈالتا ہوں اور تم دھونے کے انداز میں رگڑو، لباس کا رنگ وہی ہو جائے گا جو تم چاہو گے۔

195: مُلّا محمد باقر مجلسی: (1627-1699)۔ شیعہ فرقے کے معروف ترین عالم، صفوی دور کے اواخر کے بزرگ ترین قاضی القضاۃ اور شاہ سلطان حسین کے دور کے بااثر ترین سیاستدان سمجھے جاتے تھے۔ صفوی تاریخ کے اہم ترین محققین نے اُنھیں افغانستان میں ایران کے سقوط کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اُنھوں نے ”بحار الأنوار“ اور ”حِلیَة المُتّقین“ جیسی کافی کتابیں تالیف کی ہیں جو سراسر خرافات سے بھری ہوئی ہیں۔

حضرت امام حسن نے سبز رنگ اور حضرت امام حسین نے سرخ رنگ کا انتخاب کیا۔ جب کپڑے رنگین ہو گئے تو جبرائیل رونے لگے۔ حضور نے فرمایا: میرے بچے آج خوش ہو رہے ہیں، تم کیوں رو رہے ہو؟۔ جبرائیل نے عرض کیا: یارسول اللہ، حسن نے سبز رنگ کا انتخاب کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ شہادت کے وقت اُن کا بدن زہر کے اثر سے سبز ہو جائے گا[196] اور حضرت حسین نے سرخ رنگ کا انتخاب کیا ہے، اُن کی شہادت کے وقت زمین اُن کے خون سے سرخ ہو جائے گی"۔[197]

ہجرت کے پہلے سال اور سریہ نخلہ سے پہلے حضور اور اُن کے ساتھیوں نے انتہائی مشکلات اور تنگ دستی میں زندگی بسر کی تھی۔ عبدالرحمٰن جیسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جن کے پاس آمدنی کا ذریعہ تھا کہ جوں ہی وہ مدینہ وارد ہوئے تو بازار گئے اور کام میں مشغول ہو کر منافع کمانے لگے۔ باقی لوگ یہودیوں کے نخلستانوں میں مزدوری کرنے لگے، اور چونکہ اُنھیں کھیتی باڑی کا علم نہیں تھا اس لیے اُنھیں کھدائی کرنے اور کنویں سے پانی کھینچنے کے کام پر اکتفا کرنا پڑا۔

حضرت محمد خود کوئی کام نہیں کرتے تھے، اُن کا گزارہ دوسروں کے عطیات اور تحائف پر ہوتا تھا۔ وہ کبھی شام کو بھوکے ہی زمین پر سو جاتے تھے اور کبھی چند کھجوروں سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم یہ بات اُن کی تحقیر یا شان کو گھٹانے کے لیے نہیں کر رہے۔ اس کے برعکس اُن کی شان

196: حسن بن علی طلاق دینے کے بے انتہا عادی تھے، ادھر شادی کی اور اُدھر طلاق دے دی۔ اُن کے اس وتیرے سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ قبائل میں اب ہمیشہ دشمنی رہے گی۔ علی بن ابو طالب بھی بیٹے کے اس رویے سے بہت تنگ تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ اپنی بیٹیوں کی شادی حسن سے مت کرو کیونکہ طلاق دہی اُن کی عادت ہو گئی ہے۔ حسن نے نوے شادیاں کیں۔ اُن کی موت اُن کی بیوی جعدہ بن اشعث کے زہر دینے کے نتیجے میں ہوئی۔ (بحوالہ تاریخ الخلفاء۔ امام جلال الدین السیوطی)۔

197: یہ غیر عقلی اور نامعقول کہانی ہم مرزا جانی کاشانی کی کتاب "نقطۃ الکاف" میں پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ فرقہ بابیہ جو خود کو ایک جدید مذہب کا بانی سمجھتا ہے، وہ بھی شیعیان سے ورثے میں ملی خرافات کو مانتا ہے۔

اور وقار اس بات میں ہے کہ خالی ہاتھوں اور مادی وسائل کے فقدان کے باوجود وہ جمے رہے تا آنکہ جزیرہ نما عرب پر غالب نہیں آئے۔ انسانی تاریخ میں ایسا خود ساختہ مردوں کی نظیر بہت کم ملتی ہے، اور ان وقتوں کے حالات و واقعات کا علم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ محمد دوسرے انسانوں کی مانند بشر تھے اور کوئی بھی مافوق الفطرت قوت یا مافوق الفطرت انسان اُن کی مدد کو نہیں آیا۔

جنگ بدر کو مسلمانوں نے ہزاروں فرشتوں کی مدد سے نہیں بلکہ اپنی دلیری، شجاعت اور قریش کی آرام طلبی اور لاپرواہی کی وجہ سے جیتا۔ بالکل اسی طرح محمد کی حکمت عملی سے اغماض برتنے کے نتیجے میں جنگ احد میں مسلمانوں نے شکست کھائی۔ اگر خدا مسلمانوں کی مستقل مدد کرتا تو نہ اتنے غزوات کی ضرورت ہوتی، نہ ہی شہر مدینہ کے گرد خندق کھودنے کی نوبت پیش آتی اور نہ ہی بنو قریظہ کا قتل عام ہوتا۔ بلکہ یہ بات عقلی اصولوں کے زیادہ قریب ہوتی کہ خدا اس آیت کی مناسبت سے "وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا" (اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے) تمام کفار اور منافقین کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کر دیتا[198]۔

بنو قینقاع کے یہودیوں نے پندرہ دن کے محاصرے اور پانی و خوراک بند کر دینے کے نتیجے میں ہتھیار ڈال دیئے تو محمد اُن سب کو قتل کرنا چاہ رہے تھے۔ عبد اللہ بن ابی نے جو اُن کا حلیف تھا، ثالثی کی۔ محمد نے قبول نہ کیا تو عبد اللہ بن ابی نے محمد پر عرصہ تنگ کر دیا بلکہ اُن کا گریبان پکڑ لیا، غصے سے محمد کے چہرے کی رنگت سیاہ ہو گئی۔ اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ عبد اللہ نے قسم کھائی ہے کہ وہ یہودیوں کی حمایت سے

198: سورت السَّجدَۃ کی آیت نمبر تیرہ کی عبارت یوں ہے: "اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے۔ لیکن ہماری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ ہم دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر کر رہیں گے"۔

ہاتھ نہیں کھینچے گا اور یہاں تک کہ عوامی مخالفت کی دھمکی بھی دی تھی تو آپ نے اُن کے قتل سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بات پر قناعت کرلی کہ یہودی تین دن کے اندر مدینہ چھوڑ دیں۔[199]

سیرت کی کتابوں اور اسلام کی ابتدائی ایام کی تاریخ میں ایسی بشری کمزوریوں کی سینکڑوں مثالیں درج ہیں، جو اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اُن وقتوں کے واقعات میں کسی بھی قسم کی مافوق الفطرت قوتیں ملوث نہیں تھیں۔ اور اُن وقتوں کے حالات پوری دنیا کے واقعات کی طرح، اور ہر زمانے میں ویسے ہی اسباب اور طبعی وجوہات کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئے۔ اس بات سے نہ صرف محمد کی عظمت کم نہیں ہوتی ہے بلکہ اُن کی غیر معمولی شخصیت اور روحانی قوت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے لوگوں کو یوں دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ گویا ان واقعات کی طبعی اور منطقی طور پر توضیح نہیں ہوسکتی۔ لہذا اُن کی قوت واہمہ ایسی صورت میں ہمیشہ خدا کو تخلیق کرتی ہے، جیسے قدیم اور نادان لوگ بادلوں کے کڑکنے اور بجلی کے چمکنے کی توضیح نہیں کرسکتے تھے اور مجبوراً اسے خدائی آواز، غضب کی علامت، خدا کی ناراضگی اور سزا دینے کا عمل سمجھتے تھے، جس کا ظہور اُس کے احکام کی نافرمانی کی وجہ سے ہوا ہے۔

199: ”عبداللہ بن ابی پیغمبر کے حضور پیش ہوا اور عرض کی: ”اے محمد! میرے حلیفوں پر مہربانی کیجئے“۔ آپ صلعم نے اُس سے رخ موڑ لیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ رسول کریم صلعم کے گریبان میں داخل کیا۔ رسول اکرم صلعم نے فرمایا: ”مجھے چھوڑ دو“۔ آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ چہرے پر ناراضگی کی اثرات ظاہر ہوئے۔ آپ صلعم نے فرمایا: ”تجھ پر افسوس ہو، مجھے چھوڑ دو“۔ اُس نے کہا: ”بخدا، میں آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جب تک آپ میرے حلیفوں پر مہربانی نہیں فرمائیں گے۔ چار سو کھلے جسم کے جوان اور تین سو زرہ پوش، جنھوں نے مجھے سرخ و سیاہ سے بچایا تھا، آپ اُنھیں ایک ہی صبح میں کاٹ ڈالیں گے۔ بخدا میں زمانے کی گردشوں کا خطرہ محسوس کر رہا ہوں“۔ رسول اللہ نے فرمایا: ”جاؤ، میں نے تمھاری خاطر انہیں آزاد کیا“۔ (الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول: امام ابن تیمیہ)۔

عقل مند اور سمجھدار لوگوں نے علّت و معلول کے باہمی تعلق کو نظر انداز کیا ہے۔ اور ہر بات میں خواہ وہ کتنی ہی معمولی اور عام سی ہو، خدائی مداخلت کو ضروری سمجھا ہے۔ اور خدائے بزرگ و قادر یعنی لا محدود کائنات کے مالک کو اپنے جیسا فرض کیا ہے۔ لہذا وہ جنت سے حسن اور حسین کے لیے کپڑے بھیجتا ہے، اور جبرائیل رنگریزوں کی مانند اُن کپڑوں کو سرخ و سبز رنگ میں تبدیل کر دیتا ہے، اور اس کے بعد روتا ہے۔ بحار الانوار استثنائی کتاب نہیں ہے، جہاں کر کرہ بن عرعرہ بن صرصرہ نام کی مچھلی باتیں کرتی ہیں[200]۔

ایران میں حِلیۃ المتّقین، جنات الخلود، انوار نعمانی، مرصاد العباد[201]، قصص الانبیاء[202] اور "قصص العلماء[203]" جیسی سینکڑوں کتابیں ہیں۔ قوم کے سوچنے کی قوت کو مسموم اور تباہ کرنے کے لیے ان میں سے صرف ایک کتاب ہی کافی ہے۔

معجزہ تراشی کے بخار میں مبتلا عقل مند انسان اپنی عقل سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ محمد کو دوسرے انسانوں کی طرح بھوک لگتی تھی، وہ کھانا کھاتے تھے اور فطری طور پر رفع حاجت کے لیے باہر جاتے تھے۔ لیکن یہاں دینی غیرت انہیں خاموش بیٹھنے نہیں دیتی، لہذا وہ

200: یہ حدیث کتاب مُلّا محمد باقر مجلسی کی کتاب "حلیۃ المتقین" میں تفصیل سے درج ہے، اس میں مچھلیوں کے مختلف ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں کرکرہ نامی مچھلی علی بن ابو طالب کو صفین کی جنگ سے پہلے فرات کو پار کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔

201: مرصاد العباد تصوف کی ایک کتاب جس کے مؤلف شیخ نجم الدین رازی جو دایہ کے نام سے جانے جاتے تھے، ان کا انتقال 654 ہجری میں ہوا۔

202: مسلمان علماء نے قصص الانبیاء کے عنوان کے تحت بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ دشتی نے یہاں محمد بن حسن الداندرومی کی فارسی میں لکھی کتاب کا ذکر کیا ہے جو پیغمبروں کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔

203: قصص العلماء فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، اس کے مؤلف محمد بن سلیمان تنکابنی ہیں۔ جس میں انہوں نے چوتھی سے تیرہویں صدی تک کے 153 شیعہ علماء کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ رفع حاجت کے وقت پتھر اور درخت اپنی جگہ سے حرکت کرتے تھے اور حضور کے گرد حصار بنالیتے تھے تاکہ وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہ اپنی قوت تخیل سے اس مفروضے پر نہیں پہنچتے کہ کہیں کہ حضور کھاناہی نہیں کھاتے تھے کہ اُنھیں باہر جانے کی حاجت ہی نہیں تھی اور نہ ہی دھوپ میں سائے کی ضرورت تھی۔ چونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ حضور کھانا کھاتے تھے۔ لہٰذا محمد کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرنے کے لئے کہیں اور کوئی معجزہ ہوناچاہیے، اور یہ امتیاز صرف انسانی امکانات تک محدود نہیں ہوناچاہیے۔